انتخاب کا سال... اداروں نے ذمہ داری کا ثبوت دیا تو نیا سال مبارک ہوگا! ۰۹

جنوری ۲۰۱۸ء

اُردو ڈائجسٹ

www.urdudigest.pk
urdudigest.pk

ماں نے مرکر چار انسانوں کو زندگی بخش دی ۳۰

بھارت کا بوفورس اسکینڈل
گاندھی خاندان کے تعاقب میں ۷۱

الحرم شریف خطرے میں

یہود کے مسلم کُش مذہبی نظریات کی ڈرامائی کہانی ۶۱

www.pakistanipoint.com
پاکستانی پوائنٹ

ہاتھی اور شیر کی لڑائی... شکار کا سنسنی خیز قصہ ۱۸۱

فرسٹ ایڈ باکس گھر میں رکھیے... حادثات سے بچاؤ یقینی بنایئے ۹۱

ہاں... آئیڈیل بیوی کی کھوج میں سرگرداں نوجوان کا تازہ افسانہ ۶۵

رانی پدماوتی کون تھی؟ ۴۱
توہم پرستی کی چشم کشا داستان

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ، محمد رسول اللہ ﷺ، پاکستان کے عائد کردہ فرائض کی ادائیگی، دوسروں کی مدد اور اسکاؤٹ قانون کی پابندی میں پوری کوشش کروں گا۔"

اسکاؤٹنگ کی بنیادی معلومات اور اہم ایڈریسز پر مبنی پاکٹ سائز

اسکاؤٹ ڈائری بمع ٹیسٹ کارڈ شائع ہوگئی ہے۔

۱۲۸ صفحات پر مشتمل تعارفی قیمت ۵۰ روپے

کیا آپ دنیا کے نوجوانوں کی مقبول ترین تنظیم اسکاؤٹس تحریک میں اسکاؤٹ لیڈر، گرل گائیڈ اور فیملی اسکاؤٹنگ میں شامل اور عالمی شہریت حاصل کرنا چاہتے ہیں؟

رہنمائے اسکاؤٹس برائے تیاری قائداعظم، علامہ اقبال اور صدارتی طلائی تمغہ Gold Medal امتحان شائع ہوگئی ہے۔ ۲۷ صفحات پر مشتمل کتاب کی تعارفی قیمت ۵۰ روپے

ماہنامہ صدائے پاکستان کے خصوصی نمبر	اصل قیمت/ ہدیہ	رعایتی قیمت/ ہدیہ	رعایت
1 کرمیوں کی چھٹیوں میں کہاں جائیں؟ (شمالی علاقہ جات)	200	134	66
2 قرضہ لیں اور کاروبار شروع کریں (بینک کے مروجہ قوانین)	200	134	66
3 ایکسپورٹ کریں اور آمدنی بڑھائیں (قیمتی زرمبادلہ کمائیں)	200	134	66
4 امریکی ویزا کیسے حاصل کریں؟ (ڈونلڈ ٹرمپ پالیسیاں)	200	134	66
کتابیں از مصنف			
5 چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا (حصول ویزا امیگریشن قوانین) ازمقصود چغتائی	500	335	165
6 بینکنگ گائیڈ (بینک کی سہولتوں سے فائدہ اٹھائیں) ازمقصود چغتائی	1000	670	330
7 سکاؤٹ بچوں کی بائیک اور اصول بائیکنگ ازمقصود چغتائی	200	134	66
8 سکاؤٹاں دا اوکھا پینڈا (پنجابی) ازمقصود چغتائی	200	134	66
9 The Scouts Hike & Scouts Principles ایضاً	200	134	66
10 بوسنیا آوارہ گرد کی نظر سے ازمحمد زوہیب صدیقی	400	268	132
11 تفسیر قرآن حکیم پارہ ۷، ۸، ۹، ۱۰ ازممتاز سکالر ڈاکٹر غلام مرتضےٰ	1200	800	400
	کل رعائیت		1489

دلچسپ اور معلوماتی نئی کتب انتہائی کم قیمت پر حاصل کریں

محدود اسٹاک ہے۔ ابھی رابطہ کریں اور گھر بیٹھے منگوائیں

ملنے کا پتا: ولید پبلشرز 394 بلاک G/4، ایم اے جوہر ٹاؤن، لاہور

فون نمبر: 0092-321-4806800 / 0333-4254394

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کا قرآن

سن لو بیشک اللہ کے ولیوں پر نہ کچھ خوف ہے نہ کچھ غم (یونس:۶۲)

(اے سرکشو!) کیا یہ (جنتی) وہی (نہیں) ہیں جن کے متعلق تم قسمیں اٹھایا کرتے تھے کہ نہیں عطا کرے گا انھیں اللہ اپنی رحمت سے (دیکھو انھیں تو حکم مل گیا ہے کہ) داخل ہو جاؤ جنت میں۔ نہیں کوئی خوف تم پر اور نہ تم غمگین ہو گے۔ (الأعراف:۴۹)

تمہارے دوست نہیں مگر اللہ اور اس کا رسولؐ اور ایمان والے کہ نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے حضور جھکے ہوئے ہیں (المآئدۃ:۵۵)

رسول اللہ ﷺ کا فرمان

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) نے فرمایا کہ اللہ فرماتا ہے "جس نے میرے دوست سے دشمنی کی میں اس سے اعلان جنگ کرتا ہوں۔ اور میرا بندہ میری فرض کی ہوئی چیزوں کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا ہے اور میرا بندہ ہمیشہ نوافل کے ذریعے مجھ سے قرب حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو اس کے کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ اور اگر وہ مجھ سے کوئی چیز مانگتا ہے تو میں اسے دیتا ہوں اور اگر مجھ سے پناہ مانگے تو پناہ دیتا ہوں"۔ (صحیح بخاری شریف)

اُردو ڈائجسٹ

جنوری 2018ء
ربیع الثانی 1439ھ
جلد نمبر 58 شمارہ نمبر 01

urdudigest.pk www.urdudigest.pk

صدر مجلس: ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
مدیر اعلیٰ: الطاف حسن قریشی
ایگزیکٹو ایڈیٹر: طیب اعجاز قریشی
ڈپٹی ایڈیٹر: سید عاصم محمود
سب ایڈیٹر: عافیہ مقبول جہانگیر
مجلس تحریر: ڈاکٹر آصف محمود جاہ، سلمیٰ اعوان
مہتمم طباعت: فاروق اعجاز قریشی
انچارج کمیونیکیشن: افنان کامران قریشی
پروف خواں: ارم ناز
ڈیزائنر و کمپوزر: کاشف شہزاد، فیصل ایوب

مارکیٹنگ

ڈائریکٹر: ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093

اشتہارات

advertisement@urdudigest.pk
مینیجر ایڈورٹائزمنٹ: 0320-4437564
لاہور: ندیم حامد 0300-4242620

سالانہ خریداری 560 روپے کی بچت کے ساتھ

subscription@urdudigest.pk خریداری کے لیے رابطہ
فون: +92-42-35290707
پاکستان 1560 کے بجائے 1000 روپے میں
بیرون ملک 100 امریکی ڈالر
اُردو ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کیجیے
اندرون و بیرون ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ
درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No.
Pk18 BPUN 1100 0280 0380 0000
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس

اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں

325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738 ♦ فیکس: +92-42-35290731
ای میل: editor@urdudigest.pk

قیمت: 100 روپے

طابع و ناشر الطاف حسن قریشی نے اردو ڈائجسٹ پرنٹرز 24۔ سرکلر روڈ سے چھپوا کر سمن آباد لاہور سے شائع کیا

اتحاد و یک جہتی...... وقت کی پُکار

ایگزیکٹو ایڈیٹر نوٹ

ابرہام لنکن کا شمار انسانی تاریخ کے نمایاں حکمرانوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے تن تنہا سفید فام امریکا میں سیاہ فام غلاموں کو آزادی کی نعمت بخشی اور اس راہ پر چلتے جان تک قربان کر دی۔ ایک بار انھوں نے کہا: ''ہر انسان مشکلات کا سامنا کر لیتا ہے۔ اگر آپ کسی کا کردار دیکھنا چاہتے ہیں، تو اُسے اقتدار دے دیں''۔

یہ قول برحق ہے۔ طاقت و حشمت پا کر بعض اوقات اچھے بھلے لوگ بھی سیدھی پٹڑی سے اُتر جاتے ہیں۔ اب لنکن کے ہم وطن ڈونلڈ ٹرمپ ہی کو دیکھ لیجیے۔ موصوف جب سے امریکی صدر بنے ہیں، انھوں نے نہ صرف دنیا کا امن و سکون تہ و بالا کیا بلکہ اُسے عجیب عذاب میں ڈال دیا۔

چھ دسمبر کو صدر ٹرمپ نے عالمِ اسلام پر بجلی گرا دی جب بیت المقدس کو اسرائیل کے دارالحکومت کی حیثیت سے تسلیم کر لیا۔ یہ سن کر ہر مسلمان کے دل پر جیسے چھریاں چل گئیں اور وہ سرتا پا غم و غصے سے بھر گیا۔ صدر ٹرمپ نے بوجوہ یہ انتہائی متنازع تباہ کن فیصلہ کیا۔ ایک وجہ یہ کہ ٹرمپ کی ری پبلکن پارٹی کو سب سے زیادہ یہودی امرا چندہ دیتے ہیں۔ ان یہود نے ٹرمپ پر دباؤ ڈال رکھا تھا کہ وہ اپنا انتخابی وعدہ پورا کریں...... یہ کہ بیت المقدس کو اسرائیلی دارالحکومت قرار دے دیا جائے۔

ایک اہم وجہ مذہبی ہے۔ صدر ٹرمپ کٹر پروٹسٹنٹ ہیں۔ آج امریکا میں کروڑوں کٹر پروٹسٹنٹ اسرائیل کے حامی بن چکے۔ وجہ ان میں مخصوص مذہبی نظریات کا پھیل جانا ہے۔ حالیہ شمارے میں طبع شدہ مضمون ''مسجد اقصیٰ خطرے میں'' انھی نظریات کو تفصیل سے بیان کرتا ہے۔

صدر ٹرمپ کے اعلان سے البتہ ایک سچائی بھی کھل کر سامنے آ گئی جو پہلے کسی حد تک مستور تھی...... یہ کہ دنیا میں یہود اور اسرائیل کا سب سے بڑا حمایتی امریکی حکمران طبقہ ہے۔ اب امریکا سے دوستی کی پینگیں بڑھانے والے مسلمان حکمرانوں کو ہوش کے ناخن لینے چاہئیں۔ اگر وہ بدستور پس پردہ یا عیاں امریکی حکومت کے چٹو بٹے بنے رہے تو عالمِ اسلام میں ان کی رہی سہی عزت بھی خاک میں مل سکتی ہے۔

امریکا کی سرپرستی پا کر اسرائیل مغربی کنارے میں جگہ جگہ یہودی بستیاں تعمیر کر رہا ہے حالانکہ یہ علاقہ مجوزہ ریاست فلسطین میں شامل ہوگا۔ اسرائیلی حکومت مشرقی بیت المقدس میں بھی یہود کو بسا رہی ہے تاکہ وہاں آبادی کا توازن اپنے حق میں کیا جا سکے۔ خاموشی سے کیے جانے والا یہ چوری ڈاکے جیسا عمل مستقبل میں اسرائیلی حکومت اور فلسطینیوں کے مابین بہت بڑے نزاع کی وجہ بن سکتا ہے۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں بیت المقدس کے معاملے میں امریکا اور اسرائیل کو ہزیمت اُٹھانا پڑی۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسلامی ممالک اس مسلمان مخالف جوڑی کے خلاف کیا ٹھوس اقدامات کرتے ہیں۔ زبانی کلامی تو سبھی مسلم حکمرانوں نے امریکا و اسرائیل پہ جوش و خروش سے زبر تو تیغ کی لیکن اب ٹھوس فیصلے ہونے چاہییں۔ یہ وقت کی پکار ہے کہ تمام اسلامی ممالک فروعی اختلافات پس پشت ڈال کر اتحاد و ایکا کر لیں۔ اس طرح نہ صرف مسلم دشمن طاقتوں کو منہ توڑ جواب ملے گا بلکہ عالمِ اسلام بتدریج زوال سے نکل سکے گا۔

کہتے ہیں، جس انسان کا دل امن و محبت سے معمور ہو، وہ دوسروں میں بھی نیکیاں تقسیم کرتا ہے۔ ڈاکٹر محمد رفیق ذکی ہی کو لیجیے۔ آپ شریف انسٹی ٹیوٹ آف یورولوجی اینڈ رینل ٹرانسپلانٹ، لاہور کے ڈائریکٹر ہیں۔ پیوندکاری یعنی ٹرانسپلانٹ کا آپریشن کرنے کے ماہر ہیں۔ اس آپریشن میں مردے کے بدن سے اہم اعضا مثلاً دل، گردے وغیرہ نکال کر ان مریضوں کے اجسام میں لگائے جاتے ہیں جن کے اپنے ناکارہ ہو چکے ہوں۔ آپ اس عمل کی تفصیل اسی شمارے میں شائع ہونے والے مضمون ''ایک ماں نے مر کر چار انسانوں کو زندگی بخش دی'' میں پڑھ سکتے ہیں۔

گویا ٹرانسپلانٹ آپریشن گور کنارے پہنچے مریضوں کو نئی زندگی عطا کرتا ہے۔ یہ بہت بڑی نیکی ڈاکٹر محمد رفیق ذکی کے ہاتھوں انجام پاتی ہے۔ وہ موت کو شکست دے کر مایوس انسانوں میں حیاتِ نو کا عظیم تحفہ بانٹ رہے ہیں۔

ایک اچھی تحریر بھی صدقۂ جاریہ کے مانند ہے۔ وہ آنے والی نسلوں کو مستفید کرتی ہے۔ ہمارے بہت سے قارئین اپنے من میں جذبات و معلومات کا خزینہ دفن کیے ہوئے ہیں مگر لکھاری نہ ہونے کے سبب اُسے افشا نہیں کر پاتے۔ لیکن آپ اس خزانے کو الفاظ کی صورت صفحۂ قرطاس پر اُتاریے، ہم اُسے بنا سنوار لیں گے۔

جناب عبدالعظیم سمیع کی مثال لیجیے، جو ایک باصلاحیت آئی ٹی انجینیئر ہیں۔ آپ کچھ عرصہ قبل بحرالکاہل میں واقع جزیرے، وانوا تو گئے تھے۔ انھیں پڑھنے کا شوق تھا مگر لکھنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ اسی لیے جوش و خروش سے اپنی سیاحت کا بیان آڈیو ریکارڈنگ کی صورت ہمیں بھجوایا۔ یوں ایک دلچسپ و معلوماتی سفرنامہ وجود میں آیا جو حالیہ شمارے میں شامل ہے۔ یہ نگاہوں سے اوجھل ایک پُرفضا و خوبصورت جزیرے کے عجائب و غرائب قاری پر منکشف کرتا ہے۔

محترم قارئین! آپ کے سینے میں بھی کوئی دلچسپ و سبق آموز واقعہ پوشیدہ ہو، کسی شخصیت یا کارنامے سے متاثر ہوں یا کسی سہانے سفر کی یادیں بسی ہوں تو انھیں ضائع کرنے کے بجائے لاکھوں مرد و زن پر وا کیجیے۔ تحریر کو ہم بنا سنوار لیں گے۔ آپ کو نہ صرف معقول مشاہرہ ملے گا بلکہ آپ لکھاری ہونے کا اعزاز پا کر اپنے خیالات و احساسات دوسروں تک پہنچا سکیں گے۔ قلم اٹھائیے اور مصنف بن کر اپنی پہچان بنائیے۔

طیب اعجاز قریشی

پڑھیے، پڑھائیے، سیکھیے اور لطف اُٹھائیے

فہرست

کچھ اپنی زبان میں

انتخابات کا سال..... اداروں نے ذمہ داری کا ثبوت دیا تو نیا سال مبارک ہوگا — الطاف حسن قریشی — ۰۹

ہم کہاں کھڑے ہیں

تاریخ کا بدلتا ہوا دھارا..... انسانی ضمیر نے امریکا کے خلاف بغاوت کردی ہے — الطاف حسن قریشی — ۱۲

خصوصی رپورٹ

ایک ماں نے مرکر چار زندگیاں بچالیں..... کیڈیورک سرجری کا ماجرا — عافیہ مقبول جہانگیر — ۳۰

اسلامی زندگی

کسی کا بُرا نہ چاہو..... آدابِ حکمرانی سکھانے والی حکایاتِ سعدی کا بے مثال تحفہ — طالب ہاشمی — ۴۸

سچا واقعہ

پی آئی اے کا طیارہ بھارت نے مار گرایا..... ایک پُراسرار معمے کی داستان جو آج تک حل نہ ہوا — مہر افروز — ۵۴

افسانے/کہانیاں

سرکا سائیں..... ایک بیوی کا قصہ جو اپنے شوہر کو رہائی دلوانا چاہتی تھی — صالحہ محبوب — ۵۷

ہاں..... ایک نوجوان کہانی کار کا دلفریب قصہ، اُسے آئیڈیل بیوی کی تلاش تھی — قاضی شارق محمود — ۶۵

مشین..... جذبات و احساسات سے عاری بے کس عورت کا ماجرا حیات — رفعت رفیق — ۷۶

انتظار لاحاصل..... جذبۂ ہمدردی نے اُسے انہونے کام کرنے پر اکسائے رکھا — آمنہ زبیر — ۸۱

معصوم دعا..... ایک نادان کی پُراثر کہانی جسے قدرتِ الٰہی نے سیدھا راستہ دکھایا — شاکر لطیف — ۹۶

ولایتی مرغی..... ایک مسکین دیہاتی کی سبق آموز کتھا جو شاطر افسروں میں جا پھنسا — وینکٹیش ماڈگولکر — ۱۱۴

نجمہ کا پھول..... ممتا کے عجب روپ دکھلاتی پاکیزہ جذبات سے مملو کتھا — وسیم بن اشرف — ۱۳۹

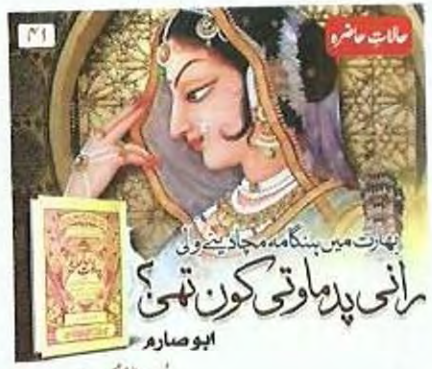

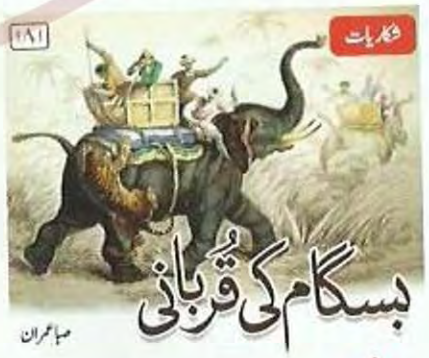

سرکٹا انسان..... ایک بھارتی افسر کی پیشہ ورانہ زندگی کے حیرت انگیز واقعات — شاہ محی الحق فاروقی — ۱۸۴

زلفِ گراں..... گناہوں کی دلدل میں دھنس جانے والے ایک احمق نوجوان کا قصہ — انجم فاروق ساحلی — ۱۹۳

مہمان..... ایک نادان عورت کا سبق آموز ماجرا، جو مہمان کو بلائے جان سمجھ بیٹھی تھی — رضیہ بٹ — ۱۹۹

سارنگہ..... ایک مافوق الفطرت ہستی کی پُرہول کہانی، اس نے سب پر قبضہ کرلیا تھا — عمارہ جے ملک — ۲۱۵

انکشافات

بھارت کا بوفورس اسکینڈل..... کئی برس پرانا کرپشن کیس جو آج بھی گاندھی خاندان پر داغ ہے — شاہد لطیف — ۷۱

غذائیات

کافی..... ایک قدیم اور مقبول مشروب جو نہ صرف مزیدار بلکہ فائدہ مند بھی ہے — صبا عمران — ۷۹

تجرباتِ زندگی

سرداؤد کی مجلس..... ایک بابرکت محفل کا ایمانی جذبے سے سرشار ذکرِ خیر — عبدالصبور شاکر — ۸۵

آپ بیتی

کلچے والا..... سنتِ نبویؐ پر عمل نے مصنف کو اہم بنادیا — پروفیسر ڈاکٹر مجیب ظفر انوار حمیدی — ۸۸

نفسیات

نقصان نہ پہنچاؤ..... تہذیبِ نفس کا سبق دیتا، راہِ حق دکھلاتا ایک بیش قیمت شہ پارہ — ڈاکٹر فیاض ہرل — ۱۰۲

جرم و سزا

باضمیر..... ترقی کے خواہش مند کا ماجرا، اس نے آگے بڑھنے کی انوکھی ترکیب نکال ڈالی — عذرا فردوس — ۱۰۵

حیوانات

کینگرو، دنیائے حیوانات کا باکسر..... حریف کے چھکے چھڑا دینے والے منفرد جانور کا قصۂ عجب — فیصل حسین — ۱۰۸

خاکہ

نواب آف کالا باغ..... سخت مزاج مگر با اصول گورنر کے نصیحت آموز واقعات — حبیب اشرف صبوحی — ۱۱۱

مرزا ہاؤس کی حلیم پارٹیاں ..... کراچی کے ایک مرحوم سیاستداں کی سدا بہار یادیں — اختر بلوچ — ۲۱۱

اخلاقیات

نمود و نمائش کا زہر ..... ٹی وی ڈرامے معاشرے میں یہ زہر پھیلانے کا ذریعہ بن چکے — ڈاکٹر محمد وسیم اکبر شیخ — ۱۱۸

دلچسپ و عجیب

انوکھے دعوت نامے ..... مرضع و مسجع اُردو میں تحریر کیے گئے پُرلطف بلاوے — محمد ذاکر علی خان — ۱۲۱

سائنس و ٹیکنالوجی

گھر کا مفت سیکورٹی سسٹم ..... جدید سافٹ ویئر کی مدد سے اپنا گھر محفوظ بنائیے — راؤ محمد شاہد اقبال — ۱۲۵

معلومات

جھوٹ جو سچ سمجھ لیے گئے ..... دنیا بھر میں سینہ بہ سینہ پھیلے توہمات کا پوسٹمارٹم — محمد خلیل چودھری — ۱۵۸

تلخیصِ کتب

پُراسرار کنواں ..... دماغ کو چکرا کر رکھ دینے والے ایک عجیب معمّے کی داستان — ابن صفی تلخیص انجم — ۱۶۱

کھیل کھلاڑی

بہادر کرکٹرز ..... جنہوں نے مشکلات اور رکاوٹوں کا جواں مردی سے مقابلہ کیا — رانا محمد شاہد — ۱۷۴

طنز و مزاح

بیوی کی سوتن ..... جو زندگی کے غموں سے نجات دلا کر شوہر نامدار کو اپنے ساتھ لے جاتی تھی — عابد معز — ۱۷۷

طب و صحت

سردی سے بچانے والے ٹوٹکے ..... موسم سرما سے مخصوص قدرتی اشیا کے خواص — ڈاکٹر جاوید اقبال — ۱۹۱

مستقل سلسلے

شعر و شاعری ۲۲۰ ..... تبصرۂ کتب ۲۳۱ ..... چمنِ خیال ۲۳۵

انتخابات کا سال

گزشتہ سال میں ہماری کچھ اُمیدیں بھی بر آئیں اور بڑے سنگین مسائل بھی پیدا ہوئے جبکہ نئے سال میں انتخابات کا نہایت کٹھن مرحلہ درپیش ہوگا۔ کٹھن اس لیے کہ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۷ء کے انتخابات نے ہماری قومی تاریخ کو گہرے گھاؤ لگائے جن کی ٹیسیں آج بھی اُٹھتی رہتی ہیں۔ ہمیں اُن سے سبق سیکھ کر بڑی ہوش مندی سے منصوبہ بندی کرنا ہوگی، کیونکہ وہ منفی عناصر جو پاکستان کو دباؤ میں رکھنا چاہتے ہیں، وہ انتخابی عمل کو سبوتاژ کرنے کی سازش کرتے رہتے ہیں۔ دراصل انتخابات میں بنیادی کردار سیاسی جماعتوں، پاکستان الیکشن کمیشن اور انتخابی قوانین کا ہوتا ہے۔ ہماری بدقسمتی یہ چلی آرہی ہے کہ ہم ان تینوں معاملات کو ابھی تک حسن و خوبی سے طے کر پائے نہ عالمی تجربات سے کما حقہٗ استفادہ کر سکے۔ بیشتر جمہوری ملکوں میں سیاسی جماعتوں کی تعداد بالعموم آدھی درجن سے زیادہ نہیں ہوتی اور وہ اپنے منشور کے مطابق رائے عامہ کو منظم کرتی، عوام کو ووٹ ڈالنے کی ترغیب دیتی اور اُن کی سیاسی تربیت کرتی ہیں۔ اس عمومی روایت کے برعکس ہمارے الیکشن کمیشن نے تین سو سے زائد سیاسی جماعتیں رجسٹرڈ کر رکھی ہیں جو انتخابات میں خلفشار پھیلانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔

گزشتہ سال کے وسط میں لاہور کے قومی حلقے ۱۲۰ میں ضمنی انتخاب ہوا تو اس میں حصہ لینے والی سیاسی

جماعتوں کی تعداد درجنوں تک پہنچ گئی تھی، چنانچہ ووٹ تقسیم ہوئے اور مسلک کی بنیاد پر سیاست کرنے والی جماعتوں کو اپنی طاقت کے اظہار کا موقع ملا۔ اس تناظر میں ہمیں سب سے پہلے سیاسی جماعتوں کی رجسٹریشن کے قواعد وضوابط کا سختی سے جائزہ لینا اور جھاڑ جھنکار کی صفائی کرنا ہوگی۔ سیاسی جماعتوں کا ایک صحت مند ارتقا ہی بڑی حد تک شفاف انتخابات کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔

گزشتہ ماہ سیاسی جماعتوں کے مابین کشمکش کے نتیجے میں انتخابات کا بروقت انعقاد ہی خطرے میں پڑتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری بعض سیاسی قیادتیں بروقت انتخابات کی اہمیت اور افادیت کا پورا شعور نہیں رکھتیں اور غیر ذمے دارانہ رویہ اختیار کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتیں۔ آنے والے چھ ماہ اس اعتبار سے بیش قیمت ہیں کہ وہ انتخابات پر حد درجہ اثر انداز ہوں گے۔ سیاسی جماعتوں نے اگر ایک دوسرے پر الزام تراشیوں کی گولہ باری کے بجائے عوام کے اندر حقیقی مسائل کا شعور پیدا کیا، تو انتخابات کے نتائج قوم کے لیے یقیناً سودمند ثابت ہوں گے اور سلجھی ہوئی حکومتیں وجود میں آئیں گی، تب پاکستان اپنے داخلی اور خارجی چیلنجوں سے نبرد آزما ہونے میں کامیاب رہے گا۔

گزشتہ سال کے آخر میں ہمیں مختلف اداروں کی طرف سے بہت اچھے اشارے ملے ہیں۔ خاص طور پر فوج کے سپہ سالار جنرل قمر جاوید باجوہ کے سینیٹ سے اِن کیمرا خطاب نے بہت سارے عقدے وا کر دیے ہیں اور قوم کو بڑے خلوص کے ساتھ آگے بڑھنے کا راستہ دکھایا ہے۔ اس خطاب سے ملکی فضا میں ایک صحت مند تغیر دیکھنے میں آیا۔ بروقت انتخابات کے لیے جو آئینی بل سینیٹ میں کئی ہفتوں سے تعطل کا شکار تھا، وہ منظور ہوا اور وہ تمام شکوک وشبہات دور ہوئے جو فوج کے بارے میں پھیلائے جا رہے تھے۔ اس طرح ایک خوش گوار ماحول پیدا ہوا ہے جسے سیاست دانوں کو ہوسِ اقتدار میں پامال نہیں کر دینا چاہیے۔ اس امر کا خیال رکھنا بھی اشد ضروری ہے کہ انتخابی مہم تین چار ماہ سے زائد نہ پھیلنے پائے کہ وہ جس قدر طویل ہوگی، سیاسی تنازعات

ومناقشات اسی نسبت سے بڑھتے جائیں گے جو امن وامان کے لیے بڑے تباہ کن ثابت ہوں گے۔

قوم کو اس پہلو کا بھی جائزہ لینا ہوگا کہ الیکشن کمیشن کی ذمے داریاں بہت زیادہ اور اس کی صلاحیتیں محدود ہیں۔ بلاشبہ بائیسویں آئینی ترمیم نے اسے مالی اور انتظامی طور پر خودمختار بنا دیا ہے، مگر اسے حقیقی خودمختاری حاصل کرنے میں بڑا وقت لگے گا۔ ایک دن کے اندر پورے ملک میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا انعقاد بہت بڑا چیلنج ہے۔ ہم نے اس پر بلدیاتی انتخابات کی ذمے داری بھی ڈال دی ہے۔ ۱۹۵۶ء کے دستور میں حلقہ بندیوں کے لیے ایک جداگانہ کمیشن قائم کیا گیا تھا جبکہ ۱۹۷۳ء کے دستور میں یہ کام بھی الیکشن کمیشن کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ ان بھاری بھرکم ذمے داریوں کے باعث الیکشن کمیشن انتخابی عملے کی اچھی تربیت، نہ اُسے تحفظ فراہم کر سکتا ہے۔ انتخابی ڈیوٹی دینے والے افراد لاکھوں پر مشتمل ہوتے ہیں جن میں خواتین کی تعداد نصف کے برابر ہوتی ہے۔ قصبوں اور دیہات میں اُن کی محفوظ آمدورفت اور قیام کے انتظامات بالعموم ناقص ہونے کے باعث انتخابات کی شفافیت پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح آر۔اوز کے معاملات غیر معمولی اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔ اس اہم پہلو پر قیادت کو غیر معمولی توجہ دینی چاہیے۔ اسی طرح ریاست پر ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ کسی کو بھی قانون شکنی اور ضابطۂ اخلاق کی خلاف ورزی کی اجازت نہ دے اور فرقہ وارانہ سیاست بازی کی پوری قوت کے ساتھ حوصلہ شکنی کرے۔

اداروں نے اگر اپنی ذمے داری کا ثبوت دیا، تو اِن شاء اللہ نیا سال بہت بابرکت ثابت ہوگا۔ آنے والے مہینوں میں سیاسی جماعتوں، میڈیا، وفاقی اور صوبائی حکومتوں اور پارلیمنٹ کو اپنی تمام تر توجہ انتخابی عمل کو آسان اور شفاف بنانے پر دینا ہوگی جو ہمارے سیاسی مستقبل کو استحکام اور ایک تابندگی عطا کرے گا۔

الطاف حسن قریشی

تاریخ کا بدلتا ہوا دھارا

جغرافیائی قربتوں سے ایک نئی دنیا تشکیل پا رہی ہے

اس دنیا میں پاکستان ایک اہم کردار ہوگا اور حیرت انگیز واقعات رونما ہوں گے۔ پاکستان کے اندر بھی اور باہر بھی

الطاف حسن قریشی

دسمبر ختم ہوا اور اپنے پیچھے ایک جہانِ آرزو چھوڑ گیا ہے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ نے کئی صدیوں بعد ایک نئی کروٹ لی ہے اور جغرافیے کی قربتیں اس کا دھارا تبدیل کر رہی ہیں۔ تہذیبوں اور قوموں کے عروج و زوال کے اصول اور قاعدے شہرۂ آفاق مؤرخ ابنِ خلدون نے اپنے مقدمے میں بیان کیے ہیں اور عہدِ حاضر کے مایہ ناز تاریخ دان ٹائن بی نے ان میں گراں قدر اضافے کیے ہیں۔ وہ قومیں جن کو علمی اور اخلاقی برتری حاصل ہوتی ہے اور جن میں اصولوں اور آدرشوں کے لیے عصبیت پائی جاتی ہے، ان کو امامت کا منصب ملتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب مسلمان ریاضی، طبیعات، سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی میں سب سے آگے تھے، جس کی بدولت اسلامی تہذیب و تمدن کا ہزار سال سے زائد دنیا میں غلبہ رہا۔ استنبول کے عجائب گھر توپ قاپی میں آج بھی وہ تحائف محفوظ ہیں جو چین، روس، فرانس، برطانیہ، ہنگری اور جرمنی کے حکمران بڑی باقاعدگی سے ترک سلاطین کو بھیجتے اور اُن سے خوف کھاتے تھے۔ مسلمانوں کی عسکری طاقت کا یہ عالم تھا کہ ۱۶۸۲ء میں ترکوں نے ویانا کا محاصرہ کر لیا تھا اور ہسپانوی مسلمان فرانس کے جنوب تک پہنچ گئے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی علمی فوقیت اور اخلاقی طاقت میں ضعف آتا گیا جبکہ اس دوران یورپ میں احیائے علوم کی تحریک چلی اور تاریخ کا دھارا تبدیل ہو گیا۔

یورپی اقوام علم اور سائنس کی بنیاد پر عالمی اُفق پر نمودار ہوئیں، مگر آپس میں سو سو سال تک دست و گریباں رہیں اور آخرکار برطانوی قوم نے بہت عروج پایا۔ براعظم امریکا، افریقا، آسٹریلیا اور بڑی حد تک ایشیا کے بیشتر ممالک اس کے زیرِ نگیں آ گئے اور برطانوی سلطنت کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس میں سورج غروب نہیں ہوتا۔ یہ کیفیت ایک صدی کے لگ بھگ قائم رہی لیکن دوسری جنگِ عظیم میں برطانوی سامراج کا سورج غروب ہو گیا۔ اس کی جگہ امریکا ایک عظیم عالمی طاقت کے طور پر اُبھرا۔ اس نے کئی صدیاں پہلے برطانیہ سے آزادی حاصل کر کے اپنے ہاں اعلیٰ درجے کی

یونیورسٹیاں اور تجربہ گاہیں قائم کر لی تھیں جن کے ذریعے سائنس اور ٹیکنالوجی کی نئی جہتیں دریافت کی جا رہی تھیں۔ امریکی قوم کے اندر ابراہم لنکن، واشنگٹن اور جیفرسن جیسے مدبّر پیدا ہوئے جنھوں نے انسانی آزادیوں کے اعلیٰ تصورات کی بنیاد پر آئین وضع کیا اور مقامی حکومتوں کو اختیارات تفویض کیے جس کی بدولت معاشرہ ترقی کرتا گیا۔ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے پر اس وقت کی بڑی طاقتوں کو احساس ہوا کہ آئندہ جنگ کی روک تھام کے لیے عالمی سطح پر ایک طاقتور ادارہ قائم کیا جانا چاہیے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد اسی مقصد کے لیے لیگ آف نیشنز قائم ہوئی تھی لیکن وہ اس لیے ناکام ثابت ہوئی کہ امریکا اس میں شامل نہیں تھا، چنانچہ اس بار اقوامِ متحدہ کے نام سے جو ادارہ وجود میں آیا، اس کی سربراہی امریکا کو سونپ دی گئی۔ اس ادارے کے قیام کے لیے اسی نے نیویارک میں جگہ بھی فراہم کی اور خطیر مالی امداد بھی دی۔ رکن سازی کا بنیادی کام بھی اسی کی نگرانی میں ہوا۔ زیادہ اختیارات سیکورٹی کونسل کو سونپے گئے جس میں پانچ بڑی طاقتوں کو ویٹو کا حق سونپا تھا۔ ان پانچ میں سے چار امریکی حلقۂ اثر میں آتے ہیں۔ اس طاقت کے بل بوتے پر اس نے نومبر ۱۹۴۷ء میں ان گنت غیر اخلاقی اور جبری حربے استعمال کرتے ہوئے جنرل اسمبلی سے اسرائیلی ریاست کے حق میں دو تہائی ووٹ کی تگ و دو کی اور فلسطین سے عربوں کو جبری طور پر نکالنے میں صیہونی دہشت گردوں کی مدد کی۔ بعض عرب ممالک نے صیہونی ریاست کو وجود میں آنے سے روکنے کے لیے طاقت استعمال کی، مگر مصر اور شام کی فوجیں ناکام رہیں، البتہ اُردن کی فوج نے دریائے اُردن کے مغربی کنارے اور بیت المقدس پر قبضہ کر لیا جو ۱۹۶۷ء کی اسرائیل عرب چھ روزہ جنگ میں اسرائیل کے قبضے میں چلا گیا اور اس نے یہودی بستیاں بسانا شروع کر دیں اور سیکورٹی کونسل کی قراردادوں کی ذرہ برابر پروا نہیں کی۔

☆☆☆

پاکستان کا شروع ہی سے امریکا کی طرف جھکاؤ تھا، کیونکہ اس نے اس کے قیام کا خوش دلی سے خیر مقدم کیا تھا اور پہلی تقریبِ آزادی میں سب سے بڑا اور مقتدر وفد بھیجا تھا مگر سوویت یونین نے پاکستان کی تشکیل کو سامراجی طاقتوں کی سازش قرار دیا تھا۔ آگے چل کر برصغیر میں اشتراکیت کی پیش قدمی روکنے کے لیے امریکا نے پاکستان کے ساتھ فوجی معاہدے بھی کیے اور خاطر خواہ امداد بھی فراہم کی۔ سوویت یونین کے اثر و رسوخ کی روک تھام کے لیے اس نے جرمنی اور جاپان کے لیے بھی مارشل پلان تیار کیا گیا اور ان دونوں ملکوں کے دفاع کے ذمے داری خود اُٹھالی تھی، جس کی وجہ سے یہ دونوں قومیں دنیا کی بڑی معیشتوں میں شامل ہو گئیں۔ اس وقت جرمنی پورے یورپ میں اقتصادی طور پر سب سے زیادہ مضبوط جبکہ جاپان دنیا کی دوسری بڑی معیشت کا مقام حاصل کر چکا ہے۔ سرد جنگ کے زمانے میں اپنی حیثیت مستحکم رکھنے کے لیے یہ امریکہ کی مجبوری تھی کہ اس کا ساتھ دینے والے ممالک معاشی طور پر توانا رہیں تاکہ اشتراکی تصورات ان کے عوام کو متاثر نہ کر سکیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں غیر معمولی ترقی کرنے کے باعث امریکا سب سے پہلے ایٹم بم بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس خطرناک ہتھیار کی تیاری کا خیال اُسے جاپان کے پرل ہاربر پر حملے سے آیا تھا جو اس نے ۱۹۴۱ء میں کیا تھا اور سینکڑوں امریکی ہلاک کر دیے تھے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران جرمنی کی فوجی طاقت کے مقابلے میں فرانس اور یورپ کے بیشتر ممالک پسپا ہو گئے تھے اور برطانیہ بھی خوفناک بمباری سے ادھ موا ہو چکا تھا۔ جرمنی کا اتحادی جاپان تھا جو پیش قدمی کرتے ہوئے سنگاپور اور برما تک پہنچ گیا تھا۔ ہندوستان کی طرف اس کی پیش قدمی روکنے کے لیے امریکا نے جاپان کے دو شہروں پر ایٹم بم گرائے جس میں لاکھوں جاپانی ہلاک ہوئے اور جاپان کو اتحادی فوجوں کے سامنے ہتھیار ڈالنا

پڑے۔ اس طرح طاقت کا توازن امریکا کے ہاتھ میں چلا گیا اور برطانیہ کو بتدریج اپنی تمام نوآبادیات سے دستبردار ہونا پڑا۔ تاریخ کا دھارا یکسر تبدیل ہو چکا تھا۔

دوسری جنگِ عظیم میں امریکا اور سوویت یونین سپر پاور کے طور پر اُبھرے۔ یہ دونوں عالمی طاقتیں دو مختلف اور متضاد نظریۂ حیات سے وابستہ تھیں۔ امریکا آزاد معیشت اور جمہوری اقدار کا حامی جبکہ سوویت یونین اشتراکی نظریات کا علمبردار اور فوجی انقلاب کے ذریعے اس دوسرے ملکوں میں برآمد کرنے کے لیے حد درجہ مستعد تھا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا جب سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کے اندر کرپشن سرطان کی طرح پھیلتی گئی اور داخلی تضادات پر قابو پانے کے لیے اس نے مہم جوئی کا راستہ اختیار کیا اور دسمبر ۱۹۷۹ء کی ایک رات افغانستان میں اپنی فوجیں داخل کر دیں۔ ہمسائے ملک پر غیر ملکی فوجوں کی یلغار پاکستان کی سلامتی کے لیے بہت بڑا سنگین چیلنج تھی جس کا جنرل ضیاء الحق اور اُن کی ٹیم نے ایک ویژن اور کمال حکمت عملی سے مقابلہ کیا۔ سب سے پہلے مسلم اُمہ کی حمایت حاصل کی جس کے باعث پوری آزاد دُنیا کو اُن کا ساتھ دینا پڑا۔ جہادِ افغانستان دس برسوں پر محیط رہا اور سوویت یونین کو ذلت آمیز شکست سے دوچار ہو کر افغانستان سے جانا پڑا۔ یہ انسانی تاریخ کا بہت بڑا واقعہ تھا جس نے حالات کا دھارا یکسر بدل ڈالا تھا۔

☆☆☆

اب امریکا اپنے آپ کو پوری دنیا کا حکمران سمجھنے لگا تھا اور اس نے ایک نیا ورلڈ آرڈر بھی جاری کر دیا تھا، لیکن پاکستان جس نے ہزار خطرات مول لے کر اور ان گنت آزمائشوں سے گزر کر افغانستان کو روسی فوجوں سے نجات دلائی تھی اُس نے اس کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں اور اس پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کر دیں۔ اس پر پاکستانی قیادت نے غیر معمولی صبر و تحمل سے کام لیا اور اپنی ساری توجہ ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے پر مرکوز رکھی۔ وزیراعظم نواز شریف نے بھارت کی طرف سے پانچ ایٹمی دھماکوں کے جواب میں دو ہفتوں بعد چھ دھماکے کر ڈالے، حالانکہ امریکی صدر انہیں باز رکھنے کی ہر تدبیر آزماتے اور اربوں ڈالروں کی پیش کش کرتے رہے۔ مئی ۱۹۹۸ء میں دھماکوں کے ذریعے پاکستان ایٹمی طاقت بننے کا اعلان کر چکا تھا جس پر امریکا سخت برہم تھا۔ اگلے سال معرکۂ کارگل برپا ہوا جو ایٹمی تصادم کے قریب پہنچ گیا تھا۔ سیز فائر کے لیے وزیراعظم نواز شریف کو امریکی صدر کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا جنہوں نے بھارتی شرائط پر پاکستان کے وزیراعظم سے معاہدے پر دستخط کروائے۔ اکتوبر ۱۹۹۹ء میں جنرل پرویز مشرف نے حکومت کا تختہ اُلٹ کر اقتدار پر قبضہ کر لیا اور اس کے بعد نیویارک میں نائن الیون وقوع پذیر ہوا۔ سارا الزام اسامہ بن لادن پر لگا جو اس وقت افغانستان میں تھے۔ طالبان حکومت نے آداب مہمان نوازی کے مطابق انہیں امریکا کے حوالے کرنے سے انکار کیا جس پر سلامتی کونسل نے افغانستان کے خلاف طاقت استعمال کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ جنرل پرویز مشرف نے اتحادی افواج کو افغانستان پر حملہ آور ہونے کے لیے عوام کو اعتماد میں لیے بغیر، جملہ سہولتیں فراہم کیں اور نیٹو افواج نے افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ امریکی صدر نے جنرل پرویز مشرف کے ساتھ ملاقات میں یقین دلایا کہ اسٹریٹیجک پارٹنرشپ اس بار بہت پائیدار ثابت ہوگی، مگر صدر کلنٹن اور صدر اوباما بھارت کی طرف جھکتے آئے اور اسے جنوبی ایشیا کا تھانے دار بنانے کے عملی اقدام اُٹھاتے رہے۔ ساتھ ہی ساتھ پاکستان کو طفل تسلیاں دینے کا سلسلہ بھی جاری رکھا کہ ہم اس کی دوستی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور اس کے تعاون کو بڑی

اہمیت دیتے ہیں۔

☆☆☆

مسٹر ڈونلڈ ٹرمپ نے انتخابی مہم کے دوران صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں کامیابی کی صورت میں بھارت کے ساتھ قریبی تعلقات کو اہمیت دوں گا اور اسرائیلی موقف کی پوری قوت سے حمایت کروں گا۔ اُن کی غیر متوقع کامیابی نے ان کی نفسیات میں ایک زبردست ارتعاش پیدا کر دیا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ پوری دنیا پر حکم چلا سکتے اور اپنا ہدف حاصل کرنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ دماغ کے اسی خلل نے انہیں یہ اعلان کرنے کی ترغیب دی کہ ہم بیت المقدس کو اسرائیل کا دارالحکومت تسلیم کرتے ہیں اور وہاں اپنا سفارت خانہ منتقل کر رہے ہیں۔ سلامتی کونسل میں یہ اعلان زیرِ غور آیا تو چار مستقل اور دس غیر مستقل ارکان کی طرف سے شدید مخالفت ہوئی۔ اس کے بعد جنرل اسمبلی میں مصر نے امریکا کے خلاف قرارداد پیش کی جس پر پاکستان، ترکی اور یمن نے بھی دستخط کیے تھے۔ اس پر امریکا نے اپنے سفارت خانوں کے ذریعے اقوامِ متحدہ کے ارکان کو خطوط بھیجے اور امریکی خاتون سفیر نکی ہیلے نے رعونت بھرے لہجے میں دھمکی دی کہ ہم ان ممالک کے نام نوٹ کریں گے جو قرارداد کے حق میں ووٹ دیں گے، ان کی امداد کم یا ختم کر دی جائے گی۔ ان تمام دھمکیوں کے باوجود ۱۲۸ ممالک نے قرارداد کے حق میں ووٹ دیے۔ اس پر امریکی صدر نے بڑی بے نیازی سے کہا 'ہمیں اس کی ذرا پروا نہیں۔' امریکی سفیر نکی ہیلے نے یہ بھی کہا کہ اقوامِ متحدہ ہمارے پیسوں سے چل رہی ہے اور ہم اس کی امداد میں بھی تخفیف کر سکتے ہیں۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق امریکا نے اقوامِ متحدہ کے بجٹ میں ۲۸۵ بلین ڈالر کی کمی کر دی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ صدر ٹرمپ کے فیصلے کے خلاف دنیائے عرب کی طرف سے غیر معمولی ردِعمل نہیں آیا اور او آئی سی میں بھی زوردار تقریروں کے سوا کوئی ٹھوس لائحہ عمل طے نہیں کیا گیا۔ یہ بھی درست ہے کہ اس وقت امریکا دنیا کی واحد سپر پاور ہے اور فوجی طاقت میں سب پر حاوی ہے، مگر دنیا کی سب سے بڑی پارلیمنٹ میں ۱۲۸ ارکان کی آواز دراصل انسانی ضمیر کی ناقابل شکست آواز ہے جس نے امریکا کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا ہے۔ اس آواز میں امریکا کے قریبی اتحادیوں یعنی برطانیہ، فرانس، جرمنی، جاپان اور بھارت کی آواز بھی شامل ہے۔ پوری عالمی برادری بین الاقوامی قانون اور انصاف کی دھجیاں اُڑانے والی سپر پاور کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ پوپ فرانسس نے کرسمس کے موقع پر مسیحی برادری کو جو پیغام دیا ہے، اس میں بیت المقدس میں قیامِ امن اور دو ریاستی نظریے کی حمایت کی ہے۔ خود امریکہ میں صدر ٹرمپ کے فیصلے کے خلاف شدید ردِعمل دیکھنے میں آ رہا ہے۔ کانگرس، تھنک ٹینکس، میڈیا اور عوام کے مقتدر حلقوں میں شدید اضطراب پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دنیا میں طاقت کے نئے مراکز قائم ہو رہے ہیں جو امریکی بالادستی کو چیلنج کر رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ایشیا اپنے معاملات اپنے ہاتھ میں لینے اور اپنا مستقبل خود تعمیر کرنے کے لیے تیار ہو چکا ہے۔

☆☆☆

دراصل امریکا دوسری جنگِ عظیم کے بعد شرقِ اوسط میں اپنی بالادستی کی بساط بچھانا اور اس کے قدرتی وسائل پر قبضہ جمانا چاہتا تھا، چنانچہ اس نے اسرائیلی ریاست کی تشکیل میں شرمناک اور قابلِ مذمت کردار ادا کر کے عرب ریاستوں کے سینوں میں خنجر گھونپ دیا تھا۔ دہشت گرد ڈیوڈ بین گورین نے امریکی طاقت کے بل بوتے پر جب ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو اسرائیلی ریاست کے قیام کا اعلان کیا، تو امریکی صدر ٹرومین کی انتظامیہ نے اسے گیارہ منٹ کے اندر اندر تسلیم کر لیا تھا اور

آباد آئے، پاکستان کے تعاون کی تعریف کی مگر وہاں سے گئے تو ان کا لب ولہجہ یکسر بدلتا گیا اور وہ پاکستان کو دھمکیاں دینے پر اُتر آئے۔

☆☆☆

امریکا جس کی اپنی اخلاقی ساکھ میں روز بروز کمی آرہی ہے، اس کے وائس پریزیڈنٹ غیر اعلانیہ دورے پر ایک اندھیری رات میں بگرام ائیربیس پہنچے اور وہاں انھوں نے فوجی افسروں کے سامنے کہا کہ ہم نے پاکستان کو نوٹس پر رکھا ہوا ہے اور فوجی افسروں کو اختیار دے دیا ہے کہ انھیں جہاں کہیں بھی دہشت گرد نظر آئیں، انھیں فوراً شوٹ کر دیا جائے۔ انھوں نے یہ اشارہ بھی دیا کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان تصادم ایٹمی جنگ میں بھی تبدیل ہوسکتا ہے۔ امریکی وائس پریزیڈنٹ کے بیان پر پاکستانی دفتر خارجہ کے ترجمان اور آئی ایس پی آر کے ڈائریکٹر جنرل نے نہایت نپا تلا اور جرأت مندانہ جواب دیا ہے اور قومی امنگوں کی ترجمانی کی ہے۔ اس دوران ہمارے خطے میں دو ایسے بڑے واقعات ظہور پزیر ہوئے ہیں جن سے حالات کا رخ تبدیل ہونے لگا ہے اور تاریخ ایک نئی کروٹ لیتی نظر آتی ہے۔ ہوا یہ کہ قومی اسمبلی کے اسپیکر جناب سردار ایاز صادق جو گہری بصیرت کے مالک ہیں، انھوں نے چھ علاقائی ملکوں کی اسمبلیوں کے اسپیکرز کی کانفرنس کا اسلام آباد میں اہتمام کیا اور ان کی دعوت پر چین، روس، ایران، افغانستان اور ترکی سے وفود آئے۔ دو روزہ کانفرنس میں علاقائی اور بین الاقوامی معاملات زیر بحث آئے اور ایک متفقہ اعلامیہ جاری ہوا۔ اس میں طے پایا کہ دہشت گردی اس علاقے کا سب سے سنگین مسئلہ ہے اور اس کے قلع قمع کے لیے مشترکہ کوششیں پوری قوت کے ساتھ کی جائیں گی۔ اس بات پر بھی سب نے اتفاق کیا کہ امریکا کو اس خطے میں کسی مہم جوئی کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ تیسرا متفقہ نکتہ یہ تھا کہ کشمیری عوام کو ان کا حق خود ارادیت ملنا چاہیے۔ اس کے علاوہ پارلیمانی ڈپلومیسی کے ذریعے باہمی تنازعات طے کیے جائیں گے اور جغرافیائی قربتوں سے تاریخ کا دھارا تبدیل کیا جائے گا۔ چھ ملکی اسپیکرز کانفرنس نے امریکی جنگ جوئی کے آگے مضبوط بند باندھ دیا ہے جو دنیا کی ایک تہائی آبادی کی ترجمانی کر رہی تھی۔

امریکا افغانستان کے ذریعے پاکستان پر دباؤ بڑھانے کے عمل میں تیزی لا رہا ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان اور افغانستان تاریخی، دینی اور ثقافتی رشتوں میں جڑے رہنے کے باوجود اچھے ہمسائے ثابت نہیں ہوئے ہیں اور بھارت افغانستان کے ذریعے تخریبی کارروائیوں میں ملوث پایا گیا ہے۔ چین جو پاکستان کا ایک آزمودہ دوست اور قابل اعتماد اقتصادی پارٹنر ہے، اس نے اس خطے میں امریکی مداخلت کی روک تھام اور پاکستان اور افغانستان کے کشیدہ تعلقات میں بہتری لانے کے لیے گزشتہ جون میں عملی اقدامات تیز کر دیے تھے۔ دراصل ۲۰۱۵ء میں افغانستان اور افغان طالبان کے مابین امن مذاکرات میں ڈیڈ لاک پیدا ہوگیا تھا اور افغانستان کے صوبہ بدخشاں سے دہشت گرد چین کے مغربی حصے میں سرگرم ہوگئے تھے۔ ۲۰۱۷ء کے وسط میں پاکستان اور افغانستان کے روابط نہایت کشیدہ تھے۔ ایسے میں چین کے وزیر خارجہ وانگ ژی اسلام آباد اور کابل کے درمیان شٹل ڈپلومیسی کے ذریعے مفاہمت کی راہ ہموار کرتے رہے، چنانچہ اکتوبر ۲۰۱۷ء میں پاکستان کے آرمی چیف جنرل قمر باجوہ کابل گئے اور افغان صدر اشرف غنی نے اس امر پر اتفاق کیا کہ دوطرفہ بات چیت کا ایک ہمہ جہتی ایجنڈا تیار کیا جائے گا۔ اس کے بعد پاکستان نے دونوں ملکوں کے لیے ایک ایکشن پلان تیار کر کے حکومت افغانستان کو بھیجا جس میں پانچ ورکنگ گروپس تجویز کیے گئے تھے۔ اسی اثنا امریکی وائس پریزیڈنٹ افغانستان آئے اور پاکستان

کے خلاف نازیبا زبان استعمال کرتے رہے جس کے جواب میں چین نے فوری طور پر افغانستان، پاکستان اور چین کے وزرائے خارجہ کی سہ فریقی کانفرنس کا اہتمام کیا اور میزبانی کے فرائض سرانجام دیے۔ اس کانفرنس میں دور رس فیصلے کیے گئے اور ایک ایسے راستے کا انتخاب ہوا جو اس خطے میں کشیدگی کے خاتمے اور امن، سلامتی اور اقتصادی خوش حالی کے فروغ کا ضامن ثابت ہوگا۔ افغان وزیر خارجہ صلاح الدین ربانی نے چین کی مخلصانہ کوششوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہم چین کی دیانت داری اور خلوص پر اعتماد کرتے ہیں اور دہشت گردی کے خاتمے کے لیے مل جل کر کام کرنے کا عزم دہراتے ہیں۔ پاکستانی وزیر خارجہ جناب خواجہ آصف نے اس امید کا اظہار کیا کہ پاکستان اور افغانستان کے تعلقات معمول پر آجائیں گے اور انسداد دہشت گردی کی مفاہمتی یادداشت پر عمل درآمد شروع ہوجائے گا۔ تین ممالک کے وزرائے خارجہ نے افغان طالبان کو امن کے عمل میں شامل ہونے کی دعوت دی ہے اور یہ عہد کیا ہے کہ ان کی سرزمین کسی بھی ملک کے خلاف دہشت گردی کے لیے استعمال نہیں ہوگی۔ سہ فریقی کانفرنس میں سب سے اہم پیش رفت یہ ہوئی ہے کہ چین اور پاکستان نے سی پیک میں کابل کو شامل کرنے کی پیش کش کی ہے جس پر بتدریج اتفاق رائے پیدا کیا جائے گا۔ سی پیک دراصل جغرافیائی قربتیں پیدا کرنے اور جنوبی، وسطی اور مغربی ایشیا کو ایک دوسرے کے ساتھ پیوست کرنے کا زبردست منصوبہ ہے جس سے افریقی اور یورپی براعظم بھی فائدہ اٹھا سکیں گے۔ اس طرح انسانی براریاں ایک دوسرے کے قریب آئیں گی اور تعاون اور ہم آہنگی کے راستے کشادہ ہوتے جائیں گے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ بیجنگ میں سہ فریقی مذاکرات سے امریکا کو یہ پیغام پہنچ گیا ہے کہ علاقائی طاقتیں اب کسی سے ڈکٹیشن نہیں لیں گی اور اپنے معاملات خود طے کریں گی۔ بھارت کو بھی یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا افغانستان میں کردار بالآخر ختم ہونے والا ہے۔

☆☆☆

پاکستان امریکا سے الجھتے رہنے کے بجائے اپنے دوستوں اور بہی خواہوں کے حلقے میں اضافے کی پالیسی پر گامزن ہے۔ پچھلے سال اس نے شنگھائی تعاون تنظیم کی رکنیت اختیار کی تھی جس میں چین، روس، بھارت اور وسطی ایشیائی ریاستیں شامل ہیں۔ چین کا اس تنظیم میں کلیدی کردار ہے جس کے باعث پاکستان کو بھی ایک اہمیت حاصل ہے اور بھارت بڑی طاقتوں کے اندر جکڑا گیا ہے جس نے اپنی عددی طاقت کی بنیاد پر سارک تنظیم کو اپنا یرغمال بنا رکھا ہے جبکہ شنگھائی تعاون تنظیم کے اندر اس کی حیثیت کسی قدر دب گئی ہے۔ بدقسمتی سے بھارت میں جو طبقہ حکمران ہے، وہ کٹر ہندو بنیاد پرست ہے جو معاشرے میں شدید نفرت پھیلانے اور دشمنیاں پیدا کرنے کا باعث بن رہا ہے۔ مسلمانوں، مسیحوں، سکھوں اور اچھوتوں کے ساتھ اس کا طرزِ عمل سخت غیر اخلاقی اور حد درجہ غیر منصفانہ ہے۔ اسی طرح مقبوضہ کشمیر میں پیلٹ بندوقوں سے وہاں کے بچے، جوان اور بوڑھے اندھے کیے جا رہے ہیں۔ پاکستان جو مسئلہ کشمیر کا ایک مسلمہ فریق ہے، وہ جب مظلوم کشمیری عوام کے حق میں آواز اٹھاتا ہے، تو اس پر دہشت گردی کا الزام دھر دیا جاتا ہے اور امریکا اس کی مدد کو پہنچ جاتا ہے، مگر عالمی رائے عامہ بھارت کی چالاکیوں اور مقبوضہ کشمیر میں اس کی چیرہ دستیوں سے واقف ہوتی جا رہی ہے۔ چھ ملکی اسپیکرز کانفرنس میں بھی اہل کشمیر کے حق خود ارادیت کی حمایت میں آواز اٹھائی گئی ہے۔ پاکستان پوری جرأت کے ساتھ اپنا فرض ادا کر رہا ہے حالانکہ بھارت اور امریکا کوئی گل کھلانے پر تلے ہوئے ہیں۔ حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ تاریخ کا دھارا اُن کے خلاف ہوتا جا رہا ہے۔ جنرل اسمبلی کے ۱۲۸ ارکان امریکا کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہوگئے ہیں کہ اس نے بیت المقدس کو

اسرائیل کا دارالحکومت تسلیم کر کے بین الاقوامی قانون کی سنگین خلاف ورزی کی ہے اور سیکورٹی کونسل کی قراردادوں کا مذاق اُڑایا ہے۔ اسی طرح بھارت دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا کہ وہ محکوم کشمیریوں اور اپنی اقلیتوں کا قاتل ہے اور وہاں رواداری، برداشت اور انسانی قدروں کا گلا گھونٹا جا رہا ہے۔

☆☆

گزشتہ سال ۲۸ جولائی سے پاکستان ایک بہت بڑی آزمائش سے دوچار ہے۔ عدالت عظمیٰ کے پانچ رکنی بنچ کی طرف سے وزیراعظم نواز شریف کو نااہل قرار دینے پر ایک سیاسی طوفان اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ حکومت مسلم لیگ نون ہی کی ہے مگر اس کی قوت نافذہ میں بہت کمی واقع ہوئی۔ جناب نواز شریف کی جگہ جناب شاہد خاقان عباسی وزیراعظم بنے ہیں جو بڑی عمدگی اور فرض شناسی سے کارہائے منصبی سرانجام دے رہے ہیں، مگر انہیں کچھ ناگہانی واقعات کا سامنا ہے۔ انتخابی اصلاحات کا بل جب سینیٹ میں منظوری کے لیے پیش ہوا تو سینیٹر جناب حمداللہ نے اس پہلو کی طرف توجہ دلوائی کہ ختم نبوتؐ کے حلف نامے میں تبدیلی کر دی گئی ہے، چنانچہ انھوں نے بل میں ترمیم پیش کی جس کی وزیر قانون نے حمایت مگر اپوزیشن جماعتوں نے اس سے اختلاف کیا۔ اس پر عوام کے اندر شدید ردعمل پیدا ہوا اور قانون میں ختم نبوت کا حلف نامہ دونوں ایوانوں کی منظوری سے بحال کر دیا گیا۔ حکومت کے ذمے دار لوگوں نے کوتاہی پر معافی بھی مانگ لی، لیکن ایک مذہبی گروہ نے مطالبہ کیا کہ جن جن وزیروں سے غلطی سرزد ہوئی ہے، ان سے استعفا لیا جائے اور ان پر مقدمات بنائے جائیں۔ حکومت لیت ولعل سے کام لیتی رہی۔ اس پر ایک مذہبی گروہ نے اسلام آباد میں دھرنا دینے کا اعلان کر دیا۔ خادم حسین رضوی صاحب کی قیادت میں چند ہزار لوگ فیض آباد انٹرچینج پر قابض ہو گئے اور حکمرانوں اور معزز جج صاحبان کو انتہائی غلیظ گالیوں سے نوازتے رہے۔ اس دھرنے سے اسلام آباد سے راولپنڈی جانے کے راستے میں رکاوٹیں پیدا ہوئیں اور حکومت بے بس نظر آئی۔ تب اسلام آباد ہائی کورٹ نے انتظامیہ کو سرزنش کرتے ہوئے احکامات صادر کیے اس پابندی کے ساتھ کہ پولیس اسلحہ استعمال نہیں کرے گی۔ آپریشن کے دوران مظاہرین پولیس والوں کی وردیاں پھاڑتے اور انہیں تشدد کا نشانہ بناتے رہے۔ پاکستان پر چند راتیں بہت بھاری گزریں۔ دنیا یہ تاثر لے رہی تھی کہ پاکستان کی ریاست ناکام ہو چکی ہے اور مذہبی جنونیوں نے حکومت کو شکست سے دی ہے۔ خوفناک ڈیڈلاک ختم کرنے کے لیے فوج کو درمیان میں آنا پڑا اور مظاہرین کی طرف سے تیار کردہ ایک ایسے معاہدے پر حکومت کے اور فوج کے نمائندوں کو دستخط کرنا پڑے جو انتہائی مضحکہ خیز اور قانونی تقاضوں کے یکسر منافی تھا۔

☆☆☆

اس المناک واقعے سے تمام ریاستی اداروں کو اصل خطرے کا شدید احساس ہو چلا ہے۔ ایک غیر ذمے دار مذہبی گروہ ختم نبوتؐ کی آڑ میں عوام کے اندر ہیجان پیدا کر کے بادشاہ گری کے منصب پر فائز ہونا چاہتا ہے۔ یہ پیر خطیب اور گدی نشین کلمہ گو مسلمانوں کو طرح طرح کے مسائل میں الجھا کے رکھتے ہیں۔ سپریم کورٹ کے فاضل جج جسٹس دوست محمد نے ایک مقدمے کی سماعت کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارے سیاست دان بھی ان پیروں کے مرید ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیالوی صاحب پنجاب کے وزیر قانون رانا ثناء اللہ کا استعفا اور مسلمان ہونے کا حلف مانگ رہے ہیں جبکہ طاہر القادری نے وزیراعلیٰ شہباز شریف اور رانا ثناء اللہ کو مستعفی ہونے کی آخری تاریخ ۳۱ دسمبر کی دے دی ہے۔ ختم نبوتؐ کے نام پر بڑے

بڑے اجتماعات منعقد کیے جا رہے ہیں جن میں اراکین اسمبلی کے استعفے پیش کیے جاتے ہیں۔ اس خطرناک رجحان کی پیش بندی تمام ریاستی اداروں کی بہت بڑی ذمے داری ہے۔ سینیٹ میں آرمی چیف جنرل قمر باجوہ نے اپنے اہم ترین ساتھیوں کی معیت میں پوری صورت حال کا بڑی حقیقت پسندی اور ذمے داری سے جائزہ لیا ہے اور اس امر کا واشگاف اعلان کیا ہے کہ حکومت چلانا فوج کا نہیں منتخب نمائندوں کا کام ہے۔ اور ہم پارلیمان کی طے کردہ خارجی اور دفاعی پالیسی پر عمل درآمد کریں گے اور جمہوریت کو فروغ دینے میں اپنا کردار ادا کرتے رہیں گے۔ انھوں نے اس پھیلتے ہوئے تاثر کا پوری قوت سے ازالہ کیا کہ فیض آباد دھرنے میں فوجی ادارے کا کوئی ہاتھ نہیں تھا اور اگر ثابت ہو جائے تو استعفا دے دیں گے۔ وہ یہ بھی یقین دلا رہے تھے کہ پاکستان کی مسلح افواج ہر قسم کے داخلی اور خارجی چیلنجوں سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور ہمیں امریکا کی دھمکیوں سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ ریٹائرڈ فوجی افسر جو ٹی وی پر آتے ہیں، وہ فوج کی نمائندگی نہیں کرتے اور ہم سب کو مل جل کر پاکستان کو آگے کی طرف لے جانا ہے۔ اس موقع پر سینیٹ کے چیئرمین جناب میاں رضا ربانی نے حالات کی گمبھیرتا پر کھل کر باتیں کیں اور قوم کا یہ عزم دہرایا کہ امریکا کو اس خطے میں کسی مہم جوئی کی اجازت نہیں دیں گے۔ سینیٹ میں سیاست دانوں اور فوج کی اعلیٰ قیادت کے ساتھ جو مکالمہ ہوا، اسے ہماری قومی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی ہے اور گزشتہ ڈائیلاگ کا عمل شروع ہو چکا ہے۔

میڈیا اور سیاسی حلقوں میں بھی یہ احساس پیدا ہوتا جا رہا ہے کہ مذہبی ہیجان انگیزی پر قابو پانا ملکی استحکام کے لیے اشد ضروری ہے۔ سیاسی قائدین کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں کہ مذہبی فرقہ پرستی کے مقابلے میں سیاسی رشتے کمزور پڑتے جا رہے ہیں اور عالمی برادری میں پاکستان کے لیے مشکلات پیدا ہو رہی ہیں۔ فیض آباد کا دھرنا نہ ہوتا تو امریکا پاکستان کے خلاف سخت زبان استعمال کرنے سے پہلے سو بار سوچتا۔ واثق امید ہے کہ جغرافیائی قربتوں سے پاکستان کے اندر بھی ایک عظیم تبدیلی طلوع ہوگی اور پرامن انتقال اقتدار کی روایت مستحکم ہوتی جائے گی۔ امیدوں اور نیک تمناؤں کے اظہار کے ساتھ ساتھ اُفق پر گہرے بادل منڈلاتے دکھائی دے رہے ہیں جن میں بجلیاں سی بھی کوندتی رہی ہیں۔ امریکا کے خطرناک عزائم کے برملا اظہار کے باوجود ہماری بعض سیاسی جماعتیں ہنگامہ آرائی پر تلی ہوئی ہیں جس سے جمہوری اور سیاسی عمل میں خلل پڑ سکتا ہے جس سے فائدہ اٹھا کر امریکا کوئی خطرناک قدم اٹھا سکتا ہے۔ اس کا کچھ اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ سعودی عرب نے اچانک ایک جہاز بھیج کر شہباز شریف کو اپنے ہاں بلایا ہے۔ اندریں حالات یہ بلاشبہ ایک غیر معمولی اہمیت کا واقعہ ہے جو حالات میں تیز رفتار تبدیلی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ دوست اور خیرخواہ پاکستان کی حمایت میں نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ حمایت اسی وقت کارگر ثابت ہوگی جب گھر کے اندر معاملات دانش مندی اور احساس ذمے داری سے چلائے جانے کے انتظامات مستحکم ہوں گے اور سبھی کو نظر آئیں گے۔ اس وقت ہمارے سیاست دان، ہمارے فوجی، عدالتی ادارے، ہمارے دانش ور اور میڈیا اور خاص طور پر سوشل میڈیا کے کارپرداز عرصہ امتحان میں ہیں اور ہمارے ارباب دولت اور مذہبی رہنما بھی۔ تاہم یہ خوشخبری بہت ڈھارس بندھاتی ہے کہ دنیا امریکا سے بہت بڑی ہو گئی ہے اور اس کا عالمی نظام آخری ہچکیاں لے رہا ہے جبکہ ایشیا کے بطن سے ایک نیا عالمی نظام جلوہ گر ہونے والا ہے۔ ●●●

عاصم محمود

خفیہ سازشوں اور چالوں سے ایک مملکت پر سیاسی
معاشی اور ثقافتی طور پر کیسے قبضہ کیا جائے...

اکیسویں صدی کا عجوبہ

جنگ کے بغیر ایک مُلک فتح کرنا!

کے جی بی کے سابق افسر کی زبانی فنِ براندازی پر تحیر خیز داستان

یہ فروری ۱۹۷۰ء کی بات ہے، یوری بزمنوف نے ہپیوں جیسا لباس، نقلی ڈاڑھی اور وِگ پہنی پھر ماسکو آنے والے یورپی سیاحوں کے ایک گروہ میں شامل ہوگیا۔ اس کی خوش قسمتی کے وہ ان کے ساتھ یونانی دارالحکومت، ایتھنز جا پہنچا۔ یوں وہ اپنے ملک سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔

یوری بزمنوف معمولی شخصیت نہیں تھا، وہ سوویت یونین کے ایسے گنے چنے دانش وروں میں سے ایک تھا جو ''فن براندازی'' (Subversion) میں طاق تھے۔ اس فن کے ماہر کسی بھی ملک کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام کو الٹ پلٹ بلکہ برباد کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ بزمنوف کا فرار ایک تاریخی لمحہ تھا کیونکہ رفتہ رفتہ وہ اپنے فن کے اسرار و رموز دنیا والوں پر افشا کرنے لگا جو حیرت انگیز اور چونکا دینے والے تھے۔

☆☆☆

یوری بزمنوف ۱۹۳۹ء میں سوویت فوج کے اعلیٰ افسر کے ہاں پیدا ہوا۔ سترہ برس کی عمر میں اُسے ماسکو اسٹیٹ یونیورسٹی سے ملحقہ ادارے، انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل لینگویجز میں داخلہ مل گیا۔ یہ ادارہ سوویت یونین کے اعلیٰ ترین سرکاری

یوری بزمنوف

اداروں میں ایک تھا۔ صرف انتہائی ذہین اور قابل نوجوانوں کو اس میں داخلہ ملتا تھا۔

انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل لینگویجز میں بظاہر طلبہ کو مشرقی علوم کی تعلیم دی جاتی، مگر دراصل انھیں براندازی، جاسوسی اور پروپیگنڈے کے عملی و نظریاتی طور طریقے سکھائے جاتے۔ انھیں بتایا جاتا کہ جس ملک کو ٹارگٹ بنانا ہو، اس کی مذہبی و معاشرتی روایات سیکھ کر معاشرے میں کیونکر جذب ہونا ہے۔ مقصد یہ ہوتا کہ ٹارگٹ شدہ ملک میں اپنے وطن کے مفادات کو فروغ دیا جا سکے۔

سوویت یونین ہی نہیں برطانیہ، امریکا، فرانس اور جرمنی میں بھی اورینٹل اسٹڈیز یعنی علوم مشرق پڑھانے والے اعلیٰ ادارے کام کر رہے تھے اور اب بھی فعال ہیں۔ ان تعلیمی اداروں میں ایسے دانش وروں کی فکری و ذہنی پرداخت ہوتی ہے جو غیر ممالک میں جا کر براندازی اور جاسوسی وغیرہ کرتے ہیں۔

ماضی میں ایسی مثالیں موجود ہیں مثلاً برطانوی جاسوس لارنس آف عریبیا جس نے عربوں کی تاریخ، تہذیب و تمدن، ثقافت اور معاشرت کا عمیق مطالعہ کیا تھا۔ اسی لیے وہ عرب معاشرے میں جذب ہونے میں کامیاب رہا۔ اس نے پھر اپنی سازشوں سے عربوں اور ترکوں کو باہم لڑوا دیا۔ یوں نہ صرف مشرق وسطیٰ سے ترک عثمانی حکومت ختم ہوئی بلکہ علاقہ فلسطین پر برطانوی فوج نے قبضہ کر لیا جہاں بعد ازاں اسرائیل کی یہودی ریاست بنائی گئی۔

اسی طرح بھارت کا موجودہ مشیر قومی سلامتی، اجیت دوال بھی ماہر براندازی ہے۔ وہ مختلف بھیس بھر کر چھ سات سال تک پاکستان میں مقیم رہا۔ ظاہر ہے، وہ پاکستان دشمن تنظیموں اور افراد سے رابطے میں رہا ہوگا۔ کلبھوشن یادو بھی ایران میں بہ حیثیت کاروباری قیام پزیر تھا۔ حقیقتاً وہ بھارتی جاسوس تھا۔ اس کے روابط پاکستان دشمن تنظیموں سے تھے جو پاکستانی معاشرے کو انتشار زدہ، کمزور اور پراگندہ کر دینا چاہتی ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل لینگویجز بدنام زمانہ سوویت خفیہ ایجنسی، کے جی بی کے براہ راست کنٹرول میں تھا۔ یوری بزمنوف نے وہاں تاریخ، ادب، موسیقی اور دیگر علوم فنون لطیفہ کا مطالعہ کیا۔ وہ خاص طور پر ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا ماہر بن گیا۔ یہی وجہ ہے، جب ۱۹۶۳ء میں یوری کی تعلیم و تربیت مکمل ہوئی، تو اُسے بھارت بھجوا دیا گیا۔ وہ بھارت میں مصروف عمل سوویت کمپنی، سوویت ریفائنریز کنسٹرکشن میں بطور افسر تعلقات عامہ کام کرنے لگا۔ یہ سوویت کمپنی بھارت میں آئل ریفائنری تعمیر کرتی تھی۔

دو سال بعد اُسے واپس سوویت یونین بلوا لیا گیا۔ یوری پھر سوویت حکومت کی نیوز ایجنسی، آر آئی اے نووستی (RIA Novosti) میں کام کرنے لگا۔ جلد ہی اس پر منکشف ہوا کہ نیوز ایجنسی میں مصروف کار بیشتر صحافی کے جی بی کے ایجنٹ ہیں۔ یہاں یوری بزمنوف بیرون ممالک تقسیم کیا جانے والا پروپیگنڈا مٹیریل تیار کرنے لگا۔

آر آئی اے نووستی ہی میں کے جی بی کے تربیت کاروں نے یوری کو فن براندازی کے اسرار و رموز سکھائے۔ اُسے سکھایا کہ دشمن ملک کا خصوصاً سیاسی و معاشرتی نظام کیوں کر تلپٹ کیا جائے۔ خیال ہے کہ سوویت آمر، جوزف اسٹالن کے دور میں عمل براندازی کا آغاز ہوا جو دنیائے مغرب میں

امریکی و برطانوی اثر و رسوخ ختم کرنا چاہتا تھا۔

۱۹۶۹ء میں یوری بزمنوف کو دوبارہ بھارت بھجوا دیا گیا۔ اس بار یوری کا مشن یہ تھا کہ مشرقی پاکستان میں عمل براندازی شروع کرے تاکہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کو توڑا جا سکے۔ چناں چہ ہندو اساتذہ، کاروباریوں اور دیگر ایجنٹوں کے ذریعے مشرقی پاکستان کے عوام میں لسانی و نسلی اختلافات ابھارے گئے۔ اس بات کا پروپیگنڈا کیا گیا کہ مغربی پاکستان کی حکومت اور فوج مشرقی پاکستان کا استحصال کرتی ہے۔ غرض دونوں خطوں کے مابین اختلافات پیدا کیے گئے تاکہ متحدہ پاکستان ٹوٹ سکے۔

۱۹۸۴ء میں امریکی مصنف، جی ایڈورڈ گرفن نے یوری بزمنوف کا طویل انٹرویو لیا۔ اس میں یوری نے تفصیل سے بتایا کہ بھارت میں سوویت یونین کے قونصلیٹ مشرقی پاکستان میں پروپیگنڈا میٹریل، اسلحہ اور رقم اسمگل کر کے علیحدگی پسندوں کو بھجواتے رہے۔ یوں سوویت یونین نے سقوط ڈھاکا کا انجام دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ سانحہ براندازی کی وجہ سے بھی وقوع پزیر ہوا جس کے ذریعے مشرقی پاکستانیوں کی برین واشنگ کر کے انھیں مغربی پاکستان کا مخالف بنا دیا گیا۔

یوری بزمنوف نے انٹرویو میں یہ بھی بتایا کہ مشرقی پاکستان میں خفیہ کارروائیوں کے باعث وہ اپنے حکمران طبقے سے بددل ہو گیا۔ چناچہ وہ سوویت یونین سے فرار ہو کر پہلے یونان پہنچا اور پھر کینیڈا میں اُسے سیاسی پناہ مل گئی۔ اس نے پھر امریکا اور کینیڈا کے دانش ور حلقوں میں کئی لیکچر دیے اور عوام و خواص کو فن براندازی کے اسرار و رموز سے آگاہ کیا۔

۱۹۹۳ء میں یوری بزمنوف پُراسرار طور پر لاپتا ہو گیا۔ خیال ہے کہ روس یا امریکا کی کسی خفیہ ایجنسی نے اُسے قتل کر دیا۔ اس کی وجہ یقیناً یہی ہے کہ دور جدید میں ہر عالمی طاقت فن براندازی کو اپنا چکی۔ وہ اس فن کے ماہرین کی مدد سے بنا لڑے غیر ممالک کو اپنا مطیع بنا لیتی ہے۔

مثال کے طور پر امریکا ہی کو لیجیے۔ امریکی حکمران طبقہ اپنی تہذیب و ثقافت کو دنیا کے کئی ممالک میں پھیلانے میں کامیاب ہو چکا۔ پاکستان میں اس کے پھیلاؤ سے آدھا تیتر آدھا بٹیر نما نئی نسل جنم لے چکی جسے سمجھ نہیں آ رہی کہ امریکی (یا مغربی) روایات و اقدار پر عمل کرے یا اسلامی (یا مشرقی) رسوم و رواج کو اپنائے۔

ایڈورڈ گرفن کو انٹرویو دیتے ہوئے۔ یوری بزمنوف نے یہ طریق کار بھی بتایا جس کے ذریعے ایک ملک فن براندازی کو بروئے کار لاتے ہوئے دوسرے ممالک کو بنا جنگ کے اپنا مطیع بنا سکتا ہے۔ اس انٹرویو کے انکشاف انگیز حصے قارئین اردو ڈائجسٹ کے لیے پیش خدمت ہیں۔

☆☆☆

سوال: نظریاتی براندازی (ideological subversion) سے کیا مراد ہے؟

جواب: یہ ایک قانونی مگر ڈھکے چھپے انداز میں انجام دیا جانے والا عمل ہے۔ تاہم دیدہ و بینا لوگ اس عمل کو جنم لیتا دیکھ سکتے ہیں۔ یہ عمل ایک ملک کی خفیہ ایجنسیاں دیگر ممالک میں انجام دیتی ہیں۔ میرے خیال میں نظریاتی براندازی کو عملی جامہ پہنانا ہی ان کی سب سے بڑی ذمے داری ہے۔ مثال کے طور پر کے جی بی اپنی رقم، افرادی قوت اور وقت کا صرف ۱۵ فیصد جاسوسی کی سرگرمیوں پر لگاتی تھی۔ بقیہ ۸۵ فیصد حصہ براندازی کرنے پر لگتا تھا۔

نظریاتی براندازی دراصل نفسیاتی جنگ کی ایک قسم ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ایک پوری قوم کو نظریاتی طور پر اتنا گمراہ کر دیا جائے کہ وہ سچ اور جھوٹ..... صحیح اور غلط میں تمیز کرنے کی قوت و صلاحیت کھو بیٹھے۔ جب یہ کامیابی حاصل ہو جائے تو پورا معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گا۔ پھر ایک فرد سے لے کر پوری انتظامیہ تک اس قابل نہیں رہے گی کہ اپنے خاندان، محلے، کمیونٹی اور مملکت کی بخوبی حفاظت کر سکے۔

(بقیہ صفحہ نمبر ۲۳۳ پر)

RIPHAH INTERNATIONAL UNIVERSITY, LAHORE

ADMISSIONS SPRING 2018

Undergraduate & Graduate Courses

(Morning, Evening & Weekend Programmes)

RIPHAH COLLEGE OF REHABILITATION SCIENCES
- Doctor of Physical Therapy (DPT, 5 Year)

Clinical Collaboration
- Ittefaq Hospital, Lahore
- The Rising Sun, Lahore

- MS Speech Language Pathology (2 Year)
- MS Orthopedic Manual Physical Therapy (2 Year)
- MS Neuro Muscular Physical Therapy (2 Year)

RIPHAH INSTITUTE OF CLINICAL & PROFESSIONAL PSYCHOLOGY
- BS Applied Psychology (4 Year)
- MS Clinical Psychology (2 Year)
- MS Top-Up in Clinical Psychology (1 Year)
- Advanced Diploma in Clinical Psychology (1 Year)
- MS Industrial and Organizational Psychology (2 Year)
- M.Phil Applied Psychology (2 Year)

RIPHAH INSTITUTE OF LANGUAGE & LITERATURE
- BS English (Literature & Linguistics) (4 Year)
- MA English (Literature & Linguistics) (2 Year)
- M.Phil English (Literature & Linguistics) (2 Year)

RIPHAH INSTITUTE OF PHARMACEUTICAL SCIENCES
- M.Phil Pharmaceutics (2 Year)
- M.Phil Pharmacology (2 Year)

RIPHAH INSTITUTE OF COMPUTING AND APPLIED SCIENCES
- BS Computer Science (4 Year)
- BS Software Engineering (4 Year)
- BS Physics (4 Year)
- BS Mathematics (4 Year)
- MSc Physics (2 Year)
- MSc Mathematics (2 Year)
- M.Phil Physics (2 Year)
- M.Phil Mathematics (2 Year)
- MS Computer Science (2 Year)

RIPHAH SCHOOL OF BUSINESS AND MANAGEMENT
- BBA (4 Year)
- MBA (1.5, 2.5 Year)
- MBA Executive (2 Year)
- MS Management Sciences (1.5, 2.5 Year)
- MS Engineering Management (1.5 Year)
- MS Project Management (1.5 Year)

Salient Features
- Weekend/Evening classes for graduate and postgraduate programs
- Excellent employability of graduates
- WiFi enabled Campuses
- Hostels facility available
- Pick & drop facility (On all Major Roots of Lahore)

Separate Male & Female Campuses
(Undergraduate Programmes Only)

HOW TO APPLY
- Apply Online @ admissions.riphah.edu.pk
- Submit application processing fee of Rs. 1,000 in cash at any of our Admission Offices or courier the bank draft (of any bank) of Rs. 1060/- in the name of Islamic International Medical College Trust (IIMCT)

Official Partner of
100% fully funded seats available through Shahbaz Sharif Merit Scholarship for Masters, M.Phil & MS Programmes

UAN: 042-111-RIPHAH (747-424)
www.lahore.riphah.edu.pk
admissions.lahore@riphah.edu.pk
/riphah.lhr

Township Campus: 13-14-C, Civic Center, Near Hamdard Chowk, Township, Lahore.
Raiwind Road Campus: 13 Km, Raiwind Road, Lahore.
Quaid-e-Azam Campus: 28-M, Quaid-e-Azam Industrial Estate, Kot Lakhpat, Lahore.

حجاج نے سندھ کی لڑائی کے لیے پوری تیاری کی۔ اس زمانے میں جب کہ وہ سندھ کے لیے فوجی تیاریاں کر رہا تھا، اس نے ایک جمعہ عوام کے سامنے خطبہ دیا۔ ہم اس خطبے کو یہاں نقل کرتے ہیں، تاکہ اندازہ ہو سکے، جنگ کے متعلق اس کے جذبات واحساسات کیا تھے؟ اس نے عوام کے سامنے خطبہ دیتے ہوئے کہا:

''میں تم لوگوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ وقت بدلنے والا ہے اور وہ دودھاری تلوار کی طرح ہے کہ کبھی ہمارے موافق ہے اور کبھی ہمارے خلاف۔ جب وہ ہمارے موافق ہو تو ہمیں اپنی فوجوں کو تربیت دینی چاہیے اور جب وہ ہمارے خلاف ہو تو ہمیں مصائب کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے اور ان کو مٹانا چاہیے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ کا ہر حال میں شکر ادا کرنا چاہیے اور اس کی فیاضانہ عنایتوں پر بھروسا کرنا چاہیے تاکہ وہ ہم پر مزید نوازشات فرمائے اور ہم پر اپنی نعمتوں کا دروازے بند نہ کرے اور ہم پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے۔

بدیل بن طہفہ بجلی سپہ سالار کی شہادت کا مجھے بے حد غم ہے، ہر لحہ اس کا انتقام لینے کی آوازیں میرے دل کے کانوں میں آتی رہتی ہیں اور میں ان کو فوراً جواب دیتا رہتا ہوں کہ اللہ کی قسم، عراق کی جو دولت میرے قبضے میں ہے، میں اس مہم پر خرچ کرنے کے لیے پورے طور پر تیار ہوں۔ میرے غضب کی آگ کا شعلہ کبھی نہیں بجھے گا تاوقتیکہ میں اس کا بدلہ نہ لے لوں اور یہ دھبہ اپنے نام سے نہ دھو دوں''۔

سندھ کے لیے فوج

حجاج نے چھ ہزار بہادر شامی لشکر اور بکثرت جواں مرد دوسرے لشکروں سے انتخاب کیے، چھ ہزار تیز رفتار سانڈنیاں ان بہادروں کی سواری کے لیے دیں، اس کے علاوہ بوجھ لادنے والے کئی ہزار اونٹ ساتھ کیے۔ اس اہتمام سے لشکر کا سروسامان کیا کہ اہل لشکر کو جن جن چیزوں کی ضرورت ہو سکتی تھی، مہیا کر دیں، یہاں تک کہ سوئی دھاگا تک بھی ان کے ساتھ روانہ کیا۔ فوج کے آرام اور خوراک کا اس حد تک انتظام کیا کہ عرب سرکے کو بہت شوق سے کھاتے تھے۔ اس نے روئی سرکے میں بھگو کر سائے میں خشک کی، پھر روئی کے گٹھے بندھوا کر جہازوں میں روانہ کیے تاکہ جب لشکر کو سرکے کی ضرورت ہو، روئی تر کر کے اس کو چھان لیا جائے اور لشکریوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ عام سامان رسد کے ساتھ تیس ہزار دینار بھی ساتھ دیے تاکہ فوج کو اخراجات کی تکلیف نہ ہو۔ اس کے علاوہ فوجی ضرورتوں کا تمام سامان جہازوں پر لاد کر سمندری راستے سے دیبل بھیجا، جس میں کئی منجنیقیں تھیں، جن سے دشمنوں کے قلعے پر پتھر پھینکے جاتے تھے۔

جہم بن زحر کے ساتھ یہ لشکر شیراز پہنچا۔ پھر محمد بن قاسم کی سرکردگی میں یہ لشکر شیراز سے روانہ ہو کر خشکی کے راستے سے مکران پہنچا۔ جہم بن زحر جعفی بھی ساتھ تھے۔ وہاں گورنر محمد بن ہارون نے ان کا استقبال کیا۔ مکران میں محمد بن قاسم نے ایک مہینے تک قیام کیا۔ وہاں سے محمد بن قاسم ارمن بیلہ کی طرف روانہ ہوئے۔ محمد بن ہارون اس وقت بیمار تھا۔ باوجود بیماری کے اس نے مہم میں شرکت پر اصرار کیا۔ محمد بن قاسم نے ساتھ لے لیا۔ مکران کی سرحد سے نکل کر سب سے پہلے محمد بن قاسم نے قنزپور (پنجگور) پر حملہ کیا اور کئی ماہ کے بعد اس شہر کو فتح کر لیا۔ یہ پہلا مقام ہے جس کو محمد بن قاسم نے اس علاقے میں فتح کیا۔

قنزپور کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نے ارمن بیلہ کا محاصرہ کیا اور اسے فتح کر کے وہ وہاں کئی ماہ تک مقیم رہے، تاکہ فوجیں کچھ دن آرام کر لیں۔ تاریخ بلاذری میں ہے کہ محمد بن ہارون نے ارمابیل (ارمن بیلہ) کے قریب وفات پائی اور وہ قنبل میں مدفون ہوئے۔ اس وقت شہر بیلہ کے ایک جانب پیر آری کا مقبرہ ہے۔ مقامی روایتوں کے مطابق یہ کسی صحابی کی قبر ہے۔ ممکن ہے کہ محمد ہارون کا نام ابن ہارون سے ہارون اور مرور زمانہ سے یہ نام بعد میں مقامی تلفظ یا غلطی کی وجہ سے

آری ہو گیا۔

حجاج بن یوسف کا ایک خط

اسی زمانے میں جب کہ محمد بن قاسم ارمن بیلہ میں مقیم تھے۔ انھیں حجاج بن یوسف کا ایک خط ملا، جس میں اس نے انھیں جنگ کے متعلق ضروری ہدایتیں دیتے ہوئے لکھا تھا:

''جب تم ان منزلوں پر پہنچو جو سندھ کی حدود کے اندر ہیں اور تمھیں دیبل نظر آنے لگے تو تم اپنی قیام گاہوں کے متعلق بہت احتیاط برتو۔ جہاں کہیں اترو، اپنی قیام گاہ کے گرد خندق کھودو تاکہ وہ تمہاری حفاظت اور سلامتی کا کام دے۔ رات کا زیادہ حصہ جاگتے رہو۔ جو لوگ قرآن پڑھ سکتے ہیں، وہ تلاوت میں مصروف رہیں اور باقی لوگ اپنا وقت دعا میں اور لشکر کی حفاظت میں چوکنے ہو کر گزاریں۔ اللہ کا ذکر ہر وقت زبان پر جاری رکھو۔ اللہ کی نصرت اور مدد ہر وقت طلب کرتے رہو، تاکہ اللہ تعالیٰ تمھیں فتح عطا فرمائے اور زیادہ تر لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ پڑھ کر اللہ سے مدد چاہو۔ جب تم دیبل کے گردونواح میں پہنچو تو ایک خندق بارہ گز اور چھ گز گہری کھودو۔ جب تم دشمن سے مقابل ہو تو خاموش رہو۔ خواہ تم کو دشمن گالیاں دے اور غوغا کرے اور اس وقت تک مستقل جنگ نہ شروع کرو، جب تک کہ میں تمھیں نہ لکھوں اور وہ ہدایات جو میں تمھیں دوں ان پر حرف بحرف عمل کرو۔ اگر تم نے ان پر عمل کیا تو ان شاء اللہ تمہاری کامیابی یقینی ہے''۔

دیبل کی روانگی

ارمن بیلہ سے محمد بن قاسم دیبل کی طرف روانہ ہوئے۔ دیبل مغربی سندھ کا مشہور شہر اور قدیم بندرگاہ تھی۔ ایران، عراق اور افریقا کے جہاز وہاں آکر ٹھہرتے تھے۔ اب اس شہر کا کہیں نام ونشان نہیں اور نہ اس کا محل وقوع ابھی تک صحیح طور پر متعین ہو سکا۔ اس شہر کی قدامت کے متعلق چچ نامہ سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ دیبل چھٹی صدی عیسوی رائے خاندان کے عہد حکومت میں موجود تھا۔

دیبل کے متعلق پہلا تاریخی حوالہ ہمیں بلاذری کی فتوح البلدان میں ملتا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے ۱۵/۶۳۶ میں عثمان بن ابی العاص ثقفی کو بحرین وعمان کا گورنر مقرر کیا تو انھوں نے اپنے بھائی مغیرہ کو خلیج دیبل کی طرف روانہ کیا، انھوں نے ہندوستان کی تین بندرگاہوں...... دیبل، بروچ اور تھانے پر حملہ کیا۔ پھر ہمیں دیبل کا تذکرہ محمد بن قاسم کی ۷۱۲ میں اس کی فتح اور پھر سندھ میں عربوں کے دور حکومت میں مسلسل حوالے ملتے ہیں۔ مشہور سیاح اور ابن حوقل (۹۶۸ء) اور آخر میں مقدسی (۹۸۶ء) خود دیبل آئے تھے۔ انھوں نے اس شہر کا تذکرہ اپنی اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ بعدازاں مہلل کے سفرنامے (۹۴۳ء) اور البیرونی کی ''کتاب الہند'' اور اس عہد کے دوسرے سفرناموں میں دیبل کا تذکرہ ملتا ہے۔

اِن تمام شواہد سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تیرہویں صدی کے نصف تک دیبل اچھی یا خراب حالت میں موجود تھا۔ گمان غالب یہ ہے کہ دسویں صدی عیسوی میں جب عرب حکومت کمزور پڑی تو دیبل کی اہمیت کم ہونے لگی۔ دوسری طرف دریائے سندھ کی ایک شاخ پر نئی بندرگاہ بن گئی جسے ''لوہارانی'' بندر کہا جاتا تھا۔ غالباً لوہارانی کی سہولت نے دیبل کی اہمیت کو آہستہ آہستہ ختم کر دیا۔ اس کے بعد دو سال کے اندر دیبل بالکل ختم ہو گیا۔ بہرحال بندرگاہ دیبل تقریباً چھ سو برس تک سندھ کی ایک اہم بندرگاہ رہی۔ اس عرصے میں سندھ کے لوگ نئی بندرگاہ کو بھی دیبل ہی کا نام دیتے تھے۔ محکمہ آثارِ قدیمہ کی تحقیق کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ بھنبھور کے کھنڈرات کا دیبل ہونا زیادہ قرین قیاس ہے۔

متواتر کوچ کرتے ہوئے جمعہ کے دن کو ۹۲/۷۱۰ء میں محمد بن قاسم دیبل پہنچے۔ سرزمین سندھ پر سب سے پہلے وہیں نماز جمعہ ادا کی گئی۔ جمعہ کا خطبہ محمد بن قاسم نے دیا۔ اتفاق

گیارہویں پسلی کے نیچے پیٹ کی طرف کمر میں دائیں اور بائیں جانب ہوتے ہیں۔ جوانی اور تندرستی کی حالت میں گردہ تقریباً گیارہ سے بارہ سینٹی میٹر لمبا، پانچ سے سات سینٹی میٹر چوڑا اور ڈھائی سینٹی میٹر موٹا ہوتا ہے۔ ہر گردے میں بیس لاکھ سے زیادہ نالی دار غدود، نیفران یا فلٹر ہوتے ہیں۔ یہ انسانی جسم کے لیے وہی کام کرتے ہیں جو ایک ماہر حساب دان ایک کمپنی کے لیے کرتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق گردوں میں چوبیس گھنٹوں کے دوران ۱۵۰۰ لیٹر خون گزرتا ہے۔ ان کا کام جسم سے فاسد، نقصان دہ اور ضرورت سے زائد مادوں کو خارج کرنا ہے۔ یہ جسم میں پانی اور نمکیات کا توازن برقرار رکھتے ہیں، مثلاً جسم میں کیلشیم، پوٹاشیم اور فاسفورس کی مقدار کے علاوہ پانی اور دیگر نمکیات وغیرہ کا ایک حد تک جسم میں رہنا ضروری ہے۔ اس کی کمی و بیشی سے بہت امراض جنم لیتے ہیں۔ انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ جسم کے لیے ایسے بہت سے مفید ہارمون پیدا کرتے ہیں۔ اگر یہ ہارمون جسم میں کم ہو جائیں تو خون کی کمی کی بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ بات بہت قابل توجہ ہے کہ جب تک گردے اسی یا نوے فیصد تک تباہ نہ ہو چکے ہوں، اس سے پہلے مریض کو علم ہی نہیں ہوتا۔ ایک گردہ ناکارہ بھی ہو جائے تو بھی دوسرا کام کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ ایک دفعہ گردہ ناکارہ ہو جانے کی صورت میں اس کو پہلے جیسی صحیح حالت میں نہیں لایا جا سکتا۔ گردوں میں پتھری ہو تو اس کا علاج شعاعوں سے یا آپریشن سے ممکن ہے، لیکن مکمل طور پر گردوں کے فیل ہونے کی صورت میں پیوندکاری ہی اس کا واحد اور حتمی علاج ہے۔

پیوندکاری کی ضرورت، اہمیت اور پیچیدگیاں

اعضا کی پیوندکاری ایسا جراحتی عمل ہے جس میں خراب اعضا (گردے، جگر، آنکھ وغیرہ) نکال کر کسی دوسرے فرد (زندہ یا مردہ) کے اعضا لگا دیے جاتے ہیں۔ اب سوال یہ

تاریخ ساز آپریشن انجام دینے والی ڈاکٹروں کی قابل فخر ٹیم

پیدا ہوتا ہے کہ اعضا کون عطیہ کر سکتا ہے؟ موجودہ قانون کے مطابق خونی رشتوں سمیت کوئی بھی ایسا شخص جس کا خون اور ٹشوز عطیے کے ضرورت مند سے مطابقت رکھتے ہوں۔ ایسا شخص جس کا حال ہی میں انتقال ہوا ہو اور اس کے عطیہ کیے گئے اعضا کسی بیماری سے متاثر نہ ہوں تو انھیں کسی دوسرے فرد کے جسم میں لگایا جا سکتا ہے۔

پیوندکاری کے آپریشن سے قبل عطیہ کنندہ اور عطیہ وصول

بات کو یقینی بنایا جاتا ہے کہ جراحی کے بعد مریض کا جسم نئے گردے کو مسترد نہیں کرے گا۔

کیڈویرک (cadaveric) ٹرانسپلانٹ کیا ہے؟

کیڈویرک ٹرانسپلانٹ میں اعضا کی منتقلی اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب ڈونر یعنی جس سے اعضا لیے جا رہے ہیں، وہ برین ہیمبرج یا کسی حادثے کی وجہ سے آئی سی یو میں ہو اور اس کی برین ڈیتھ ہو چکی ہو۔ ایسی صورت حال میں اس کے

ڈاکٹرز کی آپریشن کو عملی شکل دینے والے عملے کے ساتھ

کرنے والے افراد کے خون اور ٹشوز کا ٹیسٹ کیا جاتا ہے، کیونکہ ٹرانسپلانٹیشن کے لیے دونوں افراد (عطیہ وصول کنندہ اور عطیہ کنندہ) کے خون اور ٹشوز کا میچ ہونا ضروری ہے۔ اگر عطیہ کنندہ زندہ ہے تو اسے جراحی سے قبل اینستھیسیا (بے ہوش کرنے والی دوا) دی جاتی ہے۔ ہر اعضا کی پیوندکاری کا دورانیہ مختلف ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر گردے کی پیوندکاری کا آپریشن تقریباً تین گھنٹے میں مکمل ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ ٹرانسپلانٹ سے قبل ''ٹشوز ٹائپنگ'' اور ''بلڈ ٹیسٹ'' سے اس

لواحقین کی اجازت یا خود مریض نے اگر اپنے اعضا عطیہ کرنے کی وصیت کر رکھی ہو، تو پھر اسے وینٹی لیٹر پر رکھ دیا جاتا ہے تاکہ اس کے اندرونی اعضا مصنوعی طور پر زندہ رہیں اور ٹرانسپلانٹ کے ذریعے کسی اور کی زندگی بچائی جا سکے۔

زندہ ٹرانسپلانٹ میں آپ صرف اپنے قریبی عزیز یا رشتے دار ہی کو عطیہ کر سکتے ہیں۔

اس کے برعکس کیڈویرک ٹرانسپلانٹ میں چوں کہ مریض کی طبی موت واقع ہو چکی ہوتی ہے، لہٰذا بروقت فیصلہ کر

کے اُس کے لواحقین کئی مستحقین کی زندگیاں بچانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اگر اس طریقے سے ٹرانسپلانٹ کے بارے میں آگاہی سبھی کو ہو جائے تو بہت سے بے بس مریضوں کو تکلیف اور اذیت کے پل صراط سے گزرنا نہیں پڑے گا۔

ہر انسان اپنی زندگی میں ہی یہ فیصلہ لے سکتا ہے کہ کسی حادثے کا شکار ہو جانے کی صورت میں جب اس کے بچنے کی کوئی اُمید نہ ہو تو اس کے اعضا عطیہ کر دیے جائیں۔ اس اقدام سے وہ معاشرے کے کئی دوسرے مایوس لوگوں کو نئی زندگی دینے کا سبب بن سکتا ہے کیونکہ اس طرح کے ٹرانسپلانٹ میں قریبی عزیز یا رشتہ دار ہی کی شرط لاگو نہیں ہوتی۔ کیڈیویرک ڈونیشن کسی بھی مستحق کو دیا جا سکتا ہے بشرطیکہ خون اور ٹشوز میچ کر جائیں اور پنجاب ہیومن آرگن ٹرانسپلانٹ اتھارٹی سے قانونی اجازت نامہ حاصل کر لیا جائے۔

پیوند کاری کے مراحل

جب یہ فیصلہ ہو جاتا ہے کہ کس مستحق کا ٹرانسپلانٹ کیا جائے گا تب اس کے اور ڈونر کے کچھ ٹیسٹ کیے جاتے ہیں۔ اس سارے عمل میں تقریباً دس سے بارہ گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ اس دوران ڈونر کو آئی سی یو میں وینٹی لیٹر پر رکھا

شریف انسٹیٹیوٹ آف یورولوجی اینڈ ٹرانسپلانٹ ڈیپارٹمنٹ پوسٹ گریجوایشن کے لیے مشہور ہے اور یہ واحد ادارہ ہے جو پرائیویٹ سیکٹر میں ایک انسٹیٹیوٹ کے طور پر کام کر رہا ہے۔ اس میں یورولوجی سے متعلق ہر سہولت موجود ہے۔ کسی بھی طرح کا آپریشن ہو، ہر قسم کے آلات موجود ہیں۔ یہاں ٹرانسپلانٹ ویسے تو ۲۰۰۰ء میں شروع ہوا تھا لیکن ۲۰۰۷ء میں میڈیکل کالج بننے کے بعد سے اب تک ٹرانسپلانٹ کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے جن میں سے اکثریت مفت علاج کروانے والے مریضوں کی ہے۔

یہاں مستحق مریضوں کا ٹرانسپلانٹ بالکل مفت کیا جاتا ہے۔ تمام اخراجات اسپتال کی ذمہ داری ہیں۔ اس کے علاوہ قابلِ قدر بات یہ ہے کہ یہاں فیس اور مفت علاج کرنے والے مریضوں میں کسی قسم کا کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا۔ یہاں تک کہ نرس اور نچلے اسٹاف سمیت بیشتر لوگوں کو اس بات کی خبر نہیں ہونے دی جاتی کہ کون سا مریض مفت اور کون اخراجات ادا کر کے علاج کروا رہا ہے۔ سب کے ساتھ یکساں سلوک اور محبت یہاں کی خاصیت ہے۔

جاتا ہے اور ڈاکٹروں کا ایک پینل اُسے اپنی مسلسل نگرانی میں رکھتا ہے۔

فوٹا (PHOTA) کے قوانین اور سسٹم کو آرڈینیشن

پنجاب ہیومن آرگن ٹرانسپلانٹ اتھارٹی یعنی فوٹا (phota) کے قوانین کے مطابق ڈونر کے اعضا پر پہلا حق قریبی رشتے دار کا ہوتا ہے۔ بین الاقوامی اصول مدنظر رکھتے ہوئے کمپیوٹرائزڈ نظام کے تحت اُن کے اعضا حقدار تک پہنچائے جاتے ہیں۔ یہ سب ایک سسٹم کو آرڈینیشن کے ذریعے ہوتا ہے۔ اسپتال میں اگر کوئی برین ڈیتھ ہو تو اس تمام عمل کو آگے بڑھانے کے لیے ایک کوآرڈینیٹر موجود ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اسے بتاتا ہے کہ ایک مریض برین ڈیڈ ہو گیا ہے۔ کوآرڈینیٹر اس کے خاندان سے رابطہ کر کے پوچھتا ہے کہ وہ مریض کے اعضا ڈونیٹ کرنے کے خواہش مند ہیں یا نہیں۔

اگر وہ انکار کر دیں تو وینٹی لیٹر آف کر کے میت لواحقین کے سپرد کر دی جاتی ہے۔

سب سے قابلِ ذکر اور اہم قانون یہ ہے کہ سرجری کرنے والا ڈاکٹر یا سرجن براہِ راست کوآرڈینیٹر سے رابطہ کرنے کا مجاز نہیں ہوتا۔ ٹرانسپلانٹ سرجن کبھی اُس ٹیم کا حصہ نہیں ہوتا جو آرگن ڈیلیور کرنے کے انتظامات دیکھتی ہے۔ اس سارے عمل کو شفاف رکھنے کے لیے ٹرانسپلانٹ سرجن کو ان تمام معاملات سے بے خبر رکھا جاتا ہے اور اسے کسی قسم کی مداخلت کی اجازت نہیں ہوتی۔

گردوں کی بیماری، علامات، وجوہ

ایک جائزے کے مطابق پاکستان کا ہر ساتواں شہری گردوں کی تکلیف میں مبتلا ہے۔ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کے مطابق پاکستان میں ہر سال سولہ ہزار نئے مریض گردوں کی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں جو کہ سالانہ سترہ فیصد کا اضافہ ہے اور ان بیماریوں میں پاکستان دنیا بھر میں آٹھویں نمبر پر ہے۔ اسی طرح تیس فیصد ذیابیطس کے مریض گردوں کی بیماری میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ جن افراد کا کولیسٹرول اور بلڈ پریشر ہائی رہتا ہو، موٹاپا یا تمباکو نوشی کی عادت ہو اُن کو گردوں کا ٹیسٹ کرواتے رہنا چاہیے۔ ایسے افراد میں بہ نسبت دوسرے لوگوں کے گردوں کی تکلیف میں مبتلا ہونے کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے۔

گردے کی تکلیف کی علامات زیادہ تر کچھ خاص واضح نہیں ہوتیں۔ اس وجہ سے مریض شروع میں زیادہ دھیان ہی نہیں دیتے اور عام مسئلہ سمجھتے رہتے ہیں۔ ان میں پاؤں کا سوج جانا، جسم میں خارش ہونا، پیشاب کا کم آنا یا خون کی آمیزش ہونا، بھوک کا کم لگنا ہو سکتے ہیں۔ سال میں ایک بار مکمل چیک اپ کے ساتھ ساتھ گردوں کا چیک اپ بھی لازمی کروانا چاہیے تاکہ مرض کو اس کی شروعات میں ہی قابو کیا جا سکے۔ زیادہ تر مریض اپنی بیماری سے تب آگاہ ہوتے ہیں جب کافی وقت گزر چکا ہوتا ہے اور پھر ڈائلسس کا نارکنے والا تکلیف دہ سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

ڈائلسس یا ٹرانسپلانٹ

گردوں کی بیماری میں مریض کے پاس علاج کے سوا کوئی راستہ نہیں ہوتا اور یہ علاج تین صورتوں میں دستیاب ہوتا ہے:

☆ ہیموڈائلسس
☆ پیری ٹونیل ڈائلسس
☆ ٹرانسپلانٹ

گردوں میں زیادہ خرابی کی صورت میں مریض کو تمام زندگی ڈائلسس کروانا پڑتا ہے۔ ہیموڈائلسس میں ایک مشین کے ذریعے خون صاف کیا جاتا ہے اور نقصان دہ اجزاء، اضافی نمک اور پانی خون سے علیحدہ کیا جاتا ہے۔ ہیمو ڈائلسس ہفتے میں تین دفعہ کیا جاتا ہے اور ہر بار تین سے چار گھنٹے صرف ہوتے ہیں۔ پیری ٹونیل ڈائلسس میں مریض کے پیٹ میں نالی لگا کر اس کا علاج گھر پر ہی کیا جاتا ہے، مگر اس طریقۂ علاج میں انفیکشن ہونے کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ گردوں کی بیماری سے نجات پانے کا بہترین طریقہ کیڈیویرک ٹرانسپلانٹ ہے۔

پنجاب میں اپنی نوعیت کا پہلا کیس

یوں تو پنجاب میں گزشتہ تیس سال سے بچوں اور بڑوں کے ٹرانسپلانٹ کامیابی سے ہوتے رہے ہیں لیکن پنجاب کی تاریخ میں کیڈیورک ٹرانسپلانٹ کی شروعات کا سہرا ڈائریکٹر آف شریف میڈیکل سٹی ڈاکٹر محمد رفیق ذکی اور ان کی ٹیم ہی کو جاتا ہے۔ اس سے پہلے صرف سندھ میں ڈاکٹر ادیب رضوی نے یہ کارنامہ انجام دیا تھا۔

یہ صوبہ پنجاب میں اپنی نوعیت کا ایسا پہلا کیس ہے جس میں ایک ڈونر کی وجہ سے چار زندگیاں آج صحتیاب اور شفایاب ہو کر کامیاب اور نئی زندگی کی جانب گامزن ہو پائیں۔

ڈاکٹر محمد رفیق ذکی کو اطلاع ملی کہ فیصل آباد میں ایک خاتون اسپتال میں داخل ہیں، جن کا دماغ مفلوج ہو چکا۔ ۵۳ سالہ زاہدہ خانم بیوہ خاتون تھیں اور کئی سال سے ہیلتھ ورکر کے طور پر ملازمت کر کے اپنا اور پانچ بچوں کا پیٹ پال رہی تھیں۔ ان کا ایک بیٹا گردوں کی تکلیف میں مبتلا تھا اور ڈائلسس کا محتاج بن کر رہ گیا تھا۔ خاتون کو برین ہیمرج ہوا اور تین دن لگاتار دماغ میں خون نہ رکنے کے سبب دماغی طور پر موت واقع ہو چکی تھی۔

اس مردہ خاتون کے رشتے دار جسم کے جتنے بھی کارآمد عضو تھے، انھیں عطیہ کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ ڈاکٹر ذکی اور ان کی ٹیم نے انھیں مفت لاجیسٹک، سرجری وغیرہ کی پیشکش کی جو قبول کر لی گئی۔ ۲۹ نومبر ۲۰۱۷ء کو ایمرجنسی بنیادوں پر اس خاندان کو شریف انسٹیٹیوٹ آف یورولوجی اینڈ ٹرانسپلانٹ ڈیپارٹمنٹ لاہور منتقل کر دیا گیا۔

اگلے مرحلے میں نیورو سرجن، نیورو فزیشن پر مشتمل ڈاکٹرز کی ٹیم نے تشخیص کرنا تھا کہ آیا واقعی مریض ''برین ڈیڈ'' ہے یا نہیں۔ جب ایک دفعہ ڈکلیئر ہو جائے پھر تصدیق کی جاتی ہے اور چھ گھنٹے بعد دوبارہ مریض کو چیک کیا جاتا ہے۔ دو دفعہ تصدیق کرنے کے بعد فوٹا کے قوانین کے مطابق ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری کیا جاتا ہے۔

میں عائشہ خانم ہوں۔ میں سات سال کی تھی جب میرے گھر والوں کو پتا چلا کہ میرے گردے میں مسئلہ ہے۔ دو تین سال ادویہ استعمال کرنے سے یوں لگا جیسے اب مجھے کوئی تکلیف نہیں لہٰذا میری ادویہ بند کروا دی گئیں۔ جب میں نویں جماعت میں پہنچی تو میرے سالانہ امتحانات ہونے والے تھے۔ تب مجھے سانس کی تکلیف بڑی شدت سے شروع ہو گئی اور سانس بند ہو جاتا تھا۔ طبی معائنہ کروانے پر پتا چلا کہ میرا ایک گردہ فیل ہو چکا اور آہستہ آہستہ دوسرا بھی خراب ہو رہا تھا۔ ایک سال تک ہیمو ڈائلسس ہوا۔ اس کے اگلے تین سال پیری ٹونیل ڈائلسس ہوتا رہا۔ پیری ٹونیل کا یہ تکلیف دہ عمل دن میں تین سے چار بار دہرایا جاتا جو کہ میری برداشت سے باہر اور مہنگا بھی تھا۔

اسی دوران میری پھپھو زاہدہ خانم کی برین ڈیتھ ہو گئی۔ تب شریف سٹی سے ہمارا رابطہ ہوا اور انھوں نے ہمیں یہاں بلوا لیا۔ میری پھپھو نے جاتے جاتے مجھے نئی زندگی دے دی۔ ڈاکٹر ذکی، ان کی ٹیم اور اسپتال کے تمام عملے نے بہت محبت اور اپنائیت سے علاج کیا اور اب میں واپس جا کر اپنی ادھوری پڑھائی مکمل کروں گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں اپنی پھپھو کے لیے افسردہ ہوں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ آج میں انھی کی وجہ سے زندہ ہوں۔

میرا نام زین ہے۔ عمر پچیس سال ہے۔ میں کئی برس سے ڈائلسس کی تکلیف سہہ رہا تھا۔ زاہدہ خانم میری ماں تھیں۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ میں اپنی ماں کے جانے کا غم مناؤں یا اپنی زندگی بچ جانے پر شکر ادا کروں۔ ماں جنم دیتی ہے۔ پال پوس کر ہمیں جینے کے قابل بناتی ہے۔ کتنی قربانیاں دیتی ہے۔ اولاد ساری عمر بھی خدمت کرے تو ماں کے احسانات کا ایک لمحہ بھی نہیں چکا سکتی۔ میری ماں نے مجھے دو بار زندگی دی۔ ایک بار جب میں پیدا ہوا اور ایک بار جب وہ مر کے پھر سے مجھے زندگی دے گئی۔ مجھے ابھی نہیں پتا کہ میں اسپتال سے فارغ ہونے کے بعد کیا کروں گا۔ ابھی میں نے کچھ نہیں سوچا۔ مسیں ابھی سوچنے کے قابل ہی نہیں۔

ماں..... تم میرے ساتھ ہو ہمیشہ..... ماں تم انمول ہو۔

فوٹا کے اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے تمام ٹیسٹ شروع کیے جاتے ہیں اور اس کے بعد سرجری کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ عطیہ کنندہ زاہدہ خاتون کے لیے ڈاکٹروں نے دو آنکھیں یعنی (قرنیہ cornea)، گردے، جگر اور دل ٹرانسپلانٹ کے بارے میں سوچا تھا۔ اس دوران قانونی اجازت کے لیے پنجاب ہیومن آرگن ٹرانسپلانٹ اتھارٹی سے رابطہ کر کے چیئرمین پروفیسر فیصل مسعود کو تمام صورتحال سے آگاہ کیا گیا۔

اس وقت رات کے نو بجے تھے۔ انھوں نے فوری طور پر اپنی ٹیم کو شریف میڈیکل سٹی بھیجا جس نے آ کر ساری قانونی کارروائی مکمل کی، انٹرویوز کیے۔ یوں رات دو بجے یہ مرحلہ اختتام کو پہنچا اور سرجری کا حتمی فیصلہ ہو گیا۔ اس دوران ڈاکٹر ذکی اور ٹیم پوری جانفشانی سے چوبیس گھنٹے سرگرم رہی اور سرجری کے لیے پوری طرح تیار تھی۔

بالآخر تمام قانونی مراحل طے ہو جانے کے بعد جب حتمی ٹیسٹ ہوئے تو یہ بات سامنے آئی کہ خاتون کے جسم میں سوڈیم کی مقدار زیادہ ہے۔ اگر سوڈیم کی مقدار زیادہ ہو تو جگر اور دل کی سرجری کامیاب نہیں ہوتی۔ اس لیے جگر اور دل کا عطیہ نہیں کیا گیا اور دونوں گردوں اور قرنیہ کی سرجری کر لی گئی۔ دونوں قرنیہ ایک ہی گھر کے دو بھائیوں کو عطیہ کر دی گئیں۔ آئی سپیشلسٹ ڈاکٹر ثمینہ نے آنکھوں کی سرجری کی۔

جب مستحقین کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنی شروع کیں تو پتا چلا کہ زاہدہ خانم کی ایک بیٹی خرابی گردہ (kidney failure) کی وجہ سے فوت ہو چکی جبکہ ایک بیٹا اور سگی بھتیجی بھی ڈائلسس کے سہارے جی رہے تھے۔ قریبی اور سگے رشتے ہونے کی وجہ سے بلڈ اور ٹشو دونوں سے ہی میچ کر گئے۔ یوں خوش نصیبی سے فوٹا کے قوانین کے عین مطابق رشتے دار مل گئے۔ خاتون کی ایک سگی بھتیجی اور بیٹے کو ایک ایک گردہ عطیہ ہوا تھا لہٰذا اب انھیں بھی آبزرویشن اور ٹرانسپلانٹ کے لیے داخل کر لیا گیا۔ اس طرح اس ایک ڈونر سے چار زندگیاں بچ گئیں۔

ڈاکٹر یورولوجی کا شعبہ کیوں نہیں اپناتے؟

پاکستان میں ٹرانسپلانٹ سرجن طب کے باقی شعبوں کی نسبت کم ہیں۔ بلاشبہ یہ شعبہ دنیائے طب میں بے انتہا اہمیت

کا حامل ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جس شعبے کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے وہاں ذمہ داری اور کام کا دباؤ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اسی لیے اس طرف نوجوان ڈاکٹروں کا رجحان کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ اس شعبے میں کمٹمنٹ بہت زیادہ اہم ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ڈاکٹر کو اپنے ذاتی معاملات اور گھر بار کو بالکل فراموش کر کے ۲۴ سے ۴۸ گھنٹے مسلسل چوکس رہنا پڑتا ہے کہ نجانے کب ایمرجنسی کی بنیاد پر فوری ٹرانسپلانٹ کرنا پڑ جائے۔ گھنٹوں ٹیسٹ کے نتائج کے انتظار میں سرجری کے آلات کے ساتھ تیار رہنا پڑتا ہے۔

صرف اتنا ہی نہیں، آپ کسی بھی قسم کی سرجری کروائیں، اس کے بعد مریض اور معالج کا تعلق محض دو ایک ملاقاتوں کے بعد ختم ہو جاتا ہے، جبکہ پیوند کاری واحد شعبہ ہے جس میں مریض کو صحتیاب ہونے کے بعد بھی تاحیات اپنے ڈاکٹر کے ساتھ رابطے میں رہنا ہوتا ہے اور ہر سال تین مہینے بعد اپنا مکمل معائنہ کروانا لازمی ہوتا ہے۔

کیڈویرک ٹرانسپلانٹ کی اہمیت

اگر کیڈویرک ٹرانسپلانٹ کو عوامی سطح پر پھیلایا جائے اور لوگوں میں یہ احساس اجاگر ہو جائے کہ مرنے کے بعد وہ اپنے اعضا سے کئی زندگیاں بچانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں تو نہ صرف ہزاروں لاکھوں زندگیاں بچ سکتی ہیں بلکہ جن کے خاندان میں عطیہ کرنے والا کوئی نہیں ہوتا، وہ کیڈویرک سہولت موجود ہونے سے بروقت اپنی یا اپنے عزیزوں کی جان بچا سکیں گے۔

ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ابھی تک ہم صحت اور تعلیم کے شعبوں میں وطنِ عزیز کو اُن بلندیوں پر نہیں لے جا سکے جہاں پہنچنا چاہیے تھا۔ البتہ ہم اس لحاظ سے خوش قسمت ضرور ہیں کہ ہماری قوم میں سماجی خدمت کا جذبہ بعض بڑے ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے کہیں زیادہ ہے۔ چاہے پھر وہ عبدالستار ایدھی جیسی عظیم شخصیت ہوں یا دیگر فلاحی ادارے۔ بعض ادارے اور کردار ایسے ہیں جو نہ صرف مثالی ہیں بلکہ قومی و

گردوں کی حفاظت اور احتیاط

کہاوت ہے کہ پرہیز علاج سے بہتر ہے۔ گردہ خراب ہونے سے بچانے کی تدابیر ہر فرد کو معلوم ہونی چاہئیں۔ ماہرین طب اس ضمن میں درج ذیل مشورے دیتے ہیں:

☆ روز تین لیٹر سے زیادہ یعنی دس سے بارہ گلاس پانی پینا چاہیے۔

☆ مستقل جسمانی ورزش کرنی چاہیے اور وزن اعتدال میں رکھیے۔

☆ ۴۰ سال کی عمر کے بعد کھانے میں نمک کی مقدار کم کر لینی چاہیے۔

☆ سگریٹ نوشی، شراب نوشی اور ہر طرح کی نشہ خوری سے پرہیز کیجیے۔

☆ ڈاکٹر کے مشورے کے بغیر کسی دوا کا استعمال نہ کریں۔

عالمی سطح پر بھی ان کی خدمات قابلِ تحسین رہی ہیں۔

ڈاکٹر محمد رفیق ذکی اور ان کی ٹیم نے کیڈویرک ٹرانسپلانٹ جیسے مفید اور نیک کام کو اپنی کاوشوں سے پایۂ تکمیل پہنچا کر یہ پیغام دیا ہے کہ اگر لوگوں میں اس کی اہمیت کا احساس اجاگر ہو جائے تو کتنی ہی قیمتی جانوں کو دوبارہ جینے کے قابل بنایا جا سکتا ہے۔

جس طرح ایک ماں نے مر کر بھی نہ صرف اپنے بیٹے بلکہ تین اور لوگوں کو نئی زندگی دے دی۔ اٹھائیس نومبر کو ایک زندگی جان کی بازی ہاری، انتیس نومبر کو موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا چار زندگیوں کو جینے کی امنگ نظر آئی اور محض ایک ہفتے بعد ۹ دسمبر ۲۰۱۷ء کو ڈاکٹر ذکی اور ان کے عملے نے اپنی نیک خواہشات اور دعاؤں کے ساتھ انھیں اسپتال سے اپنی مسیحائی کے سائے میں رخصت کیا۔ عائشہ خانم اور زین اب اپنے تمام ادھورے خواب پورے کرنے زندگی کا نیا سفر شروع کرنے کے لیے بالکل تیار اور امنگوں سے بھرپور ہیں۔ ◆◆◆

معاشرتی کہانی

خوش آمدید سالِ نو!

اقرا کاشف زبیر

ایک لڑکی نے نئے برس کے استقبال کا بڑا پُراثر طریقہ ڈھونڈ لیا

آج سے کچھ دن بعد نیا سال شروع ہونے جا رہا ہے۔ عشوی اپنے بستر پہ سوچوں میں گم لیٹی تھی۔ اسے ہمیشہ سے نئے سال کے متعلق نت نئے منصوبے بنانے اور اپنی سالگرہ پہلے سے زیادہ اہتمام سے منانے کی منصوبہ بندی کرنا بے حد پسند تھا۔ وہ کافی حد تک مستقل مزاج بھی تھی۔ سو اکثر اس کے منصوبے وقت پر پایۂ تکمیل تک پہنچتے۔

اسے یاد تھا گزشتہ سال اس کا ارادہ کڑھائی و دست کاری سے متعلق کچھ کورس کرنے کا تھا۔ مگر سینٹر گھر سے بہت دور تھا اور اس کے بابا جان اپنی ذاتی مصروفیات کے باعث اس کی کچھ مدد نہ کر سکتے تھے۔ سو کورس کرنے کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ دوسری ناگوار صورتحال اس وقت پیش آئی جب اپنی سالگرہ والے دن وہ سیڑھیوں سے پھسلنے کے باعث اس اہم تقریب میں بھی جوش و خروش سے حصہ نہ لے سکی۔ سو، اس سال وہ اپنے کسی بھی منصوبے کے لیے بدمزگی نہیں چاہتی تھی۔ بہت اہتمام سے اپنے پلان تیار کر رہی تھی کہ سالگرہ کی تقریب بے حد تزک و احتشام سے منائی جائے اور کیسے وہ جشنِ آزادی اور دوسرے تہواروں کے لیے ایک مکمل اور شاندار منصوبہ ترتیب دے سکے۔

اسی اثنا میں اسے کسی پاٹ دار آواز نے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ آواز صحن سے آ رہی تھی۔ عشوی جلدی سے اپنے کمرے سے باہر کی جانب بھاگی۔ میلے کچیلے لباس والی ایک غریب عورت اس کی امی کے پاس بیٹھی بلند آواز میں روتے ہوئے اپنا دُکھڑا سنا رہی تھی۔ اس کے گالوں پہ آنسوؤں کی گویا لڑیاں رواں تھیں۔ چہرے پہ اتنی بے بسی اور دکھ تھا کہ عشوی کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔

وہ افسوس سے اُسے دیکھتی رہ گئی۔ یہ عورت بیوہ تھی اور اکثر مالی مدد کی آرزو میں اس کی امی کے پاس چلی آتی تھی۔ عشوی کو یہ سن کر صدمہ ہوا کہ وہ آج اپنی تین سالہ بیٹی کے متعلق بتانے آئی تھی۔ اس کی ننھی سی بیٹی کئی ہفتوں سے معیادی بخار کا شکار تھی اور بیوہ عورت کا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔ کوئی غمگسار جو اس کے دکھ اور اس کی بیٹی کی تکلیف کا مداوا کر سکتا۔ عشوی کو عورت کا ایک ایک لفظ اپنے دل پہ نقش ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

اس کے ماں باپ عشوی کی چھوٹی چھوٹی تکالیف کو بھی نظر انداز نہیں کرتے تھے اور اس کا علاج کروا کے دم لیتے اور یہ ماں کتنی بے بس و مجبور تھی۔ وہ غربت اور لاچاری کے باعث اپنی ننھی بیٹی کی تکلیف پہ تڑپ رہی تھی۔ اچانک اسے اپنے وجود میں ایک توانائی محسوس ہوئی۔ وہ آنے والے سال کا اس سے بہتر استقبال نہیں کر سکتی تھی۔ ایک شاندار پبلی نیوائیر پارٹی کے لیے جمع کیے گئے پیسے جن سے بآسانی اس ننھی بچی کا علاج ہو سکتا تھا..... اس سے بہترین سال نو کو خوش آمدید کہنے کا اور بھلا کیا انداز ہو سکتا تھا؟ ایک وجود کی زندگی سال سے بڑھ کر ایک عرصے میں تبدیل ہو جاتی۔

وہ ایک نئے جوش اور مصمم ارادے کے زیرِ اثر مسکرانے لگی۔ اس کے لب دھیمے دھیمے گنگنا رہے تھے:

"خوش آمدید، سالِ نو" ◆◆◆

ابو صارم

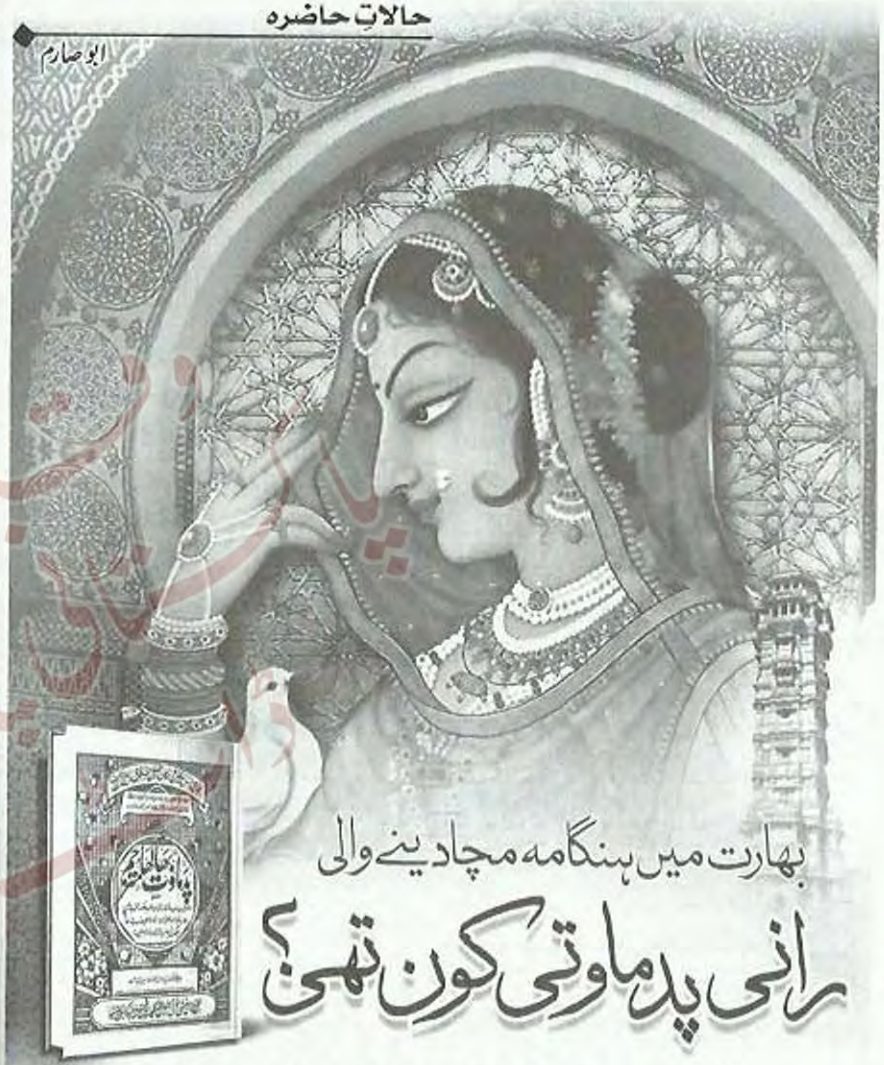

بھارت میں ہنگامہ مچا دینے والی

رانی پدماوتی کون تھی؟

جنونی ہندوؤں نے ایک افسانوی کردار کو زندہ کرکے ہیروئن بنالیا تو ہم پرستی کی ڈرامائی داستان

بھارت کے وزیراعظم، نریندر مودی اور امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ میں ایک قدر مشترک ہے.....

دونوں حکمران قوم پرست، قدامت پسند اور مسلم دشمن ہیں۔ جب بھی کہیں بم پھٹے یا کوئی شخص دوسروں پر گولیاں چلا دے، تو ان کا پہلا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ یہ ''دہشت گردی'' مسلمانوں نے کروائی ہوگی۔ یہ دراصل ایک ''مائنڈ سیٹ'' یا طرزِ فکر ہے جسے انگریزوں نے پچھلے دو تین سو برس کے دوران تخلیق کیا۔

تین سو سال قبل جب جدید اسلحے کے بل بوتے پر برطانوی، ہسپانوی، ولندیزی، پرتگالی وغیرہ مسلم ممالک پر قبضہ کرنے لگے، تو وہاں علمائے کرام نے حملہ آوروں کے خلاف جہاد کیا۔ علما اور عام مسلمانوں کو بدنام کرنے کی خاطر مغربی دانش ور اپنی تحریروں میں انھیں اجڈ، وحشی، انتہا پسند، بے رحم حتیٰ کہ پاگل انسانوں کے روپ میں پیش کرنے لگے۔

یہ پروپیگنڈا دنیائے مغرب میں اس شدومد سے کیا گیا کہ عام مغربی بھی مسلمانوں کو انتہا پسند، لڑاکا اور جاہل سمجھنے لگا۔ مغرب میں یہ تصور اتنا راسخ ہو چکا کہ اکیسویں صدی کے سائنسی دور میں بھی وہ بھارت سے لے کر امریکا تک کروڑوں غیر مسلموں کو متاثر کرتا ہے۔

بدقسمتی سے دنیا بھر میں مغربی میڈیا کا سکہ چل رہا ہے۔ چناں چہ وہ بدستور مسلمانوں کو دہشت گرد، اجڈ اور وحشی کے طور پر پیش کر رہا ہے جبکہ غیر مسلم ممالک میں مذہبی انتہا پسند اور قوم پرست مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں پر جو مظالم ڈھا رہے ہیں، وہ زیادہ نمایاں نہیں ہو پاتے۔

مثال کے طور پر آج بھارت میں ایک عام مسلمان کی زندگی عذاب بن چکی۔ وہ ہندو اکثریت کی مرضی کے خلاف معمولی سا بھی عمل کر دے، تو ہندو انتہا پسند اُسے سرِعام زندہ جلا یا مار ڈالتے ہیں۔ پولیس تک کو ہمت نہیں

سلطان علاؤالدین خلجی محمد شاہ اول (۶۹۵ھ۔ق)

ہوتی کہ انتہا پسندوں کی راہ روک سکیں۔ مودی دورِ حکومت میں ان ہندو انتہا پسندوں کا راج ہر شعبہ ہائے زندگی میں قائم ہو رہا ہے۔

اب فلم ''پدماوتی'' ہی کو لیجیے۔ یہ فلم سنجے لیلا بھنسالی نامی ڈائریکٹر، پروڈیوسر اور اسکرین رائٹر کی تخلیق ہے۔ وہ پہلے ''باجی راؤ مستانی'' نامی فلم بنا کر ہندو عوام میں بہت مقبول ہو چکا۔ مگر ہندو انتہا پسندوں نے اس کی نئی فلم، رانی پدماوتی متنازع قرار دے دی۔ ان کا دعویٰ ہے کہ فلم میں مسلمان بادشاہ، علاؤالدین خلجی اور پدماوتی کے رومانی مناظر فلما کر اس رانی کی شخصیت مسخ کر دی گئی۔

حیران کن امر یہ ہے، بیشتر ہندو مورخین بھی متفق ہیں کہ رانی پدمنی ایک افسانوی اور من گھڑت کردار ہے۔ اس کردار کو ایک مسلمان شاعر، ملک محمد جائسی نے ۱۵۴۰ء میں اپنی

اپنی شاعرانہ داستان ''پدماوت'' میں پیش کیا تھا۔

تاریخ کی رو سے ملک محمد جائیسی خود ہی پُراسرار شخصیت ہے۔ اس کے حالات زندگی کسی تاریخی کتاب میں درج نہیں۔ بس وہ علاقہ اودھ کے باشندوں میں سینہ در سینہ منتقل ہوتے گئے۔ وہ اودھی زبان میں شاعری کرتا تھا جو موجودہ بھارتی ریاست اتر پردیش میں بولی جاتی ہے۔ اس کی وفات ۱۵۴۲ء میں ہوئی۔

''پدماوت'' کی رو سے رانی پدماوتی سری لنکا کے ایک راجا کی بیٹی تھی۔ بھارتی ریاست، چتوڑ کے راجا، رتن سین کو ایک بولتے طوطے کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ نہایت حسین و جمیل ہے۔ چناں چہ وہ رانی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا، سات سمندر پار کر کے اُسے ڈھونڈا اور آخر بیاہ کر چتوڑ لے آیا۔

ایک بار راجا رتن نے اپنے ایک برہمن درباری کو فراڈ پر راج دھانی سے نکال دیا۔ وہ درباری شاہ دہلی، علاؤالدین خلجی کے پاس چلا گیا۔ ایک دن باتوں باتوں میں اس نے شاہ کے سامنے پدماوتی کے حسن و جمال کا ذکر کیا۔ چناں چہ علاؤالدین بھی پدماوتی کو حاصل کرنے کے لیے بے قرار ہو گیا۔

''پدماوت'' کے مطابق علاؤالدین نے پھر چتوڑ پر حملہ کر دیا تا کہ رانی پدماوتی کے حصول کو یقینی بنا سکے۔ لڑائی کئی ماہ تک چلی۔ آخر اس نے راجا رتن کو قتل کر دیا لیکن اس سے پہلے کہ علاؤالدین رانی پدماوتی تک پہنچتا، اس نے اپنی کنیزوں کے ساتھ ستی ہو کر اپنی جان قربان کر دی۔

راجا رتن ایک راجپوت بادشاہ تھا۔ چناں چہ آج خصوصاً ہندو راجپوتوں میں رانی پدماوتی کو عفت و عصمت اور دلیری و شجاعت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ ایک ایسی عورت جس نے غیر ہندو بادشاہ سے اپنی عزت بچانے کے لیے زندگی قربان کر دی۔ گویا اکیسویں صدی میں بھی ہندو راجپوت ایک خالصتاً افسانوی کردار کو حقیقی شخصیت سمجھتے ہیں۔

سچ یہ ہے کہ ہندوؤں کے بیشتر دیوی دیوتا خیالی قصوں، افسانوں اور داستانوں کی تخلیق ہیں جن میں رامائن اور مہابھارت سب سے نمایاں ہیں۔ ان کی ضعیف الاعتقادی اور جہالت کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے ایک مسلمان شاعر کے وضع کردہ افسانوی کردار، رانی پدماوتی کو حقیقی روپ دے ڈالا اور اب اس سے اندھی عقیدت رکھتے ہیں۔

اسی اندھی عقیدت کا نتیجہ ہے کہ ہندو انتہا پسندوں نے سنجے بھنسالی اور فلم پدماوتی کے فنکاروں کو جان سے مار دینے کی دھمکیاں دیں۔ اعلان کیا کہ اگر فلم ریلیز ہوئی، تو وہ سینما

فلم میں سلطان خلجی کو وحشی اور اجڈ دکھایا گیا ہے

جلا دیں گے۔ حکمران پارٹی بی جے پی کے ایک راہنما نے منادی کروا دی کہ جس ہندو نے سنجے بھنسالی کو جوتا مارا، وہ اُسے منہ مانگا انعام عطا کرے گا۔ غرض ہندو انتہا پسندوں نے فلم کے خلاف ایسا زوردار واویلا مچایا کہ اس کو جاری کرنے سے روک دیا گیا۔

حیرت انگیز بات یہ کہ پدماوتی فلم کے خلاف احتجاج تو مسلمانوں کو کرنا چاہیے تھا۔ سنجے بھنسالی خود کو سیکولر کہتا ہے، مگر اس نے فلم میں علاؤالدین خلجی کو ایک ظالم، جنونی اور ہوس پرست مسلمان بادشاہ کے روپ میں پیش کیا ہے۔ یہ پیش کاری تاریخی حقائق کو مسخ کر دینے کے برابر ہے۔

مسلم حکمران کی کردار کشی

حقیقت یہ ہے کہ سلطان علاؤالدین خلجی (دورِ حکومت: جولائی ۱۲۹۶ء تا جنوری ۱۳۱۶ء) ایک قابل منتظم اور بہترین سپہ سالار گزرا ہے۔ اس نے ہندوستان کو معاشی و عسکری طور پر بڑی طاقت بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا نیز معاشرے میں مفید معاشرتی و معاشی اصلاحات نافذ کیں تا کہ نظامِ حکومت بہتر ہو سکے۔

علاؤالدین خلجی نے ایک دو نہیں پانچ دفعہ حملہ آور منگول فوج کو شکست دی۔ اگر منگول ہندوستان پر قبضہ کر لیتے، تو آج ہندوستان کا نقشہ بالکل مختلف ہوتا۔ وجہ یہ کہ منگول جہاں بھی جاتے، اس علاقے کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے تھے۔ چناں چہ وہ ہندوستان پر قبضہ کر لیتے، تو شاید آج بھارت میں قدیم مندروں کا نام و نشان نہ ہوتا جن پر ہندو بہت غرور و فخر کرتے ہیں۔

کتب تاریخ کی رو سے ۱۳۰۳ء میں علاؤالدین خلجی نے چتوڑ پر واقعی حملہ کیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ سلطنت دہلی کے بہت سے باغیوں نے وہاں پناہ لے رکھی تھی۔ علاؤالدین نے راجا چتوڑ کی فوج کو شکست دی اور دشوار گزار قلعہ فتح کر لیا۔

اس جنگ میں مشہور صوفی شاعر، امیر خسرو بھی علاؤالدین کے ساتھ تھے۔ بعد ازاں انھوں نے سلاطین دہلی کی جنگوں کا تذکرہ ایک کتاب ''خزینۃ الفتوح'' میں تحریر کیا۔ اس کتاب میں کسی جگہ رانی پدماوتی کا ذکر نہیں۔

سلطان علاؤالدین خلجی کے دور میں ضیاالدین برنی مشہور مورخ گزرا ہے۔ اس کی کتاب ''تذکرہ فیروز شاہی'' عالمی شہرت رکھتی ہے۔ برنی نے بھی علاؤالدین کی چتوڑ مہم کا ذکر کیا ہے مگر اس میں رانی پدماوتی نامی کسی عورت کا ذکر نہیں ملتا۔ ضیاالدین برنی بوجوہ سلطان خلجی کا مخالف تھا۔ وہ رانی پدماوتی کے واقعے کا ذکر کرنے سے سلطان کو بآسانی بدنام کر سکتا تھا۔

رانی پدماوتی ستی کیوں ہوئی؟

دلچسپ بات یہ ہے کہ جائیسی کی ''پدماوت'' میں بھی رانی پدماوتی کے ستی ہونے کا ذمے دار سلطان علاؤالدین خلجی کو نہیں ٹھہرایا گیا۔ رانی ایک راجپوت راجا، دیوا پالا کے باعث ستی ہوئی جو کمبھ ہلنار نامی ریاست کا حکمران تھا۔

پدماوت کی رو سے راجھستان کے کئی راجا رانی پدماوتی سے بیاہ رچانا چاہتے تھے۔ انھی میں دیوا پالا بھی شامل تھا۔ اس شاعرانہ داستان کے مطابق سلطان علاؤالدین رانی کے شوہر کو گرفتار کر کے دہلی لے گیا تھا۔ شوہر کی عدم موجودگی میں راجا دیوا پالا نے رانی کو پیغام بھجوایا کہ وہ اس سے شادی کر لے۔ راجا نے اُسے کئی لارے بھی دیے مگر پدماوتی نے انکار کر دیا۔

بعد ازاں رانی نے ایک چال چل کر اپنے شوہر کو آزاد کروا لیا۔ جب پدماوتی کا شوہر گھر پہنچا، تو رانی نے اُسے بتایا کہ دیوا پالا کی نیت میں فتور ہے۔ چناں چہ دونوں راجپوت راجاؤں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں رتن اور

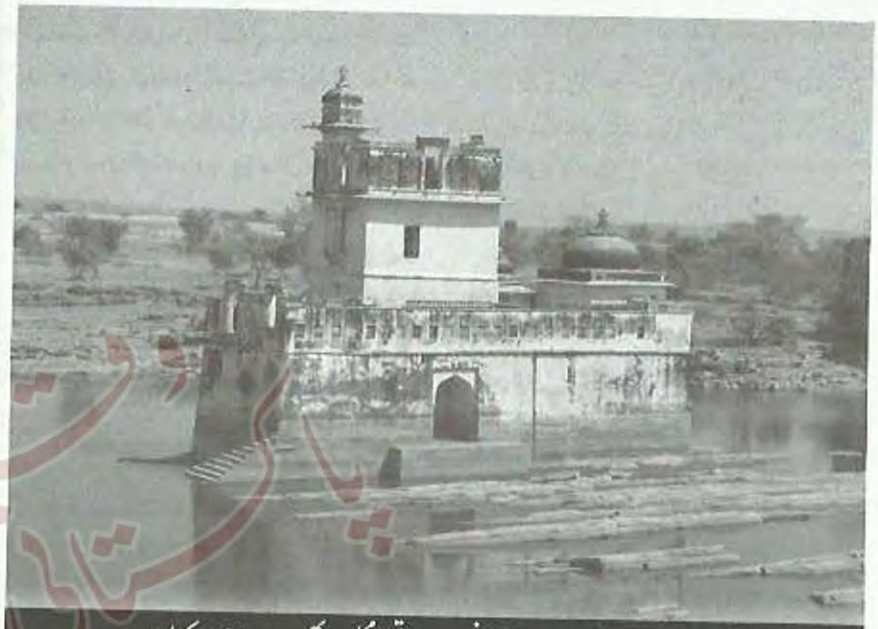

ہندوؤں نے چتوڑ میں رانی پدماوتی کا محل بھی دریافت کرلیا

دیوا پالا، دونوں راجا مارے گئے۔ اس کے بعد غم سے نڈھال پدماوتی نے خودکشی کرلی۔ گویا پدماوت کے مطابق بھی رانی پدماوتی کی موت کا ذمے دار سلطان علاؤالدین نہیں ایک راجپوت راجا تھا۔

یاد رہے، یہ راجپوت راجا ہی ہیں جن کے باعث افغان حکمرانوں کو ہندوستان پر حملے کرنے پڑے۔ اس جنگ کا آغاز راجپوت بادشاہ، جے پال نے کیا تھا جب وہ غزنی (افغانستان) پر حملہ آور ہوا۔ یوں راجپوتوں اور افغانوں کے مابین طویل جنگ چھڑ گئی جس میں کئی لڑائیاں ہوئیں، لیکن ان راجپوتوں کے لیے افغانوں اور ترکوں سے زیادہ بڑے دشمن مخالف راجپوت ہی تھے۔ خالصتاً افسانوی تخلیق ہوتے ہوئے بھی پدماوت یہی حقیقت عیاں کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے جب ۱۰۲۵ء میں سلطان محمود غزنوی نے گجرات پر حملہ کیا تو وہاں راجپوت راجا بھیم اول حکومت کر رہا تھا۔ اس نے سلطان کے خلاف ایک اور راجپوت راجا، پرتھوی راج چوہان سے مدد مانگی لیکن پرتھوی راج نے اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ دونوں کے خاندانوں میں دشمنی چلی آرہی تھی۔ یہ نظریہ تو کئی صدیوں بعد انگریز اور جرمن مورخین نے وضع کیا کہ ہندوستان کے تمام باشندے ''ہندو قوم'' سے تعلق رکھتے ہیں۔ حقیقتاً ماضی میں ہندوستان مختلف ریاستوں میں تقسیم تھا جو ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتی تھیں۔

کلکتہ میں واقع جدواپور یونیورسٹی کا شمار بھارت کی بہترین یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے۔ پروفیسر کوشک رائے اس

یونیورسٹی میں تاریخ کے استاد ہیں۔ انھوں نے ۲۰۱۲ء میں ایک انگریزی کتاب ''Hinduism and the Ethics of warfare in South Asia'' تحریر کی تھی۔ اس کتاب میں پروفیسر کوشک نے قدیم ہندو حکمرانوں کی جنگی اخلاقیات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

پروفیسر کوشک نے کتاب میں انکشاف کیا ہے کہ راجپوت حکمرانوں کی باہمی جنگوں میں سب سے زیادہ ظلم و ستم خواتین پر توڑا جاتا تھا۔ جب کوئی راجا مخالف راجپوت حکمران کی ریاست پر قبضہ کر لیتا، تو خصوصاً شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والی ساری خواتین بھیڑ بکریوں کی طرح فاتح لشکریوں کے مابین تقسیم کردی جاتیں۔

بھارتی نژاد امریکی، اندرانی چٹرجی نیوجرسی یونیورسٹی، امریکا میں تاریخ کی اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ ۲۰۰۶ء میں ان کی انگریزی کتاب ''Slavery and South Asian History'' (غلامی اور جنوبی ایشائی تاریخ) شائع ہوئی۔ اس میں پروفیسر اندرانی نے ایک ہولناک واقعے کا ذکر کیا ہے۔

ہوا یہ کہ ۱۴۳۳ء میں جودھ پور کے راجپوت راجا، موکل سنگھ کو اس کے بھائیوں (چاچا اور میرا) نے قتل کر دیا۔ دونوں بھائیوں نے پھر راجا چتوڑ کے قلعے میں پناہ لے لی۔ چند برس بعد موکل سنگھ کے بیٹے، رانا کھمبر نے چتوڑ پر حملہ کر دیا۔

رانا کھمبر نے قلعہ فتح کیا اور اپنے دونوں چچاؤں کو قتل کر دیا۔ رانا نے پھر چچاؤں اور ان کے ساتھیوں کی لاشوں کے اوپر ایک چبوترہ بنایا اور اُسے منڈپ کی شکل دے ڈالی۔ اس منڈپ پر پھر وہ اپنے لشکریوں کی قلعے میں مقیم عورتوں سے زبردستی شادیاں کرواتا رہا۔ ان شادیوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ سارا دن ہوتی رہتی تھیں۔

حکام کے ظلم پر صبر کرنا

حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ توریت شریف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ بادشاہوں کے دل میرے قبضے میں ہیں۔ جو میری اطاعت کرے گا میں اس کے لیے بادشاہوں کو رحمت بناؤں گا اور جو میری مخالفت کرے گا اس کے لیے ان کو عذاب بناؤں گا پھر تم بادشاہوں کو برا کہنے میں مشغول نہ ہو بلکہ میری درگاہ میں توبہ کرو، میں ان کو تم پر مہربان کردوں گا۔

راجپوت حکمرانوں کا وتیرہ تھا کہ وہ مخالف راجاؤں کی بہو بیٹیاں اغوا کر کے اپنے حرم کا حصہ بنا دیتے تھے۔ ان کی غنڈہ گردی اور بدمعاشیوں کے واقعات خود بھارتی مورخین نے بیان کیے ہیں۔ یہ چشم کشا واقعات عیاں کرتے ہیں کہ راجپوت حکمرانوں نے اپنی ریاستوں میں آباد خواتین کا جی بھر کر استحصال کیا۔ آج بھی حالات جوں کے توں ہیں۔

راجھستان اور قرب وجوار کی بھارتی ریاستوں میں کئی راجپوت خاندان بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالتے ہیں۔ یہی وجہ ہے، ان ریاستوں میں لڑکیوں کی شدید کمی واقع ہو چکی۔ جہیز کے معاملے میں بھی بہوئیں زندہ جلا دینا راجپوتوں کے ہاں معمول ہے۔ مگر یہ راجپوت اپنے گناہوں کو کبھی سلطان علاؤالدین خلجی اور کبھی سلطان محمود غزنوی کے سر مڑھ دیتے ہیں۔ ظاہر ہے، تلخ سچائی کا سامنا کرنے کی نسبت یہ عمل بہت آسان ہے۔

◆◆◆

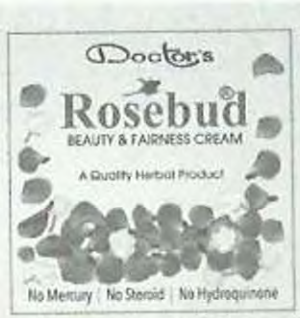

Doctor's
Unpasteurized, Unfiltered & Living
Natural
APPLE CIDER VINEGAR
With the Mother
100% خالص
روز بڈ شیمپو
DOCTOR'S ROSEBUD CREAM

ایپل سائیڈر ونیگر، بادام ناریل اور گلاب سے بنا منفرد شیمپو
بال گرنے بند، خشکی سکری ختم، بال لمبے گھنے
اور مضبوط، سر کی جوؤں کا خاتمہ

ایکنی، کیل، مہاسے، چھائیاں، جھریاں اور سیاہ حلقے دور کرتی ہے۔ شوگر کے مریضوں کے پاؤں کی درد، جلن، اکڑاؤ، مختلف ایگزیما اور پوسٹ ہرپز ڈوسٹر کا یقینی علاج

ڈاکٹر اصغر علی (ایم بی بی ایس)

"میں نے ڈاکٹر اصغر علی کی تیار کردہ مصنوعات خصوصاً شیمپو کو بہت مفید پایا ہے۔ اب میرا پورا خاندان یہ شیمپو استعمال کرتا ہے۔ میں اپنے حلقۂ احباب میں بھی اس کا تعارف کرواتا اور انھیں استعمال کرنے کا کہتا ہوں۔ یہ شیمپو خواتین کے بالوں کی کئی بیماریوں کا علاج ہے"۔ ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی (اُردو ڈائجسٹ)

ڈاکٹرز ایپل سائیڈر ونیگر

وزن کم کرتا ہے۔ کولیسٹرول کنٹرول کرتا ہے۔ جگر اور پیٹ کے بہت سارے امراض کا حل ہے۔ فالتو چربی ختم کرتا اور اسمارٹ بناتا ہے۔ ڈاکٹرز ایپل سائیڈر ونیگر سو فیصد خالص Unpasturised, unfiltered,living and the Mother ہے۔ جو پاکستان کے بہت سارے شہروں میں استعمال ہو رہا ہے اور لوگ مثبت رائے کا اظہار کر رہے ہیں۔

ڈاکٹرز روز بڈ کریم

ڈاکٹرز روز بڈ کریم میں شامل گلاب، بادام روغن، ناریل کا تیل، ایپل سائیڈر ونیگر اور قیمتی جڑی بوٹیاں خشک اور سرد موسم میں چہرے کی حفاظت کر کے چہرے کو گلاب کی طرح شاداب، تروتازہ، دلکش اور جاذب نظر بنا کر رنگ بھی گورا کرتی ہے۔

آئیے، ہم آپ کو اسمارٹ، صحت مند اور توانا بنائیں

موٹاپے میں مبتلا افراد بڑی آسانی سے شوگر، بلڈ پریشر اور دل کے امراض کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ صحت مند زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو قدرتی طریقۂ علاج سے مثلاً ڈاکٹرز ٹانک، خوراک کنٹرول اور مناسب ورزش سے وزن کم، پیٹ چھوٹا، صحتمند، اسمارٹ، توانا، شوگر، بلڈ پریشر اور دل کے امراض سے بغیر کسی سائیڈ ایفیکٹ کے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ کئی مریضوں کو دوائی کی بھی ضرورت نہیں رہتی اور وہ دوبارہ آئیڈیل صحت مند زندگی گزارتے ہیں۔
اتوار کے علاوہ شام چھ بجے سے رات آٹھ بجے تک اطلاع دے کر تشریف لا سکتے ہیں۔

برائے مشورہ: ڈاکٹر اصغر علی (ایم بی بی ایس)
کلینک: P-62 مرغزار کالونی ملتان روڈ لاہور
0321-8823321, 0336-4167960
doctor health and beauty clinic
Doctor Rosebud Shampoo
برائے رابطہ: حافظ مبشر علی 0321-9785644
www.doctorsons.org
پاکستان بھر سے ڈسٹری بیوٹر درکار ہیں
رابطہ نمبر برائے کراچی، حیدر آباد۔ 0321-207511

اب گزشتہ شمارے بھی دستیاب ہیں

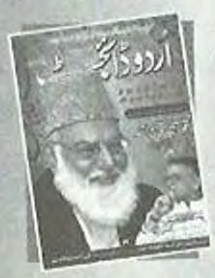

ایک شمارہ ۵۰ روپے میں

اسٹاک محدود ہے پہلے آیئے پہلے پایئے

اپنی لائبریری کو علم کے نایاب خزانے سے بھر لیجیے

کامیاب افراد کے حالاتِ زندگی، ملک کی نامور شخصیات کے دلچسپ و خصوصی انٹرویو، سماجی، سیاسی، معاشی و معاشرتی کہانیاں، حالاتِ حاضرہ اور سیاست کے بدلتے رنگ، معاشرتی مسائل اور ان کا حل، شکاریات، اسلامی واقعات، سائنس، طب و صحت، ٹیکنالوجی، کھیل، سیرت نبویؐ، اُردو ادب، افسانے، ڈرامے، تازہ ترین معلومات اور بہت کچھ.........

قارئین کے لیے تحفہ

۱۲ شمارے	۶۰۰ روپے
۲۴ شمارے	۱۰۰۰ روپے
۳۶ شمارے	۱۵۰۰ روپے

ڈاک خرچ یا کوریئر چارجز اس کے علاوہ ہوں گے

نوٹ: یہ پیشکش صرف گزشتہ 3 سال کے شماروں کے لیے ہے
یہ سہولت اندرون و بیرون ملک دونوں کے لیے میسر ہے۔

اُردو سے محبت کریں
اُردو ڈائجسٹ پڑھیں
آج ہی رابطہ کریں

موبائل: 0300-4005579
اپنا مکمل پتہ اور موبائل نمبر میسج کریں۔ آپ ہمیں ای میل بھی کر سکتے ہیں
subscription@urdu-digest.com
editor@urdu-digest.com
325 G-III جوہر ٹاؤن لاہور
فون: 042-37589957,35290738

کسی کا بُرا نہ چاہو

آدابِ حکمرانی سکھانے والی حکایاتِ سعدی کا بے مثال تحفہ

طالب ہاشمی

ایک بادشاہ کا غلام بھاگ گیا۔ کچھ لوگوں نے اس کا تعاقب کیا اور گرفتار کر کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ وزیر کو غلام سے دشمنی تھی۔ اس نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ غلام نے ہاتھ باندھ کر بادشاہ سے عرض کی ''حضور کے حکم کے سامنے میرا سر خم ہے لیکن چونکہ میں حضور کا نمک کھا کر پلا ہوں، اس لیے نہیں چاہتا کہ قیامت کے دن آپ پر میرے قتلِ ناحق کا الزام لگایا جائے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس وزیر کو مار ڈالوں۔ پھر اس کے قصاص میں آپ مجھے قتل کروا دیں۔ اس صورت میں میرا قتل بالکل جائز ہوگا''۔

بادشاہ ہنس پڑا اور وزیر سے کہا ''اب تیری کیا رائے ہے؟''

اس نے کہا ''جہاں پناہ میری رائے میں مناسب یہ ہے کہ اللہ کے لیے اپنے پدرِ بزرگوار کی قبر کے صدقے میں اس کو آزاد کر دیجیے تا کہ یہ مجھے کسی بلا میں نہ پھنسا دے''۔

چوں تیر انداختی بر روئے دشمن
چناں واں کا ندر آماجش نشستی

(جب تو کسی دشمن پر تیر چلائے تو یہ جان لے کہ تو بھی اس کے نشانے پر ہے۔)

ملک صالح ایوبی اور دو درویش

شام کے بادشاہ الملک الصالح ایوبی کی عادت تھی کہ وہ رات کو بھیس بدل کر شہر میں گشت کیا کرتا تھا تا کہ لوگوں کے دکھ درد خود معلوم کر سکے۔ ایک رات وہ حسبِ معمول شہر میں گھوم رہا تھا کہ اس نے مسجد میں درویشوں کو دیکھا جو ایک کونے میں بیٹھے سردی سے ٹھٹھرتے بادشاہ کو کوس رہے تھے۔ ایک درویش دوسرے سے کہہ رہا تھا ''یہ متکبر بادشاہ خود تو عیش کر رہا ہے اور ہم غریب زمانے کی سختیاں جھیل رہے ہیں۔ اگر آخرت میں بھی اس بادشاہ کو بہشت میں جگہ ملی تو میں بہشت پر اپنی قبر کو ترجیح دوں گا''۔

دوسرا کہنے لگا ''اگر ملک صالح بہشت کی دیوار کے قریب بھی آئے گا تو میں جوتے مار مار کر اس کا سر پھوڑ ڈالوں گا''۔

بادشاہ ان کی باتیں سن کر چپکے سے واپس آ گیا۔ صبح ہوئی تو اس نے دونوں درویشوں کو دربار میں طلب کیا۔ جب وہ حاضر ہوئے تو ان کی بڑی تعظیم و تکریم کی اور پھر ان کو اتنا کچھ دیا کہ عمر بھر کے لیے فکرِ معاش سے آزاد ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے بادشاہ سے عرض کی ''جہاں پناہ ہم خادموں کا آپ کو کیا پسند آیا کہ اس قدر الطاف و اکرام کے مستحق ٹھہرائے گئے''۔ بادشاہ ہنس پڑا اور کہا۔

من امروز کردم در صلح باز
تو فردا مکن در بردیم فراز

(میں نے آج تم سے صلح کر لی ہے۔ امید ہے کہ کل تم مجھ پر جنت کا دروازہ بند نہیں کرو گے۔)

ہارون الرشید کی بیٹے کو نصیحت

ایک دفعہ ہارون الرشید کا بیٹا غصے میں بھرا ہوا باپ کے پاس آیا اور کہا کہ فلاں سپاہی کے لڑکے نے مجھے گالی دی ہے۔ ہارون الرشید نے ارکانِ دولت سے پوچھا کہ ایسے آدمی کو کیا سزا دینی چاہیے؟ ایک نے زبان کاٹنے کی رائے دی۔ دوسرے نے جائیداد کی ضبطی اور ملک بدر کرنے کی سزا تجویز کی اور ایک نے اس کے قتل کا مشورہ دیا۔ ہارون الرشید نے بیٹے سے مخاطب ہو کر کہا ''اے بیٹے! اگر تو اسے معاف کر دے تو تیری مہربانی ہے اور اگر نہیں کر سکتا تو، تُو بھی اس کو گالی دے لے لیکن حد سے تجاوز نہ کرنا ورنہ پھر تیری طرف سے ظلم ہوگا اور دوسرے کی طرف سے دعویٰ۔''

عقل مند کے نزدیک مرد وہ نہیں جو مست ہاتھی سے لڑے۔ ہاں تحقیق کی رو سے مرد وہ ہے کہ جب اس کو غصہ آئے تو واہی تباہی نہ بکے۔

ایک بزرگ اور ظالم بادشاہ

عجم کا ایک بادشاہ بڑا ظالم تھا۔ رعیت پر طرح طرح کی سختیاں کرتا اور بے شمار لوگوں کو قید میں ڈال رکھتا۔ ایک دفعہ اس کے بدن پر موذی پھوڑا نکل آیا جو کسی طرح ٹھیک ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ اس کی تکلیف سے بادشاہ سوکھ کر کانٹا بن گیا۔ ایک درباری نے اس کو بتایا ''جہاں پناہ! شہر میں ایک خدا رسیدہ بزرگ ہیں۔ ان کی دعا سے بگڑے کام بن جاتے ہیں۔ اگر آپ ان سے دعا کروائیں تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو شفا دے گا''۔ بادشاہ نے ان کو بلا بھیجا اور دعا کے لیے درخواست کی۔

انھوں نے بادشاہ کو خشمناک ہو کر کہا ''اے بادشاہ! میری دعا تیرے لیے کب مفید ہو گی۔ جب کہ بے گناہ لوگ تیرے ہاتھوں قید و بند کی سختیاں جھیل رہے ہیں اور ان کی بددعائیں تیرا پیچھا کر رہی ہیں۔ جب تک تو ان مظلوموں پر رحم نہیں کرے گا، اللہ تعالیٰ تجھ پر رحم نہیں کرے گا''۔

بادشاہ پر بزرگ کی باتوں کا بڑا اثر ہوا اور اس نے حکم دیا کہ سب قیدیوں کو رہا کر دیا جائے۔ جب سب لوگ رہا ہو گئے تو اللہ کے اس نیک بندے نے بارگاہِ الٰہی میں نہایت عاجزی سے دعا کی ''الٰہی تو نے اس کو نافرمانی میں پکڑا، اب اس نے اطاعت اختیار کی ہے تو، تُو بھی اس پر رحم فرما''۔

ابھی ان کی دعا پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے بادشاہ کو شفا دے دی۔ اس نے حکم دیا کہ بزرگ کے سر پر زر وجواہر نچھاور کیے جائیں۔ بزرگ نے زر وجواہر پر ٹھوکر مار کر کہا ”اے بادشاہ! مجھے ان کی حاجت نہیں۔ ہاں تو پھر ایسے کام نہ کرنا کہ یہ بیماری عود کر آئے۔ جب تو ایک بار گرا ہے تو اب قدم جما کر رکھ کہ دوبارہ نہ پھسلے“۔

زسعدی شنو کیں سخن باستست
نہ ہر بارے افتادہ برخاستست
(سعدی سے سن لے، یہ سچی بات ہے، کوئی گر کر ہر مرتبہ نہیں اٹھتا ہے۔)

بادشاہی دردِ سر ہے

ایک بادشاہ کی کوئی اولاد نہ تھی۔ اس نے مرتے وقت وصیت کی کہ کل صبح جو شخص سب سے پہلے شہر میں داخل ہو، تاج شاہی اس کے سر پر رکھ دیا جائے۔ دوسرے دن سب سے پہلے جو شخص شہر میں داخل ہوا، وہ ایک خستہ حال بھکاری تھا۔ جس کی ساری عمر بھیک مانگتے اور پیوند لگے کپڑے پہنتے گزری تھی۔ امرائے حکومت نے مرحوم بادشاہ کی وصیت کے مطابق اسے اپنا بادشاہ بنا لیا اور قلعوں اور خزانوں کی چابیاں اس کے سپرد کر دیں۔

کچھ عرصہ تو نظام حکومت ٹھیک ٹھاک چلتا رہا۔ پھر بعض امیروں کی سرکشی کی وجہ سے اس میں خلل پڑنا شروع ہو گیا اور ملک کا ایک حصہ اس کے قبضہ سے نکل گیا۔ انھی دنوں اس کا ایک پرانا ساتھی سفر سے واپس آیا۔ اپنے دوست کا شاہانہ کروفر دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا ”اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ بخت نے تیری یاوری کی ہے۔ اقبال و دولت نے تیری رہبری کی یہاں تک کہ تیرا پھول کانٹے سے اور کانٹا تیرے پیر سے نکل گیا۔ بیشک تنگی کے ساتھ آسانی ہے“۔

بادشاہ نے کہا ”اے عزیز یہ مبارک باد دینے نہیں بلکہ ماتم پرسی کا موقع ہے۔ جب میں تیرا ساتھی تھا، اس وقت مجھے صرف ایک روٹی کی فکر ہوتی تھی اور رات کو چین سے سوتا تھا۔ اب ایک جہان کی فکر ہے اور نہ دن کو چین ہے اور نہ رات کو“۔

عظیم فتوحات کا راز

سکندر رومی سے لوگوں نے پوچھا کہ مشرق اور مغرب کے ممالک تو نے کیسے فتح کر لیے حالانکہ پہلے بادشاہ خزانوں، عمر، ملک اور لشکر میں تجھ سے بڑھے ہوئے تھے لیکن ایسی عظیم فتوحات ان کو بھی نصیب نہ ہوئیں۔ اس نے کہا ”اس کی وجہ یہ ہے کہ جو ملک میں نے فتح کیا وہاں کے باشندوں کو نہ ستایا اور گزرے ہوؤں کی عمدہ رسموں کو منسوخ نہ کیا اور گزشتہ بادشاہوں کو ہمیشہ اچھائی سے یاد کیا“۔

نام نیک رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نام نیکت برقرار
(جو لوگ اس دنیا سے کوچ کر گئے ان کے نیک نام کو ضائع نہ کر تاکہ تیرا نیک نام باقی رہے۔)

دو بھائیوں کی سرگزشت

ایک بادشاہ کے دو بیٹے تھے۔ اس نے ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت نہایت اعلیٰ پیمانے پر کی یہاں تک کہ دونوں ہر قسم کے علوم و فنون میں طاق ہو گئے۔ بادشاہ کا جی دونوں بیٹوں کی طرف سے مطمئن تھا۔ جب اس کا آخری وقت قریب آیا تو اس نے ملک کو دونوں بیٹوں میں برابر برابر تقسیم کر دیا اور وصیت کی ”میرے بچو میرے بعد اتفاق سے رہنا۔ میں نے فساد کی جڑ کاٹ دی ہے“۔

دونوں بھائیوں نے اپنا اپنا علاقہ سنبھال لیا اور حکومت کرنے لگے۔ ایک بھائی نہایت عقل مند، سخی اور منصف مزاج تھا۔ اس نے محتاجوں کے لیے لنگر جاری کیے۔ مسافر خانے بنوائے۔ سرکاری محاصل میں رعایت کی اور رفاہِ عامہ کے بے شمار کام کیے یہاں تک کہ رعایا نہایت آسودہ حال ہو گئی۔ اپنی خوش تدبیری اور حسنِ اخلاق کی بدولت وہ ایسا نیک

نام اور ہر دلعزیز ہوا کہ نہ صرف اپنی رعایا اور فوج اس پر جان چھڑکتی تھی بلکہ اردگرد کے ممالک کے لوگ بھی اس کی سلطنت میں شامل ہونے کی آرزو کرتے تھے۔

دوسرا بھائی لالچی اور ظالم نکلا۔ اس نے کاشتکاروں پر لگان بڑھا دیا۔ سامان تجارت پر طرح طرح کے محصول لگا دیے اور روپیہ جمع کرنے کی دھن میں رعایا کو ستانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ تھوڑی ہی مدت میں لوگ اس سے تنگ آ گئے اور ملک سے بھاگنے لگے۔ نہ تجارت کی گرم بازاری رہی اور نہ کھیتوں میں سبزہ۔ ملک کی ویرانی کے ساتھ بادشاہ کا خزانہ بھی خالی ہو گیا اور نظام حکومت بگڑ گیا۔ یہ حالت دیکھ کر دشمن اس پر چڑھ دوڑے۔ اس کی فوج پہلے ہی بددل تھی، مقابلہ کیا کرتی۔ دشمن نے آناً فاناً اسے مغلوب کر لیا اور اس طرح وہ اپنی بدتدبیری اور عاقبت نااندیشی کی بدولت ملک اپنے ہاتھ سے گنوا بیٹھا۔

نیک نام سے بڑھ کر کوئی قلعہ مضبوط نہیں

سلطان قزل ارسلان سلجوقی کے پاس ایک زبردست قلعہ تھا۔ وہ پہاڑوں کے بیچوں بیچ ایسے محفوظ مقام پر واقع تھا کہ خواہ کیسا ہی دشمن حملہ کرے، اس کو سر نہ کر سکتا تھا۔ اس قلعے کے اندر پانی کے چشمے جاری تھے اور سرسبز باغ لہلہاتے کھیت تھے۔ اس میں مقیم لشکر سال ہا سال تک اپنی ضرورتیں خود پوری کر سکتا تھا اور باہر سے کسی امداد کا محتاج نہ تھا۔ سلطان کو اس قلعے پر بڑا ناز تھا۔ ایک دن سلطان کے دربار میں لوگ اس قلعے کی تعریفیں کر رہے تھے کہ ایک صاحب دل وہاں آ گیا۔

اس نے لوگوں کی باتیں سنیں تو ہنس کر کہا ”بادشاہ سلامت یہ قلعہ مبارک ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ یہ اتنا مضبوط ہے کہ آپ کی حفاظت کر سکیں۔ اس قلعہ میں آپ جیسے بہت سے آئے اور چند دن ٹھہر کر رخصت ہو گئے۔ اس قلعے پر بھروسا کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کے کرم پر بھروسا کیجیے۔ اینٹ اور پتھر کا قلعہ ایک دن فنا ہو جائے گا، ہاں اگر کچھ باقی رہا تو وہ آپ کا نیک نام ہوگا۔ لوگوں کے ساتھ بھلائی کیجیے اور یاد رکھیے کہ نیک نام ایسا مضبوط قلعہ ہے جو ہمیشہ آپ کے کام آئے گا“۔

بر مرد ہشیار دنیا خس است
کہ ہر مدتے جائے دیگر کس است
(ہوشیار انسان کے نزدیک دنیا تنکا ہے۔ ہر زمانے میں دوسرے کی جگہ ہے۔)

حسد کا علاج صرف موت ہے

ایک دفعہ میں نے ایک سپاہی کے نوخیز فرزند کو دیکھا کہ کمال درجے کا ذہین اور فطین تھا، بچپن ہی سے بڑائی کے آثار اس کی پیشانی سے ظاہر تھے۔

بالائے سرش ز ہوشمندی می تافت ستارۂ بلندی
(اس کے سر پر ہوش مندی کی وجہ سے بڑائی کا ستارہ چمک رہا تھا۔)

بادشاہ نے اس کی غیر معمولی ذہانت اور فراست کا چرچا سنا تو اُسے اپنے دربار میں ایک اعلیٰ مرتبے پر فائز کر دیا۔ دوسرے درباری اس سے حسد کرنے لگے۔ بادشاہ کی نظروں سے اس کو گرانے کے لیے ایک دن اس پر خیانت کی تہمت لگا دی لیکن

دشمن چہ کند چو مہرباں باشد دوست
(جب دوست مہربان ہو تو دشمن کیا کر سکتا ہے۔)

بادشاہ نے اس سے پوچھا ”یہ لوگ تم سے کیوں ناراض ہیں؟“ نوجوان نے عرض کی ”جہاں پناہ! جب سے یہ غلام آپ کے زیرِ سایہ آیا ہے، میں نے ہر شخص کو راضی کر لیا۔ البتہ حاسدوں کو میں خوش نہ کر سکا۔ کیوں کہ ان کا دل تو اسی وقت ٹھنڈا ہو سکتا ہے جب حضور مجھے ذلیل کر کے اپنے در سے دھتکار دیں۔ میں یہ تو کر سکتا ہوں کہ کسی کی دل آزاری نہ کروں لیکن حاسد کا کیا کروں، وہ تو یوں ہی جل رہا ہے“۔

اے حاسد تو مر جا کہ یہ جلنا کڑھنا تو ایسا ہے کہ اس کی تکلیف سے صرف موت ہی تجھے نجات دلا سکتی ہے۔

خوب سیرتی خوب صورتی سے بہتر ہے

ایک بادشاہ کے کئی لڑکے تھے۔ ان میں سے ایک شہزادہ

پست قد اور معمولی شکل وصورت کا تھا اور اس کے دوسرے بھائی قدآور اور وجیہہ تھے۔ ایک دفعہ بادشاہ نے اپنے کم رو فرزند کو نفرت اور حقارت سے دیکھا۔ شہزادہ اپنی خداداد فراست سے باپ کے رویے کا سبب سمجھ گیا۔ اس نے کہا ''ابا جان چھوٹے قد والا عقل مند بلند قامت احمق سے بہتر ہے۔ جو چیز قد وقامت میں چھوٹی ہے ہوسکتا ہے کہ وہ قیمت میں زیادہ ہو۔ جیسا کہ اَلشَّاۃُ نَظِیفَۃٌ وَّالْفِیْلُ جِیفَۃٌ (بکری حلال ہے اور ہاتھی حرام ہے)۔

باپ ہنس پڑا اور سلطنت کے امرا و وزرا نے اس خیال کو پسند کیا۔ البتہ اس کے بھائی اس بات پر بہت رنجیدہ ہوئے۔

اس واقعہ کے چند روز بعد ایک طاقتور دشمن نے بادشاہ پر چڑھائی کر دی۔ جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے اور لڑائی کے لیے پر تولے تو سب سے پہلا جو شخص میدان رزم میں آیا، وہ وہی پست قد شہزادہ تھا۔ اس وقت وہ یہ رجز پڑھ رہا تھا۔

آن نہ من باشم کہ روز جنگ بینی پشت من
آن منم کر درمیان خاک و خوں بینی سرے
کانکہ جنگ آرد بخوں خویش بازی می کند
روز میدان وانکہ بگریز و بخون لشکرے

(میں وہ نہیں کہ لڑائی کے دن تو مجھے بھاگتے ہوئے دیکھے۔ میں تو وہ ہوں کہ تو جس کے سر کو خاک اور خون میں لتھڑا ہوا پائے گا۔ جو شخص جنگ لاتا ہے وہ اپنے خون سے کھیلتا ہے۔ جو میدان سے بھاگتا ہے وہ اپنی فوج کے خون سے کھیلتا ہے۔)

یہ شہزادہ دشمن کی فوج پر ٹوٹ پڑا اور اس کے کئی بہادروں کو مار گرایا۔ جب باپ کے پاس واپس آیا تو زمین بوس ہو کے کہا ''آپ نے جب تک میرے ہنر کو اچھی طرح سے نہ دیکھ لیا مجھے حقیر جانا۔ سچ تو یہ ہے کہ دبلا پتلا سبک رفتار گھوڑا لڑائی کے دن کام آتا ہے نہ کہ موٹا تازہ بیل''۔ کہتے ہیں کہ دشمن کی فوج بہت زیادہ تھی۔ اس کے مقابلے میں بادشاہ کی فوج تھوڑی تھی۔ ایک گروہ اپنی کم تعداد دیکھ کر جی چھوڑ بیٹھا اور اس نے بھاگنے کا ارادہ کیا۔ بہادر شہزادہ ان کے تیور بھانپ گیا اور اس نے للکار کر کہا۔ ''اے بہادرو! ہمت سے کام لو اور عورتوں کا لباس مت پہنو''۔

شہزادے کے جوش دلانے پر سواروں کے حوصلے بڑھ گئے اور انھوں نے مرنے مارنے کا تہیہ کر کے دشمن پر بڑے زور کا حملہ کیا۔ دشمن اس ہولناک یلغار کا مقابلہ نہ کر سکا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ بادشاہ نے فرط مسرت سے شہزادے کے سر آنکھوں کو چوما، گلے سے لگایا اور اس کے بعد اس پر بے حد مہربان ہو گیا۔ یہاں تک کہ اسے اپنا ولی عہد نامزد کر دیا۔

اس کے بھائیوں کو حسد پیدا ہو گیا۔ ایک دن موقع پا کر اس کے کھانے میں زہر ملا دیا۔ شہزادے کی بہن نے کھڑکی سے یہ حرکت دیکھ لی۔ شہزادے نے جوں ہی زہر آلود کھانے کا لقمہ اٹھایا، اس نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ شہزادہ متنبہ ہو گیا۔ کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور کہا۔ ''یہ مشکل ہے کہ اہل ہنر مر جائیں اور بے ہنر ان کی جگہ لے لیں۔'' ؎

کس نیاید بزیر سایۂ بوم — در ہما از جہاں شود معدوم

(اگر ہما دنیا سے معدوم ہو جائے تو پھر بھی کوئی شخص الو کے سائے تلے نہیں آئے گا۔)

بادشاہ کو اس واقعہ کا علم ہوا تو اس نے حاسد بھائیوں کو طلب کیا۔ انھیں مناسب سزا دی پھر ہر ایک کے لیے آس پاس کے علاقوں میں سے ان کی مرضی کے مطابق حصہ مقرر کر دیا تاکہ فساد کی جڑ کٹ جائے اور جھگڑے کا احتمال نہ رہے۔ کیوں کہ داناؤں کا قول ہے ''دہ درویش در گلیمے بخسپند و دو بادشاہ در اقلیمے نگنجند''۔ یعنی ''دس درویش ایک گدڑی میں سو سکتے ہیں لیکن دو بادشاہ ایک ملک میں نہیں سما سکتے۔'' ◆◆◆

مہر افروز

پی آئی اے کا طیارہ بھارت نے مار گرایا؟

۲۸ سال قبل کے ایک پُراسرار معمے کی ڈرامائی داستان جواب تک حل نہیں ہو سکا

۲۵ اگست ۱۹۸۹ء کا دن راشد اور اس کے گھر والوں کے لیے بے شمار خوشیاں لے کر طلوع ہوا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے عید کا سماں ہو، ہر چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا اور آنکھوں میں نئی دمک تھی۔ راشد کا کنبہ چند افراد پر مشتمل تھا۔ بوڑھے والدین، بہن، جوان بیوی اور دو سال کا بیٹا! بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑے والدین راشد کی اچھی ملازمت کی خبر سن کر خود کو جوان محسوس کر رہے تھے۔ ایسے لگتا تھا کہ ان کی تمام چھوٹی موٹی بیماریاں ختم ہو گئی ہوں اور زندگی بھر کی محنت رنگ لے آئی۔

باپ نے تمام عمر لکڑیاں کاٹ کر محنت مشقت کی تھی اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالا۔ پھر راشد کی شادی بھی بڑے چاؤ سے کی کیونکہ وہ اُن کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اب راشد کی چھوٹی بہن شازیہ کی ذمہ داری بھائی کو سونپ دی گئی۔ راشد نے وعدہ کیا کہ وہ شازیہ کے تمام ارمان پورے کرے گا اور انشاء اللہ اس کی شادی دھوم دھام سے ہوگی۔ راشد کو اچھی تعلیم دلوانے کے لیے ماں نے بھی نجانے کتنی خواہشوں کو اپنے قدموں تلے روند ڈالا تھا۔

راشد کے والدین کی لگن اور محنت کا نتیجہ تھا کہ گلگت جیسے پسماندہ علاقے میں رہتے ہوئے بھی وہ علم کی منازل طے کرتا گیا اور آخر کار انجینئر بن گیا۔ بیٹا منزل تک پہنچا، تو ماں، باپ کا سینہ فخر سے تن گیا۔ اگر انھوں نے پسینا پانی کی طرح بہایا تھا تو راشد نے بھی محنت کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ وہ سب گھر والوں سے بہت پیار اور ان کی خواہشات و احساسات کا احترام کرتا تھا۔ شازیہ اور اپنے دو سالہ بیٹے، گڈو میں تو جیسے راشد کی جان تھی۔ وہ مصمم ارادہ کر چکا تھا کہ اپنے گھر والوں کے سب خواب پورے کرے گا۔

راشد کو اسلام آباد میں ملازمت ملی تھی۔ اگلے دن اسے حاضری دینی تھی۔ کمپنی بہت اچھی تھی اور تنخواہ بھی پرکشش۔ راشد جیسے ہواؤں میں اُڑ رہا تھا۔ وہ شازیہ اور گڈو کو بار بار گلے لگاتا۔ اس نے انھیں بہت سے تحائف بھجوانے اور لانے کے وعدے کیے تھے۔ گڈو سے کہا، میں تمہارے لیے بڑا سا جہاز لاؤں گا کیونکہ تمھیں بہت پسند ہے۔

راشد کو خود بھی ہوائی جہاز میں بیٹھنے کا بہت شوق تھا۔ ملازمت کی خبر ملتے ہی اس نے جیسے تیسے پیسوں کا انتظام کر کے گلگت سے اسلام آباد جانے کے لیے پی آئی اے کے طیارے کا ٹکٹ خرید لیا۔ جب گھر والوں کو یہ خبر ملی تو ان کی خوشی دگنی ہوگئی۔ ویسے بھی راشد خاندان بھر سے پہلا لڑکا تھا۔ جس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اب اسے اچھی ملازمت بھی مل گئی۔ وقتِ رخصت ماں اور جمیلہ کی آنکھوں میں نمی پڑنے لگی۔ گڈو اور شازیہ تو رونے لگے۔ راشد سب کو دلاسے دینے لگا کہ رفتہ رفتہ وہ ان سب کو بھی اسلام آباد لے جائے گا۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ راشد نے سب سے اجازت لی اور ہوائی اڈے روانہ ہوگیا۔ پرواز کا وقت صبح ساڑھے سات بجے تھا۔ راشد کو ہر منظر سہانا لگ رہا تھا۔ وہ گھڑیاں آن پہنچی تھیں جن کا وہ کئی برس سے منتظر تھا۔ پھر ہوائی سفر کا خواب بھی تو پورا ہو رہا تھا۔ راشد پی آئی اے کی پرواز ۴۰۴ میں سوار تھا۔ یہ ایک فوکر ایف ۲۷ فرینڈ شپ طیارہ تھا جس میں کل چون مسافر سوار تھے۔ ان میں پانچ افراد عملے کے بھی شامل تھے۔ چار افراد کا تعلق ایک ہی خاندان سے تھا۔ جہاز نے سات بج کر پینتیس منٹ پر اپنی اُڑان بھری اور منزل کی جانب گامزن ہوا۔

لیکن یہ کیا؟

چند منٹ بعد ہی طیارہ غائب ہوگیا! کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بھارتی فوج نے اسے مار گرایا لیکن یہ محض قیاس آرائی ہے۔ اپنی اڑان کے صرف پانچ چھ منٹ بعد تک جہاز را بطے میں رہا۔ اٹھائیس سال بیت جانے کے باوجود یہ معمہ حل نہ ہوسکا کہ طیارہ کہاں گیا؟ کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ وہ ہمالیہ کے پہاڑوں میں تباہ ہوگیا۔

آج راشد کا گڈو جوان ہو چکا۔ وہ جاننا چاہتا ہے کہ اس کا باپ کہاں ہے؟ راشد کی بیوی اور بہن اب تک تڑپ رہی ہیں۔ ان کی زندگیوں سے سکون ختم ہوگیا ہے اور بے چارے بوڑھے والدین جن کی آنکھیں بیٹے کو دیکھنے کے لیے ترس گئیں، وہ زیادہ دیر اس غم کو اپنے کندھوں پر نہ اُٹھا سکے اور اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئے۔ جب بھی اگست کا مہینا آتا ہے تو اس حادثے میں جاں بحق ہونے والوں کے رشتے دار تڑپ اُٹھتے ہیں۔ وہ اب بھی کسی معجزے کے منتظر ہیں کہ شاید اس طیارے کا کوئی سراغ مل جائے! اور اللہ تعالیٰ انھیں ایسی بے بسی سے بچالے، آمین۔

عارف حسین، طیارے کے بدنصیب مسافروں میں سے ایک کے رشتہ دار ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے چچا اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ طیارے میں تھے۔ عارف حسین کے چچا اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ اسی دن ان کی ترقی ہوئی اور وہ ڈپٹی کمشنر بن گئے۔ ان خوشگوار لمحات کو یادگار بنانے کے لیے وہ سیر و تفریح کی غرض سے گلگت آئے ہوئے تھے۔ بس ان کو یہ خوشی راس نہ آئی اور واپسی پر ان کا طیارہ حادثے کا شکار ہو گیا۔ اس حادثے سے متاثرہ خاندانوں میں اور بھی بہت سے لوگ قابلِ ذکر ہیں لیکن چند ایک کا تذکرہ کریں گے۔

ماریہ جبین کا تعلق گلگت بلتستان سے ہے۔ وہ بتاتی ہیں، ان کے چچا اور ابا بدقسمت طیارے میں سوار تھے۔ ان دنوں ماریہ کی شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں کیونکہ صرف ایک مہینے بعد بیاہ تھا لہٰذا اس کے چچا اور ابا شادی کی خریداری کے لیے اسلام آباد روانہ ہوئے مگر افسوس کبھی واپس نہ آسکے۔ خوشیوں بھرے گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ ہم سب اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ خوشیوں بھرے لمحات گزرنے کا پتا بھی نہیں

چلتا جبکہ دکھ بھری گھڑی کاٹے نہیں کٹتی۔

طیارہ گمشدگی کے بعد پہلے تین چار روز تو فوجی جوانوں نے متعلقہ پہاڑی علاقے چھان مارے لیکن اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ کچھ عرصہ بعد فوجیوں اور تمام جوانوں نے مل کر پھر اس پر کام شروع کیا۔ ٹیم نے نانگا پربت اور اس کے گرد و نواح کو ہر لحاظ سے جانچا پرکھا لیکن سراغ لگانے میں ناکام رہے۔ اس حادثے کو ایک سال گزر جانے کے بعد پوری قوم نے اس سانحے کا سوگ منایا اور متاثرہ خاندانوں کے غم میں برابر کے شریک ہوگئے۔ کسی کو یہ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ طیارے کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا!

جہاں اتنے مسافر اللہ تعالیٰ کو پیارے ہوئے ان کے ساتھ ساتھ نامی گرامی پائلٹ بھی دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ احسن آفتاب بلگرامی اور زبیر شمشاد جہاز اُڑانے میں اچھی خاصی مہارت رکھتے تھے۔ احسن آفتاب کو تو ۴ فروری ۱۹۸۶ء کو موت ایک بار ڈرا چکی تھی۔ تب وہ بال بال بچ گئے لیکن اب موت ان کو چھوڑنے والی نہیں تھی۔ ۴ فروری ۱۹۸۶ء کے دن احسن آفتاب کراچی سے اسلام آباد کی جانب رواں دواں تھے۔ کیپٹن سراج ان کے معاون ساتھی تھے۔ عملے کے دونوں رکن جہاز کے پہیے کھلنے والا گیئر لگانا اس وقت بھول گئے جب جہاز رن وے پر اتر رہا تھا۔ نتیجتاً جہاز خوش قسمتی سے تھوڑا بہت پھدک کر رک گیا۔ تمام مسافر محفوظ رہ گئے، کسی کے چوٹ تک نہ آئی۔

کیپٹن سراج بہت شرمندہ تھے۔ انھوں نے فوراً استعفا پیش کر دیا لیکن احسن آفتاب نے ایک نئے عزم کے ساتھ اپنی ملازمت کو جاری رکھا۔ اس واقعے کو ابھی تین برس ہی ہوئے تھے کہ یہ احسن آفتاب اپنے ہمراہ کئی اور لوگوں کو لے کر ہمیشہ کے لیے دنیا کی آنکھوں سے اوجھل ہوگئے۔ پاکستانی حکومت اور فوج آج تک ان کا سراغ لگانے میں ناکام ہیں۔

اس طیارہ حادثے نے مختلف نظریات، تجزیات، مباحثوں اور مغالطوں کو جنم دیا۔ کچھ ماہرین نے تو یہ نکتۂ نظر اپنایا کہ اس ساخت کے طیارے عموماً چھ ہزار میٹر کی بلندی پر پرواز کرتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ کسی فنی خرابی کے باعث گر کر تباہ ہوجائیں تو تمام ملبے کا ہوا میں تحلیل ہوجانا کوئی بڑی بات نہیں۔ وہ ملبہ اتنے چھوٹے چھوٹے ذرات میں تبدیل ہوجائے گا کہ اسے ڈھونڈنا ناممکن بن جائے۔ اس کے برعکس آرا کے مطابق اگر دنگا ہیں دوڑائی جائیں تو تمام الزام بھارت پر عائد ہوتا ہے۔

ان دنوں بھارتی حکومت کا رویہ اشتعال انگیز تھا اور وہ پاکستان کے خلاف طرح طرح کے اوچھے ہتھکنڈوں پر اُتری ہوئی تھی۔ زمینی زور آوری کے علاوہ فضائی نگرانی بھی کڑی تھی۔ اس حادثے کے چند سال بعد بھارتی فوج کے پاکستانی طیارے کو مار گرانے کے حوالے سے شواہد انٹرنیٹ پر بھی مل گئے تھے۔ ان میں نہ صرف طیارے کا ملبہ دکھایا گیا بلکہ یہ بھی بتایا گیا کہ جہاز وادی نیلم کے قریب دو مرتبہ لائن آف کنٹرول کے بالکل نزدیک آگیا تھا جہاں اسے بھارتی ایئر ڈیفنس سام میزائل (Indian Air Defense SAM) نے تباہ کر دیا تھا۔

ایسی خبروں کو کافی عرصے تک خفیہ رکھا گیا تاکہ پاکستانی عوام مشتعل نہ ہوں اور جنگ جیسی پیچیدہ صورتحال سے بچا جا سکے۔ پاکستانی حکومت نے اس کے خلاف بھرپور احتجاج کیا کیونکہ اب یہ خبر ٹی وی اور اخبارات کی زینت بن چکی تھی اور اسے چھپانا ناممکن تھا۔ یہ ۱۹۹۴ء کی بات ہے جب سچائی کھل کر سامنے آئی۔ یہی وجہ ہے کہ انھی دنوں راجیو گاندھی نے محترمہ بے نظیر بھٹو کو مذاکرات کی دعوت دی جو قبول کرلی گئی کیونکہ دونوں فریقین چاہتے تھے کہ حالات مزید بگڑنے سے پہلے سنبھال لیے جائیں۔ کہتے ہیں کہ خفیہ ایجنسیوں نے یہ خبریں خود ہی شائع کر دیں تاکہ آنے والے الیکشن میں

بے نظیر کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے۔ یہاں تک کہ "تکبیر" رسالے میں بھی طیارے کے ملبے کی تصاویر شائع ہو گئیں۔

یہ ۱۷ر ستمبر ۱۹۹۰ء کی بات ہے جب محترمہ بے نظیر ایک عام مسافر طیارے میں سوار ہوئیں اور ایک عجب خواہش کا اظہار کیا کہ وہ پائلٹ کے ساتھ بیٹھ کر سفر کرنا چاہتی ہیں۔ ان کو منع کیا گیا لیکن وہ ہنستے مسکراتے چہرے کے ساتھ پائلٹ کے پاس پہنچ گئیں۔ پہلے تو پائلٹ انھیں دیکھ کر کچھ گھبرایا پھر محترمہ سے کہا کہ وہ واپس جا کر اپنی نشست پر تشریف رکھیں لیکن محترمہ نے انکار کر دیا اور وہیں بیٹھ گئیں۔ اب پائلٹ اور محترمہ کے درمیان ہلکی پھلکی گپ شپ ہونے لگی۔ جب محترمہ سے پوچھا گیا کہ وہ کیا پینا پسند کریں گی تو انھوں نے جواب دیا "کافی"۔

کافی پینے کے دوران محترمہ نے معاون پائلٹ سے پوچھا کہ تباہ ہونے والے طیارے کا کچھ پتا چلا؟ پائلٹ نے بلا تاخیر بڑے زبردست طریقے سے گیند محترمہ کی طرف یہ کہتے ہوئے اچھال دی کہ آپ ہم سے بہتر جانتی ہیں، آپ ہمیں بتایئے؟ آکسفورڈ یونیورسٹی کی تعلیم یافتہ اور ذوالفقار علی بھٹو جیسے لیڈر کی ہستی پر خاموشی طاری ہو گئی...... ایسی خاموشی جس کے پیچھے داستان پنہاں ہو مگر کوئی اسے سنانے کو تیار نہیں تھا۔ کیپٹن کے اظہار خیال کے مطابق محترمہ شرمندہ تھیں اور پریشان بھی۔

طیارہ حادثے جیسی صورتحال کا سامنا ۱۹۸۹ء میں کرنا پڑا کہ تاحال ہم شواہد ڈھونڈنے سے قاصر ہیں۔ ایسی صورتحال بھارت کو ۱۲ر فروری ۱۹۶۹ء میں پیش آئی جب اینٹونو وا ین بارہ (Antonov An 12) طیارہ اچانک گر گیا۔ سالہا سال اس کا کوئی سراغ نہ ملا آخر ۲۰۰۳ء میں برف کی کئی تہوں میں چھپا اس کا ملبہ مل گیا۔

پاکستانی طیارے کے حوالے سے کئی افواہیں سرگرم تھیں کہ وہ اپنے مخصوص راستے سے ہٹ کر بہت دور نکل گیا تھا۔ اس بنا پر اُسے پاکستانی فوج نے ہی مار گرایا اور اسی بنا پر حقائق چھپا لیے گئے ہوں کیونکہ ایسا ممکن نہیں کہ بارہا سرچ آپریشن کیے جائیں اور شواہد نہ ملیں کیونکہ برمودہ ٹرائی اینگل تو وہاں تھا نہیں کہ طیارہ اس میں چلا گیا لہٰذا پتا نہیں چل سکا۔ بھارت کو الزام دینے کے لیے ہمارے ثبوت ناکافی تھے۔ اس کے باوجود ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم یاد رکھیں، پاکستان اور بھارت ایک دوسرے کا ایک مسافر طیارہ گرا چکے ہیں۔

۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران پاکستان نے بھارت کا ایک مسافر طیارہ تباہ کیا تھا۔ اس طیارے میں بھارتی ریاست گجرات کے وزیر، ان کی اہلیہ اور دیگر لوگ سفر کر رہے تھے۔ وہ سب موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے۔ اسی طرح ۱۹۶۷ء میں بھارت نے پاکستانی ایئرفورس کا ایک طیارہ تباہ کر دیا۔ وہ طیارہ ایک طالب علم اڑا رہا تھا۔ ابھی وہ سیکھنے کے مراحل میں تھا۔ اسے پتا ہی نہ چلا کہ وہ لائن آف کنٹرول کے قریب پہنچ گیا۔ بھارتی فوج نے اسے تباہ کر دیا۔ اس طیارے میں ایک طالب علم کے سوا کوئی دوسرا نہیں تھا۔

ان تمام معلومات کو مدِنظر رکھتے ہوئے پی آئی اے طیارہ حادثے کی گمشدگی کی مندرجہ ذیل وجوہ اخذ کرنا ممکن ہے:

☆ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب طیارہ تباہ ہوا تو اسے گلیشیئر نے فوری طور پر اپنی آغوش میں پناہ دے دی۔ اب نجانے کتنے سال بیت جائیں تباہ شدہ ملبہ ملنے میں۔

☆ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ فضا میں پھٹنے کی وجہ سے طیارے کے اجزا ہوا میں تحلیل ہوئے اور قراقرم کی وسیع و عریض چوٹیوں میں ذروں کی مانند گم ہو گئے۔

☆ تیسری اور حتمی بات یہ کہ طیارہ لائن آف کنٹرول کے قریب پہنچ گیا تھا لہٰذا بھارتی سورماؤں نے اسے مار گرایا۔ اس طیارے کا تمام ملبہ بھارت کی طرف گرا جس کی تصاویر نیٹ پر دکھائی گئیں اور تکبیر نامی رسالے میں شائع ہوئیں۔ اسی وجہ سے ہماری فوج اور حکومت، سرزمینِ پاکستان میں طیارہ تباہ ہونے کے شواہد ڈھونڈنے میں ناکام رہی۔

صالحہ محبوب

سرِ کا سائیں

ایک بیوی کا عجب ماجرا'
وہ اپنے مجرم شوہر کی رہائی چاہتی تھی

"ارے یہ کیا؟" گھر کے عین سامنے لان کو پانی لگانے والا نل کھلا دیکھ کر جس میں سے خوب زور شور سے پانی بہہ رہا تھا عظیم صاحب حیران ہوئے۔ پانی کا تیز بہاؤ لان اور اس کی گھاس کو جوہڑ بنا رہا تھا۔ کیاریاں پانی سے بھری پڑی تھیں۔ گھاس کے اوپر بھی پانی کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔ "خان! یہ پانی بند کرو"۔ انھوں نے فوراً ڈرائیور کو نل بند کرنے کی ہدایت کی۔

عظیم صاحب بیوی بچوں کے ہمراہ عیدالفطر کی چھٹیاں گزارنے اپنے آبائی علاقے گئے تھے۔ اب سارا دن سفر کے بعد گھر پہنچے تو مسلسل بہتا پانی عجیب شور کر رہا تھا۔ گھر پہنچنے پر ان کی بیگم اور بچے بھی آنکھیں ملتے، تھکے تھکے کار سے اتر آئے تھے۔

"صاحب، نل کی ٹونٹی غائب ہے۔ اب اِسے کیسے بند کریں؟" ڈرائیور خان محمد نے نلکے کا جائزہ لے کر صاحب سے پوچھا۔

"اچھا یوں کرو کوٹھی کے پیچھے جو پانی کا مین والو ہے، وہ بند کرو۔" صاحب کو دوسرا حل سوجھا۔

خان محمد پیچھے بھاگا جہاں پانی کا بڑا والو لگا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہاں سے بھی یہی جواب آیا۔ "صاحب والو بھی غائب ہے"۔ صحن کی طرف سے بھی مسلسل پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔

"صاحب! نلکے کے اندر کوئی چیز مثلاً کپڑا وغیرہ ٹھونس کر اوپر سے اینٹ رکھ کر دیکھتے ہیں"۔ خان محمد نے اپنا دیہاتی حل پیش کیا۔

"یار کچھ بھی کرو مگر پانی بند کر دو۔ سارا پانی یہاں ضائع ہو گیا تو اندر ضرورت کے لیے بھی پانی نہیں ملے گا"۔ صاحب اس غیر متوقع صورتحال سے پریشان تھے۔ بچے بھی اب پانی اور لان کا جائزہ لینے لگے تھے۔

"بابا! لان کا پائپ بھی غائب ہے"۔ حنان چلایا۔

''خان تم کوٹھی کے پیچھے جا کر دیکھو، اور کیا کیا غائب ہے اور بیگم آپ اندر جا کر دیکھیں، اندر کوئی نقصان تو نہیں ہوا''۔ عظیم صاحب کا ماتھا ٹھنکا۔

ریحانہ بیگم گھر کا تالا کھول کر باہر ہی کھڑی رہیں۔ اندر جانے سے ان کو خوف آ رہا تھا۔ عظیم صاحب ان کی ہچکچاہٹ بھانپ کر ساتھ ہو لیے۔ بچے بھی کچھ خوفزدہ سے تھے۔

بظاہر گھر کی تمام چیزیں اپنی جگہ پر ہی موجود تھیں۔ باری باری تمام کمروں میں جھانکا۔ اطمینان ہوا کہ اندر گھر میں خیریت ہے۔ اب بچے بھی اپنی اپنی چیزیں دیکھ رہے تھے۔ حنان میاں کو اپنی نئی سائیکل کی فکر ہوئی تو عبدالمنان کو اپنے کمپیوٹر کی۔ ریحانہ بیگم ٹی وی، اے سی اور تمام قیمتی اشیاء کو دیکھتیں اندر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔

عظیم صاحب پیچھے صحن کی طرف آن نکلے جہاں خان کو بھیجا تھا۔ ''صاحب جی، سارے پرنالوں کے آگے لگے لوہے کے پائپ غائب ہیں۔ اندر کی ٹونٹیاں بھی نہیں ہیں۔ صحن میں رکھی دونوں لوہے کی چارپائیاں بھی موجود نہیں''۔

عظیم صاحب کی نظر پانی کی موٹر پر پڑی۔ موٹر کے ساتھ ساتھ اس کا حفاظتی جنگلا بھی غائب تھا۔ خان چوری شدہ سامان کی تفصیل بتا رہا تھا۔

''بابا! میری نئی سائیکل''۔ حنان میاں باقاعدہ روتے روتے واپس آئے۔

کوٹھی کے صحن، گیراج اور لان کی حدود میں موجود تمام لوہے اور ربڑ کی اشیاء چوری ہو چکی تھیں۔ اندر باہر پانی بہہ کر تالاب کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ چور نے مہارت سے چیزوں کا صفایا کیا تھا۔ وہ یقیناً بہت فرصت سے آیا تھا۔ سکون سے ایک ایک قابلِ فروخت چیز سمیٹی اور صفائی سے لے گیا۔ وہ گھر کا بھیدی ہی معلوم ہوتا تھا کیونکہ اُسے ہر چیز کی مکمل معلومات تھیں۔ سرکاری کوٹھیوں پر کوئی انجان چور اتنی دیدہ دلیری سے واردات نہیں کر سکتا تھا۔

یہ سرکاری افسروں کی اے کلاس کوٹھیاں تھیں۔ جہاں عدلیہ اور انتظامیہ کے اعلیٰ افسر رہائش پزیر تھے۔ کالونی کی چار دیواری کے اوپر خاردار تاریں لگی تھیں۔ گیٹ پر سپاہی بھی موجود رہتے تھے۔ عید کی چھٹیوں میں تمام افسروں کی اپنے علاقوں میں روانگی کی وجہ سے کالونی تین چار دن خالی رہی تھی۔ چوکیدار بھی یقیناً عید منانے چلے گئے تھے اور پیچھے سے یہ واردات ہو گئی۔

عظیم صاحب اِس علاقے میں اسسٹنٹ کمشنر تعینات تھے۔ ان کے برابر والا بنگلہ سول جج کا تھا۔ سامنے کی کوٹھی تحصیلدار کی تھی تو ان کے برابر والی ڈی ایس پی کی۔ عظیم صاحب پریشانی کے عالم میں باہر جو نکلے تو سامنے تینوں پڑوسی حضرات بھی فکرمندی سے کھڑے تھے۔ سبھی کے گھروں میں بالکل ایک انداز کی چوری ہوئی تھی۔ وہی لوہے اور ربڑ کی تمام چیزیں غائب تھیں۔ ڈی ایس پی کے لان سے لوہے کی کرسیاں بھی غائب تھیں تو سول جج صاحب کی چارپائیاں اور پنکھا بھی۔ تحصیلدار کی کرسیوں کے ساتھ ساتھ باہر لگا لوہے کا چھوٹا روم کولر بھی۔ گیٹ پر تعینات سپاہی بھی آج ہی عید منا کر لوٹے تھے۔ سب ملازمین کا شبہ کالو جمعدار پر گیا۔ جو غائب تھا۔

اگلے دن کالو کے گھر پولیس بھیجی گئی۔ کالو غائب تھا۔ اس کی بیوی پولیس والوں کے ساتھ تھانے آ گئی۔ تیس چالیس سال کی مضبوط جسامت کی عورت شیداں۔ ساتھ اس کے چار بچے بھی تھے۔ تین تو بڑے تھے اور چوتھا اس نے گود میں اٹھا رکھا تھا۔

''بی بی! تم کالو کی گھر والی ہو؟'' ڈی ایس پی صاحب خود اس کیس کی تفتیش کر رہے تھے۔

''ہاں جی! میں شیداں۔ کالو کی گھر والی۔''

''کالو کدھر ہے؟'' ڈی ایس پی صاحب رعب سے بولے۔

''مجھے کیا پتا۔ عید سے پہلے کا غائب ہے صاحب۔ وہ گھر سے بھی ساری چیزیں گدھا گاڑی پر لے گیا تھا۔ میرے سارے پیسے، میرا چولہا، توا، پرات، دیگچی۔ میرے بچوں کو

بہت مارا اور مجھے بھی پھر گالیاں دیتا کہیں چلا گیا۔ صاحب چار دن سے ہم بھوکے پیاسے بیٹھے ہیں''۔ کالو کی بیوی تو خود بھری بیٹھی تھی۔

''سر جی! یہ سچ کہہ رہی ہے۔ اِس کے گھر میں کچھ نہیں''۔ اس عورت کے بیان کی تصدیق دونوں سپاہیوں نے کی۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ کالو نشہ کرتا ہے؟ اس کی یہ حرکت تو نشئیوں والی ہے''۔ ڈی ایس پی صاحب نے پوچھا۔

''ہیروئن تو نہیں لیکن سگریٹ پیتا ہے۔ جی اسے جوئے کا نشہ ہے۔ بس اس جوئے میں ہر چیز لگا دیتا ہے۔ ڈرتی ہوں کسی دن ان بچوں کو نہ جوئے میں ہار دے۔ میں خود محنت کرتی ہوں۔ بچوں سے کام کرواتی ہوں اور جو ہم کما کر لائیں وہ بھی چھین لیتا ہے۔ سرکاری ملازم ہے۔ اچھی بھلی تنخواہ ہو گی۔ مگر ہماری قسمت میں اس کی تنخواہ کہاں؟ ہمارے نصیبوں میں تو بس کالو کی مار اور طعنے ہیں''۔ شیداں روتے ہوئے بولی۔

''تم نے پہلے تو کبھی کوئی شکایت نہیں کی۔ اب اتنی مظلوم اور معصوم بن رہی ہو۔ میرے سامنے چالاکیاں مت کرو''۔ صاحب غرائے۔

''اب مجھے اور بچوں کو کالو مارے، ہمارے پیسے چھینے، ذلیل کرے تو ہم کس کو شکایت کریں؟ گھر کا مالک ہے ان بچوں کا باپ ہے۔ میرا خاوند ہے۔ بھلا کون ہماری بات سنتا ہے''۔ کالو کی بیوی روتے روتے بلکنے لگی۔

''سچ سچ بتاؤ اُس نے افسروں کے گھروں میں چوری کر کے سامان کہاں رکھا ہے؟'' اب تھانیدار ڈپٹ کر بولا۔

''گھر کچھ نہیں لایا۔ گدھا گاڑی پر سامان ضرور ہم نے دیکھا تھا۔ چارپائیاں، کولر، کرسیاں، مگر وہ تو ہمارا سامان بھی اٹھا کر لے گیا، توا، پرات، چمٹا اور دیگچی''۔ کالو کی بیوی کو ساری فکر اپنے برتنوں کی تھی۔

''کہاں جاتا تھا وہ جوا کھیلنے؟ اس کے دوستوں کے نام بتاؤ''۔ اب تھانیدار سختی سے بولا۔

''پتا نہیں جی۔ کدھر جاتا تھا اور کس کے ساتھ کھیلتا تھا لیکن تنخواہ ہماری آتی یا اس کی، پیسے گھر آنا ہمارے نصیب میں نہیں تھا۔ بڑا ظالم آدمی ہے یہ۔ بس اپنی اور ان گندے کاموں کی فکر ہوتی ہے۔ بچے بھوکے ہوں اُسے کوئی فکر نہیں''۔ شیداں کی شکایتیں پھر شروع ہو گئیں۔

''اچھا اچھا..... اگر وہ گھر آئے تو تھانے اطلاع دینا''۔ ڈی ایس پی صاحب نے اسے جانے کی اجازت دیتے ہوئے تاکید کی۔

''صاحب اگر اسے پکڑ لو تو چھوڑنا نہیں۔ وہ ہم سب کے لیے مصیبت ہے۔ چوری کرتا ہے، غنڈہ گردی کرتا ہے، جوا کھیلتا ہے۔ میرے معصوم بچوں کو مارتا پیٹتا ہے۔ میرا جوڑ جوڑ اس کی مار کی وجہ سے دکھتا ہے۔ میرے برتن بیچ کر کھا گیا۔ اس کا گلہ نہ رہے۔ اسے لمبی سزا دینا۔ اللہ تمہارا بھلا کرے''۔ کالو کی بیوی اُسے گالیاں دیتی، برا بھلا کہتی، اپنے نقصان اور زخموں کو یاد کرتی چلی گئی۔

''سر، دو چار دن عیش کر کے وہ واپس آ جائے گا۔ ہم اُسے ضرور پکڑ لیں گے''۔ تھانیدار صاحب نے ڈی ایس پی کو تسلی دی۔ اِس چوری پر سب ہی حیران اور شرمندہ تھے کہ پولیس، قانون اور انتظامیہ سب کا نقصان ہوا اور جگ ہنسائی بھی۔

کالو صاحب اگلے ہی روز گرفتار ہو گئے۔ موصوف بغل میں جھاڑو دبائے، کانوں میں ہینڈ فری لگائے کالونی کی سڑک پر جھومتے ہوئے پائے گئے۔ گیٹ کے چوکیداروں نے پولیس کو اطلاع دی اور پولیس نے آ کر کالو کو گرفتار کر لیا۔

شروع میں کالو نے چوری سے انکار کیا مگر عینی شاہدین، گدھا گاڑی والے کے بیان اور پولیس تشدد کے محض ڈراوے پر ہی چوری قبول کر لی۔ جوئے میں خطیر رقم ہارنے کے بعد موصوف نے خالی کوٹھیوں کا جائزہ لیا تھا۔ تسلی سے تمام قابلِ فروخت اشیاء اکٹھی کیں۔ عید کے روز گیٹ خالی دیکھ کر گدھا گاڑی لے کر آئے۔ سامان لوڈ کیا اور پھر جا کر شہر میں بیچ دیا۔ پیسے پھر بھی پورے نہ ہونے پر اپنے گھر سے بھی برتن اٹھانے پڑے۔

''اس کی ضمانت نہیں ہونی چاہیے۔ کم از کم ایک سال جیل میں رہے گا، تو طبیعت صاف ہو جائے گی''۔ تحصیلدار صاحب نے تجویز پیش کی۔ ان کی دیگر اشیاء کے ساتھ ساتھ روم کولر بھی اس کمبخت نے چوری کیا تھا۔

''اس چوری کی جو زیادہ سے زیادہ سزا ہے، میں اسے پوری دوں گا تا کہ آئندہ کسی کو سرکار کی چوری کی ہمت نہ ہو''۔ سول جج صاحب نے بھی غصہ نکالا۔

قانونی کارروائی پوری کی گئی اور کالو کو جیل بھیج دیا گیا۔ سرکاری افسروں کی کوٹھیوں کی چوری شدہ اشیاء پھر سے لگا دی گئیں۔ دیگر سامان بھی نیا آ گیا۔ کالونی کی حفاظت کے لیے پہرے دار بھی بڑھا دیے گئے۔ شام کو اکثر اہل محلہ باہر مشترکہ سڑک پر چہل قدمی کرتے۔ بچے سائیکل چلاتے۔ افسر گپ شپ کرتے۔ بقر عید کی آمد آمد تھی۔ سو سب بچے اپنے اپنے بکرے لے کر باہر نکلے ہوئے تھے۔ سب مرد حضرات بچوں اور بکروں پر نظر رکھنے کے لیے باہر کرسیوں پر بیٹھے تھے۔

''صاحب جی، کالو کی بیوی آپ سے ملنا چاہتی ہے''۔ کالونی کے گارڈ نے اطلاع دی۔

''کیوں.....؟ کیا اُس منحوس کالو کی سزا ختم ہو گئی؟'' ڈی ایس پی چونکے۔

''نہیں ابھی تو دو ماہ ہوئے ہیں۔ ابھی تو جیل ہی میں ہو گا''۔ سول جج صاحب نے ان کی تردید کی۔

''پھر وہ کیوں ملنا چاہتی ہے؟'' اسسٹنٹ کمشنر نے سوال کیا۔

''اچھا بھیجو اسے''۔ تحصیلدار صاحب نے گارڈ کو حکم دیا۔

''کالو کے بیوی بچے اس سے بہت تنگ تھے۔ خوب مارتا پیٹتا تھا۔ خرچا بھی نہیں دیتا تھا''۔ ڈی ایس پی کو شیدا اں کے بین اور شکایتیں یاد آئیں۔

''اب تو اس کی بیوی بچے بھی سکون سے ہوں گے۔ سنا ہے دو تین کوٹھیوں پر کام کرتی ہے۔ سب بچے بھی کام کرتے ہیں۔ اچھا بھلا کما لیتے ہیں''۔ تحصیلدار کو بھی خاصی معلومات تھیں۔

''سلام صاحب''۔ کالو کی بیوی اپنے بچوں کے ساتھ آ گئی۔

''وعلیکم السلام۔ کیا بات ہے؟ بچے تو ٹھیک ہیں؟'' عظیم صاحب نرمی سے بولے۔

''صاحب آپ سے ایک درخواست کرنی تھی۔ ان کے ابا کی ضمانت کروا دو۔ دو مہینوں میں وہ ٹھیک ہو گیا ہو گا۔ اب اسے چھوڑ دو''۔ شیدا اں ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔

''وہ چور، جواری، ظالم آدمی۔ سب کا اتنا نقصان کر کے بھاگا۔ تم سب کو بھی مارتا تھا۔ خرچہ نہیں دیتا تھا۔ اب جیل گیا ہے تو وہیں پڑا رہنے دو۔ طبیعت صاف ہونے دو۔ تمہیں کیا تکلیف ہے؟ تم اپنا کماتی کھاتی رہو''۔ سول جج صاحب بولے۔

''صاحب، سولہ آنے سچی بات ہے۔ وہ سب کچھ کرتا ہے۔ ہمیں مارتا ہے، خرچا نہیں دیتا، گھر کی چیزیں بیچ آتا ہے۔ چور بھی ہے، جواری بھی ہے لیکن صاحب جی! میرے سر کا سائیں ہے۔ ان بچوں کا باپ ہے''۔ شیدا اں رونے لگی۔

کالو کی بیوی رو رہی تھی اور اب اس کے آنسوؤں سسکیوں اور آہوں سے زیادہ رواں تھے جو اُس سے پٹنے اور لٹنے کے بعد شکایت لگاتے وقت وہ بہا رہی تھی۔

''صاحب، اس کی ضمانت منظور کر لو۔ اُسے گھر آنے دو''۔ وہ بار بار التجا کر رہی تھی۔

چاروں افسر اس عورت کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اس کی یہ فریاد اُن کے لیے بہت ہی حیران کن تھی۔ یار یہ کیسے آزاد ہو سکتی ہے؟ جب اس کے ظالم کو ظلم ہی نہیں سمجھ رہی۔ غلط کو غلط نہیں کہہ رہی۔ کمال ہے کہ چور بھی ہے، جواری بھی ہے مگر سر کا سائیں ہے۔

وہ چاروں افسوس اور حیرت سے اس روتی کرلاتی عورت کو دیکھ رہے تھے جو مظلوم تھی مگر محبت اور دل کے ہاتھوں بے بس بھی۔

''صاحب، میرے سر کے سائیں کو چھوڑ دو''۔ دور سے واپس جاتے ہوئے بھی اس کی فریاد سنائی دے رہی تھی۔ ◆◆◆

انکشافات

سید عاصم محمود

یہود کے ان مذہبی نظریات کا حیران کن قصہ جن کی بنا پر وہ مسلمانان عالم کے تیسرے محبوب و محترم مقام حرم الشریف کو شہید کرنے کے درپے ہو گئے

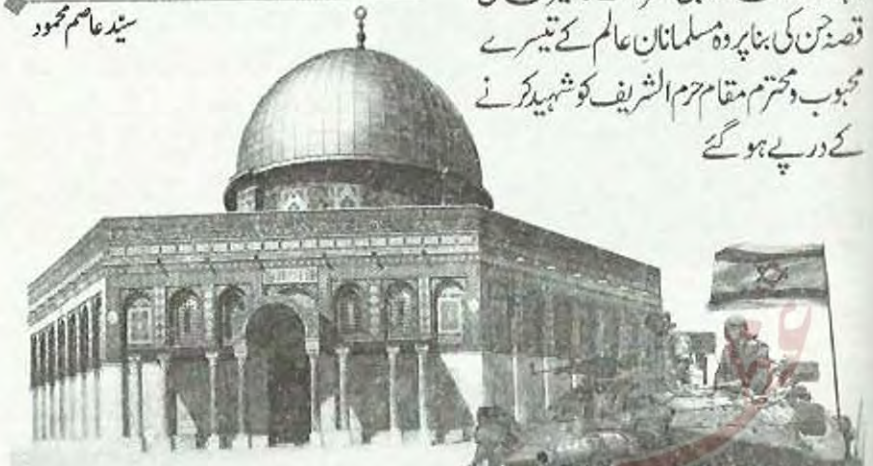

مسلمانوں کا مقدس مقام مسجدِ اقصیٰ خطرے میں

یہ ۶۳۸ء کی بات ہے، اسلامی فوج نے فلسطین کا صدر مقام بیت المقدس فتح کر لیا۔ اس فتح کی عظمت کا اندازہ یوں لگائیے کہ خلیفہ دوم، حضرت عمرؓ بن خطاب بنفس نفیس شہر کی چابیاں لینے القدس شریف تشریف لے گئے تھے۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ خلیفہ راشد دوم جب شہر میں داخل ہوئے، تو غلام اونٹ پر بیٹھا تھا کیونکہ بیٹھنے کی باری اس کی تھی۔ اللہ اللہ، وہ کیا منظر ہو گا کہ عظیم اسلامی سلطنت کے فرماں روا اونٹ کی مہار تھامے چل رہے ہیں۔ آج کے اسلامی حکمرانوں کے لیے اس واقعہ میں یہ اہم سبق پوشیدہ ہے کہ حکومت و سطوت عوام کی خدمت کے لیے ملتی ہے نہ کہ آرام و آسائش سے زندگی بسر کرنے کی خاطر!

حضرت عمر فاروقؓ سیدھے اس مقدس جگہ تشریف لے

گئے جہاں سے نبی کریم ﷺ لیلۃ القدر کی رات عرش عظیم پر باری تعالیٰ کے عالی شان مظاہر دیکھنے تشریف لے گئے تھے۔ وہ پہاڑی جگہ کوڑے کرکٹ سے آلودہ تھی۔ خلیفہ دوم کو یہ دیکھ کر بہت رنج پہنچا۔ آپؓ نے اُسے صاف کرنے کا حکم دیا۔ یہی نہیں، حضرت عمر فاروقؓ نے اس کی صفائی میں بھی حصہ لیا۔

جب وہ بلند مقام پاک و منزہ ہو چکا، تو اس کے جنوبی حصے پر خلیفہ راشد دوم نے ایک مسجد تعمیر کروائی۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ اس مسجد کی تعمیر میں یہود نے بھی حصہ لیا تھا۔ وجہ یہ کہ وہ اس مقام کو مذہبی لحاظ سے مقدس ترین سمجھتے تھے۔

حضرت عمر فاروقؓ کے ہمراہ نومسلم صحابی، حضرت کعب الاحبارؓ بھی مکہ مکرمہ سے آئے تھے۔ وہ سابقہ یہودی تھے۔ انھوں نے اس چٹان کی نشان دہی کی جہاں سے حضور اکرم ﷺ کی مبارک سواری (براق) نے اڑان بھری تھی۔ یہ چٹان عربی میں ''صخرہ'' کہلائی۔ ۶۹۱ء میں اسی چٹان کے اوپر اموی خلیفہ عبدالملک نے ایک گنبد تعمیر کروادیا۔ وہ اب ''قبۃ صخرہ'' کہلاتا ہے۔

۷۱۵ء میں ایک اور اموی خلیفہ، ولید اول نے بیت المقدس کے اسی بلند مقام پر ایک مسجد تعمیر کروادی۔ آج یہ مبارک جگہ ''مسجد اقصیٰ'' کہلاتی ہے۔ عالم اسلام میں یہ بلند، پہاڑی نما جگہ ''حرم شریف'' کے نام سے مشہور ہوئی۔

۶ دسمبر ۲۰۱۷ء کو جب امریکی صدر، ڈونلڈ ٹرمپ نے اعلان کیا کہ وہ بیت المقدس کو اسرائیل کے دارالحکومت کی حیثیت سے تسلیم کررہے ہیں، تو پوری دنیا خصوصاً عالم اسلام میں ہلچل مچ گئی۔ وجہ یہی کہ اسراء و معراج نبوی ﷺ کے باعث حرم شریف کو اسلامی دنیا میں خانہ کعبہ اور مسجد نبوی

گنبد صخرہ کے نیچے واقع چٹان۔ مسلمان کہتے ہیں کہ اسی پر سے معراج نبویؐ کا آغاز ہوا تھا۔ یہود کا دعویٰ ہے کہ اس چٹان پر یہوہ (خدا) نے جلوہ دکھایا تھا۔

ﷺ کے بعد تیسری مقدس ترین جگہ سمجھا جاتا ہے۔ مسلمانان عالم کسی صورت یہ منظور نہیں کرسکتے کہ حرم شریف مسلمانوں کی قاتل اسرائیلی حکومت کے قبضے میں چلا جائے۔

ڈونلڈ ٹرمپ کے اس اشتعال انگیز اعلان پر تمام اسلامی ممالک میں امریکی صدر اور امریکا کے خلاف مظاہرے ہونے لگے۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ اس اعلان نے تمام مسلمانوں کو یکجا و متحد کردیا اور وہ مل کر امریکا و اسرائیل کے خلاف مظاہرے کرنے لگے۔

مگر کم ہی لوگ جانتے ہیں کہ اس ناروا اعلان کا حرم شریف سے مذہبی طور پر نہایت گہرا تعلق ہے۔ اس تعلق کی داستان نہایت ڈرامائی اور عجیب و غریب ہے۔ یہ عیاں کرتی ہے کہ ماضی کے دشمن..... یہود اور عیسائی رفتہ رفتہ ایک دوسرے کے دوست کیوں کر بن گئے۔ آج تو عیسائیوں کا ایک بڑا فرقہ یہود کے ساتھ مل کر اسلامی دنیا کے خلاف صف آرا ہو چکا۔

یہود کے دو معبد

کتب مؤرخین کے مطابق زمانہ قدیم میں حرم شریف کا

علاقہ ایک کنعانی باشندے کی ملکیت تھا۔ جب یہود حضرت موسیٰ کی زیر قیادت مصر سے فلسطین میں آئے، تو یہی کنعانی بیت المقدس میں آباد تھے۔ یہود نے کنعانی سے حرم شریف کا مقام اونے پونے داموں خرید لیا۔

یہود نے پھر حرم شریف کی پہاڑی پر صخرہ کے گرد ایک خیمہ تعمیر کرلیا۔ اس خیمے میں چٹان کے قریب ہی تابوت سکینہ رکھا گیا۔ روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو جو دس احکامات عطا فرمائے تھے، وہ اسی تابوت میں ایک لوح پر درج موجود تھے۔ مزید برآں یہود میں یہ بھی مشہور ہوگیا کہ ان کے خدا، یہوہ صخرہ پر جلوہ افروز ہوئے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ صخرہ چٹان یہود کے نزدیک مقدس ترین مذہبی مقام بن گیا۔ وہ اس کو ''قدس القدس'' (Holy of Holies) کہتے ہیں۔ اسی مقام پر حضرت سلیمانؑ نے ایک معبد تعمیر کروایا جسے یہود اپنا ''پہلا ٹیمپل، ہیکل یا معبد'' قرار دیتے ہیں۔ اس معبد کی تعمیر کے بعد یہ پہاڑی مقام یہودیوں میں ''ہربیات'' (Har HaBayit) کہلانے لگا۔

یہودی مورخین کی رو سے پہلا معبد ۹۵۷ قبل مسیح میں تعمیر ہوا تھا۔ اس پر مصریوں اور اشوریوں نے حملہ کرکے اُسے نقصان پہنچایا۔ ۵۸۶ ق م میں بابل کی فوج نے اُسے مکمل طور پر تباہ کردیا۔

۵۳۸ ق م میں ایران کے مشہور بادشاہ، سائرس اعظم نے یہود کو حرم شریف میں ''دوسرا معبد'' تعمیر کرنے کی اجازت دے دی۔ ۷۰ء میں جب روم کی فوج نے بیت المقدس پر حملہ کیا، تو اس نے یہود کا دوسرا معبد بھی تباہ و برباد کردیا۔

اس وقت تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام جنم لے چکے تھے جن کی ساری عمر بیت المقدس ہی میں گزری۔ جب حضرت عیسیٰؑ تولد ہوئے، تو یہود راہ حق سے ہٹ چکے تھے۔ بت پرستوں اور دیگر کافر اقوام کے بہت سے رسوم و رواج ان میں در آئے تھے۔ اس لیے حضرت عیسیٰؑ نے یہود کی کافرانہ روایات کے خلاف مہم چلائی، تو یہودی ان کے مخالف بن گئے۔ یہود کی سازشوں کے باعث آخر کار حضرت عیسیٰؑ مصلوب کردیے گئے۔

اس زمانے کے عیسائی بجا طور پر سمجھتے تھے کہ یہود کے گناہوں اور غلط کاریوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے رومیوں سے ''دوسرا معبد'' تباہ کروادیا۔ اس فعل کو یہودیت کے خلاف عیسائیت کی فتح بھی سمجھا گیا۔

جب عیسائیت کا بول بالا ہوا، تو بعض عیسائی ''ہربیات'' میں کوڑا کرکٹ پھینک کر یہود سے اظہار نفرت کرنے لگے۔ چونکہ اب عیسائی بادشاہوں کی حکومت تھی لہٰذا بیت المقدس میں مقیم یہودی عیسائیوں کی یہ حرکت دیکھ کے خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے اور ان کے خلاف کوئی ٹھوس قدم نہ اٹھا پاتے۔

۶۱۴ء میں ایرانی فوج نے بیت المقدس پر دھاوا بول دیا۔ ایرانیوں نے کئی چرچ نذر آتش کرڈالے نیز بیت المقدس سے تمام یہود کو باہر نکال دیا۔ یہی نہیں، ان کی شہر آمد پر بھی پابندی لگادی۔ اس ایرانی حکومت ہی میں باشندگان بیت المقدس نے ''ہربیات'' کو کوڑے دان کی شکل دے دی۔ اب عیسائی رعایا اور ایرانی حاکم، دونوں کا کوڑا اس جگہ پھینکا جانے لگا۔

یہود و نصاریٰ سے مسلمانوں کا سلوک

۶۳۸ء کے لگ بھگ بیت المقدس کو اسلامی فوج نے فتح کرلیا۔ تب یہود کو بھی نہ صرف شہر میں دوبارہ داخل ہونے بلکہ بس جانے کی بھی اجازت دے دی گئی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ''ہربیات'' کی صفائی کروائی، اُسے پاک صاف کیا اور وہاں لکڑی سے بنی ایک مسجد تعمیر کروادی۔ یوں وہ مقام دوبارہ

منزہ و مبارک بن گیا اور کیوں نہ ہوتا؟ مسلمان سمجھتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے وہاں پہلا معبد نہیں پہلی مسجد تعمیر فرمائی تھی۔ پھر معراج نبوی ﷺ کے بعد تو وہ مقام مسلمانان عالم کے لیے انتہائی مقدس بن گیا۔ نبی کریم ﷺ چند ماہ حرم شریف کی طرف رخ کر کے نماز بھی ادا فرماتے رہے۔

جب مسلمانوں نے بیت المقدس فتح کیا، تو وہ وہاں آباد تمام عیسائیوں اور دیگر اقوام کے ساتھ عزت و احترام کے ساتھ پیش آئے تھے لیکن مستقبل میں کلیسائے روم کے پوپ سیاسی و ذاتی مفادات پورے کرنے کی خاطر عالم اسلام کے مخالف بن گئے۔ انھوں نے پھر عیسائی دنیا کو مسلمانوں سے لڑنے کے لیے ابھارا۔ نتیجتاً صلیبی جنگیں لڑی گئیں۔ جب بھی عیسائی بیت المقدس پر قابض ہوتے، تو وہاں مقیم مسلمانوں پہ نہایت ظلم توڑتے اور خون کی ندیاں بہا دیتے۔ اس زمانے کی لرزہ خیز داستانیں کتب تاریخ میں محفوظ ہیں۔

کتب تاریخ یہ شہادت بھی دیتی ہیں کہ جب عیسائی دنیا میں یہود کو معتوب و معطون کیا جارہا تھا، تو عالم اسلام میں ہی انھیں پناہ ملی۔ خاص طور پر اندلس میں یہود کے ساتھ بہت اچھا سلوک ہوا۔ اندلسی حکمرانوں نے اپنے درباروں میں یہود کو اعلیٰ عہدے دیے اور وہ آسائشوں سے پُر زندگی بسر کرنے لگے لیکن یہ یہود احسان فراموش نکلے اور آج مسلمانوں کے دشمن بن چکے۔ جدید دور کی مشہور عیسائی مصنفہ، کیرن آرم سٹرانگ اپنی کتاب ''یروشلم ایک شہر، تین مذاہب'' میں لکھتی ہیں:

(بقیہ صفحہ نمبر ۲۲۵ پر)

یہود کے تیسرے معبد کا ڈیزائن

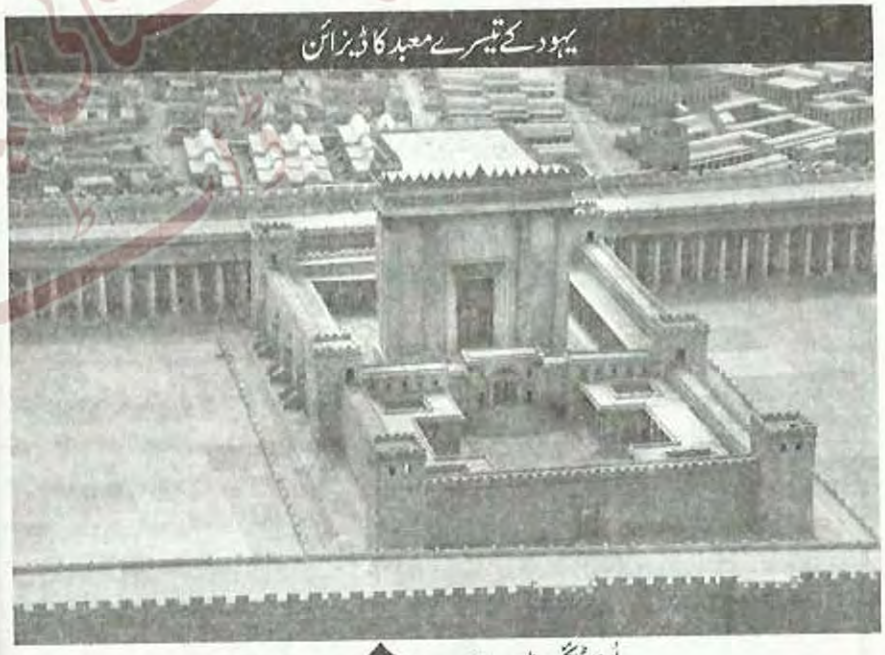

تازہ افسانہ

قاضی شارق محمود

ہاں

ایک نوجوان کہانی کار کا دلفریب قصہ، اُسے آئیڈیل بیوی کی تلاش تھی

روشینہ کی پیدائش لالہ موسیٰ میں ہوئی۔ اُس نے اسی شہر سے اپنی تعلیم کا آغاز کیا تھا اور ابھی پچھلے سال ہی بی اے کا امتحان بڑے شاندار نمبروں سے پاس کیا۔ اب اُس کا ارادہ اُردو ادب میں ایم اے کرنے کا تھا، روشینہ کو اپنے شہر سے بہت محبت تھی۔ شہر میں اُس کے بہت سے رشتے دار تھے اور بہت اچھی اچھی سہیلیاں بھی۔ لہٰذا جب اُسے اچانک پتا چلا کہ اُس کے ابو صفدر حیات جو ایک سرکاری ملازم تھے، کا تبادلہ کراچی کر دیا گیا ہے اور اب چند روز بعد کراچی روانگی ہے تو اُسے کافی دکھ ہوا۔

روشینہ ایک حقیقت پسند لڑکی تھی۔ اُس کے دل کی محبتیں محدود نہیں بلکہ لامحدود تھیں لہٰذا اُس نے جلد ہی نئی صورتحال کو قبول کر لیا۔ اُسے اپنا شہر چھوڑنے کا رنج تو تھا لیکن اب ملک کے سب سے بڑے شہر میں جانے کی خوشی بھی اُس کے دل میں پیدا ہوئی۔ پھر جب اُس نے اِس سلسلے میں کچھ اور بھی سنجیدگی سے سوچا تو اُسے کراچی جانے کا موقع ملنا اپنے حق میں بہت بہتر ہی لگا۔

وہ بہت مطمئن ہو کر اپنے ابو کے پاس پہنچی اور انتہائی خوش دلی سے مسکراتے ہوئے بولی، ''ابو سچی بات یہ ہے کہ میں شروع میں یہ بات سُن کر پریشان ہو گئی تھی کہ آپ کا تبادلہ کراچی ہو گیا ہے لیکن اب میری سوچ تبدیل ہو چکی۔ آپ یہ بات بالکل صحیح کہتے ہیں کہ اللہ جو کرتا ہے وہ اچھا ہی کرتا ہے۔ کراچی جانے میں مجھے یہ بڑا فائدہ نظر آ رہا ہے کہ میں

وہاں جا کر اُردو ادب میں ایم اے بآسانی کرلوں گی۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ یہ میرا بہت بڑا خواب ہے۔ ہاں البتہ وہاں جانے سے ہمارا بڑا نقصان یہ ہے کہ ہم اپنے رشتے داروں سے بچھڑ جائیں گے اور میں اپنی بہت اچھی اچھی سہیلیوں سے جدا ہو جاؤں گی۔ میرا خیال ہے کراچی میں تو ہمارا ایک بھی رشتے دار موجود نہیں، کیوں! ایسا ہی ہے ناں ابو؟''

''نہیں بیٹی، ہمارے وہاں بھی کئی رشتے دار موجود ہیں، بس ذرا دور کے ہیں۔ میرے دو تایا زاد بھائی اور ایک خالہ زاد بہن وہاں رہتی ہے۔ تمہاری امی کی دو خالہ زاد بہنیں بھی وہاں رہتی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میرا ایک انتہائی پیارا اور سب سے قریبی دوست راشد کمال وہاں مقیم ہے۔ یہ جو تم مجھے اکثر موبائل فون پر بہت دیر تک باتیں کرتا دیکھتی اور اکثر ہنس کر کہتی ہو کہ واہ! ابو آپ نے تو عورتوں کو بھی مات کر دیا، فون پر اتنی لمبی لمبی باتیں۔ تو بیٹی یہ میرا وہی دوست راشد کمال ہے''۔

''میرا یہ دوست انتہائی مخلص اور بہت محبت کرنے والا انسان ہے۔ تمہیں اس سے مل کر یقیناً بہت خوشی ہوگی اور ہاں، خاص بات یہ کہ اس کا ایک بیٹا ارشد کمال افسانہ نگار ہے۔ اس کے افسانے رسائل میں چھپتے رہتے ہیں۔ میں نے بھی اس کے کافی افسانے پڑھے ہیں۔ کمال کے افسانے ہیں۔''

''واہ ابو! حد ہوگئی۔ آپ کے سب سے قریبی دوست کا بیٹا ایک افسانہ نگار ہے اور آپ نے مجھے بتایا تک نہیں۔ اچھا اب آپ کم از کم اتنا کیجیے کہ مجھے چند ایسے میگزین لا دیجیے جن میں ارشد کمال کے افسانے ہوں۔ میں بھی تو دیکھوں کہ یہ صاحب کیسا لکھتے ہیں''۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ میں تمہیں ایسے چند میگزین لا دوں گا''۔ ابھی صفدر حیات صاحب نے یہ جملہ مکمل کیا ہی تھا کہ اُن کی بیگم نادرہ حیات چائے کی ٹرے ہاتھوں میں اُٹھائے کمرے میں داخل ہوئیں اور آتے ہی بولیں:

''یہ باپ بیٹی میں کون سے میگزین کی بات ہو رہی ہے ذرا میں بھی تو سنوں۔''

صفدر حیات صاحب نے ایک گہری نظر بیگم پر ڈالی پھر مسکراتے ہوئے بولے ''اُن میگزین کی جن میں ارشد کمال کے افسانے چھپے ہیں۔ میرا خیال ہے تم نے بھی اُس کے دو تین افسانے پڑھے ہیں۔''

''دو تین نہیں صرف ایک، وہ بھی آپ کے کہنے پر پڑھا تھا۔ ورنہ مجھے تو افسانوں سے دلچسپی ہے نہ ہی افسانہ نگاروں سے۔ اپنے پاس سے جانے کیا، کیا اُول فول لکھتے رہتے ہیں۔ فحش کا مادہ ان میں بھرا ہوا ہوتا ہے۔ ہر گھڑی اس تاک میں رہتے ہیں کہ کہیں سے کوئی پلاٹ ہاتھ آجائے اور یہ افسانہ لکھنے بیٹھیں۔ میری بیٹی کو ان افسانہ نگاروں سے بچا کر ہی رکھیں تو بہتر ہے۔ بھلا بیٹی کے سامنے اس ارشد کمال کا تذکرہ کرنے کی ایسی کیا ضرورت پیش آئی۔''

''بھئی ہم کراچی جا رہے ہیں تو ظاہر ہے وہاں کے دوست احباب سے ملنے ملانے کا سلسلہ لازماً رہے گا۔ تمہیں معلوم نہیں راشد میرا کتنا گہرا دوست ہے۔ ارشد راشد کا بیٹا ہے تو اُس کا تذکرہ آنا ہی تھا۔ ویسے بھی روشینہ اُردو ادب میں ماسٹرز کرنے کا کہہ رہی ہے لہٰذا افسانہ نگاروں سے بچنا کسی صورت ممکن ہی نہیں۔''

''بس بس، رہنے دیں۔ اب ماسٹرز واسٹرز کچھ نہیں ہوگا۔ بہت ہوگئی پڑھائی اب اس کی شادی ہوگی۔ اس نے مزید پڑھنا ہے تو اپنے گھر جا کر پڑھے۔ ہم نے جو پڑھانا تھا پڑھا لیا۔ اب شوہر کی مرضی ہے کہ آگے پڑھنے کی اجازت دے یا نہ دے۔ میں پاگل نہیں کہ اس کے ایم اے کرنے کا انتظار کروں۔ لڑکی کی شادی کی یہی عمر ہوتی ہے۔ اس عمر کے بعد لڑکی کے چہرے کی چمک دمک بڑھتی نہیں ماند ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ جیسے ہی مناسب رشتہ آیا میں فوراً ہی ہاں کر دوں گی۔ پہلے آپ بھی تو اس سلسلے میں مجھ سے پوری طرح متفق

تھے پھر یہ ایم اے کا تذکرہ کہاں سے لے آئے۔''

''ارے بابا..... ٹھیک ہے، لیکن کوئی مناسب رشتہ آئے تب نا۔ جب تک شادی نہیں ہوتی اگر لڑکی پڑھتی رہے تو یہی مناسب ہے۔ یہ جو تم افسانہ نگاروں میں تجسس کی بات کر رہی تھیں تو یہ مادہ تو تم میں بھی بہت ہے۔ اگر نہیں تو آج صبح ہی صبح جب گلی میں شور مچا تو تم جھٹ سے دروازہ کھول کر کیا دیکھ رہی تھیں۔ پھر ابھی دو گھنٹے قبل مجھ سے یہ کیوں کہہ رہی تھیں کہ لگتا ہے قربان بھائی اور اُن کی بیگم میں آج کل بڑی کھٹ پٹ چل رہی ہے۔ بار بار اپنے میکے جا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ آپ کی تو قربان بھائی سے بہت دوستی ہے۔ ذرا پتا تو کریں، اصل مسئلہ کیا ہے۔ آج ہی فہمیدہ کے بارے میں کہہ رہی تھیں کہ دیکھ لیجیے گا، یہ فہمیدہ بیاہ کر اپنے سسرال چلی تو گئی ہے لیکن اس کا وہاں پر گزارہ ہونا بہت مشکل ہے۔ میرا تو خیال ہے یہ زیادہ سے زیادہ ایک ماہ بعد ہی اپنے گھر آ بیٹھے گی اور کل رات.....''

''بس..... بس..... اب چپ بھی کریں۔ آپ تو ہر بات کو پکڑ لیتے ہیں۔ باتوں میں بھلا آپ سے کون جیت سکتا ہے۔ یہ سب چھوڑیں مجھے آپ یہ بتائیں کہ کراچی جانے میں اب کتنے روز باقی ہیں۔''

☆☆☆

اگلے دن صفدر حیات صاحب ایسے سات رسالے لے آئے تھے جن میں ارشد کمال کے افسانے شائع ہوئے تھے۔ انھوں نے پہلے افسانوں کو خود پڑھا پھر روشینہ کے حوالے کر دیے۔ ان افسانوں میں رومانس تو تھا لیکن ایک طریقے اور سلیقے کے ساتھ۔ کسی قسم کی کوئی بیہودگی نہیں تھی۔ ساتوں افسانوں کا پلاٹ بے حد دلچسپ تھا اور افسانوں کی سب سے اچھی بات یہ تھی کہ ان سب میں ہر انسان کے لیے ایک اچھا سبق موجود تھا۔ روشینہ نے ان ساتوں افسانوں کو بڑی توجہ سے پڑھا۔ دو دن تک اُس نے اپنے ابو سے ان افسانوں کے بارے میں کوئی بات نہیں کی لیکن تیسرے دن وہ ایک کاپی اُٹھائے اپنے ابو کے پاس پہنچی اور بے تحاشا ہنستے ہوئے بڑی شوخی سے بولی۔

''ابو ویسے تو ارشد کمال کے افسانے بہت اچھے ہیں۔ ہر افسانہ پڑھنے والے کو ایک اچھا سبق دیتا ہے۔ ابو ہر افسانے کا کم از کم ایک پیراگراف ایسا ہے جو حقائق کے بالکل برعکس ہے۔ مجھے تو لگتا ہے، ارشد کمال صاحب اپنے افسانوں کا یہ پیراگراف لکھتے ہوئے بالکل ہی اپنے خوابوں کی دنیا میں کھو جاتے ہیں۔ حقائق کی دنیا سے کچھ دیر کے لیے اپنا رابطہ بالکل ہی معطل کر لیتے ہیں۔''

''اچھا..... یہ بات ہے! ذرا ہمیں بھی تو بتاؤ وہ کون سے پیراگراف ہیں؟'' صفدر حیات صاحب نے بڑے اشتیاق سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''جی ابو بالکل۔ میں یہ پیراگراف آپ کو پڑھ کر سناتی ہوں۔ یہ بڑی اچھی بات ہے کہ اس وقت امی بھی یہاں موجود ہیں۔ امی آپ بھی ذرا توجہ سے سنیے گا۔ یقیناً آپ کو بھی بڑا مزا آئے گا۔ سب سے پہلے ارشد کمال کے افسانے ''بارش'' کا ایک پیراگراف سنیے:

آج صبح سے ہی صائمہ کے سر میں ہلکا ہلکا درد تھا لیکن اُس نے کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ حسبِ معمول گھر کا سارا کام کاج انجام دیتی رہی لیکن دوپہر تک درد نے شدت پکڑ لی۔ اُس نے اپنا دوپٹا سر پر کس کر باندھ لیا اور کمرے میں جا کر اپنے بستر پر دراز ہوگئی۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ کچھ دیر آرام کرے گی تو درد خود بخود کم ہو جائے گا لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ درد بجائے کم ہونے کے کچھ اور بھی بڑھ گیا۔ اُس نے سوچا کہ کچھ دیر سو جائے۔ سر درد کا یہ بھی ایک علاج ہے۔ کافی دیر تک سونے کی کوشش کرتی رہی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ اُس نے اپنی کوشش مسلسل جاری رکھی اور حالتِ غنودگی میں چلی ہی گئی۔

اُس کی یہ غنودگی گہری نیند میں تبدیل ہونے ہی والی تھی

کہ دیوار پر لگے گھڑیال نے ٹن ٹن کر کے شام کے پانچ بجائے۔ وہ فوراً بستر سے اُچھل کر سیدھی کھڑی ہوگئی۔ سر کے درد پر لعنت بھیجتے ہوئے جلدی سے غسل خانے پہنچی۔ نہا دھو کر پوشاک تبدیل کی پھر قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ کو خوب اچھی طرح سجایا سنوارا۔ تیاری مکمل ہوئی تو اُس نے ایک مرتبہ پھر گھڑیال کی طرف دیکھا۔ پانچ بج کر پچیس منٹ ہو رہے تھے۔ اُس کا شوہر نوشاد ٹھیک ساڑھے پانچ بجے گھر میں داخل ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنی بیوی کو اس طرح بنا سنورا دیکھتا تو شاد ہو جایا کرتا۔ آج بھی صائمہ اپنے شوہر کو شاد دیکھنا چاہتی تھی ناشاد نہیں"۔

"اب دوسرے افسانے کا ایک پیراگراف سنیے:

ثانیہ اپنی سہیلی فاخرہ کے ساتھ پسندیدہ شاپنگ مال میں خریداری میں مصروف تھی۔ اپنی شاپنگ مکمل کرنے کے بعد اُس کا خیال تھا کہ وہ باکمال ریسٹورنٹ میں جا کر کافی کا ایک کپ ضرور پیے گی۔ وہ جب بھی یہاں شاپنگ کے لیے آتی تو کافی ضرور پیتی تھی۔ باکمال ریسٹورنٹ کی کافی حقیقتاً اپنے منفرد ذائقے کی وجہ سے بڑی لاجواب اور باکمال تھی لیکن شاپنگ مکمل کرنے کے بعد جب اُس نے اپنی کلائی گھڑی پر نظر ڈالی تو حیران رہ گئی۔ شام کے سوا پانچ بج رہے تھے۔ خریداری کرتے ہوئے اُسے وقت گزرنے کا بالکل احساس نہ ہوا تھا۔ اپنی اس بھول پر اُسے سخت ندامت ہوئی۔ اُس نے کافی پینے کا خیال دل سے فوراً نکالا اور گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ وہ اب جلد از جلد گھر پہنچ جانا چاہتی تھی۔ ٹھیک چھ بجے اُس کا شوہر حامد رضا گھر آجایا کرتا تھا۔ اُس نے گھر جا کر اپنے آپ کو سجانا سنوارنا بھی تھا۔ شادی کے بعد سے اُس کا ہمیشہ یہ معمول رہا تھا کہ خوب بن سنور کر بڑے والہانہ انداز میں اپنے شوہر کا استقبال کیا کرتی تھی"۔

"اب تیسرے افسانے کا ایک پیراگراف سنیے:

تبسم کی ماموں زاد بہن ماجدہ کچھ دن اُس کے پاس رہنے لاہور سے آئی ہوئی تھی۔ ایک دن کہنے لگی، تبسم باجی میں نے طارق روڈ کی بڑی تعریف سنی ہے۔ آج ذرا دیکھ کر تو آئیں۔ میں نے دو چار چیزوں کی خریداری بھی کرنی ہے۔ وہیں سے خرید لوں گی۔ تبسم نے ماجدہ کی خواہش کا احترام کیا اور اُسے لے کر طارق روڈ جا پہنچی۔ کچھ دیر دونوں بہنیں وہاں گھومی پھریں پھر دو چار چیزیں خریدنے کے بعد ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر آئس کریم کھائی پھر ہنسی خوشی واپس گھر چلی آئیں۔ گھر آ کر تبسم نہائی دھوئی۔ سادہ کپڑے اُتار کر اچھا سا لباس زیب تن کیا پھر سنگھار میز کے سامنے کھڑے ہو کر انتہائی انہماک سے اپنے چہرے کو سجانے اور سنوارنے میں مصروف ہوگئی۔ ماجدہ کچھ دیر تک تو تبسم باجی کو بڑے غور سے دیکھتی رہی پھر بڑی حیرت سے بولی۔ تبسم باجی طارق روڈ جاتے ہوئے تو آپ نے اپنے حلیے پر کوئی خاص توجہ نہ دی تھی۔ نہ کپڑے بدلے نہ میک اَپ کیا۔ اب آخر اتنے اہتمام سے کہاں جانے کی تیاری کر رہی ہیں؟ تبسم مسکرائی اور بولی "ماجدہ میں یہ تیاری کہیں جانے کے لیے نہیں بلکہ تمہارے دلہا بھائی کے استقبال کے لیے کر رہی ہوں۔ اُن کے دفتر سے آنے کا وقت ہوگیا ہے۔ میں روز اُن کا استقبال اسی اہتمام سے کیا کرتی ہوں"۔

اب چوتھے افسانے کا ایک پیراگراف سنیے:

"بس بس"۔ اُس کی امی ہاتھ اُٹھاتے ہوئے بولیں۔ "بہت سن لیا، تم آخر ہمیں بتانا کیا چاہتی ہو؟"

"میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ راشد کمال کے افسانوں کی ہیروئن ہمیشہ یہی انداز فکر رکھتی ہے جبکہ حقیقت میں دور، دور تک ایسی بیویوں کا کوئی نام و نشان نہیں۔ یہاں تک کہ جو بیویاں اپنے شوہروں سے بہت زیادہ محبت بھی کرتی ہیں، وہ بھی اُن کا استقبال اِس قدر والہانہ انداز میں نہیں کرتیں بلکہ اکثر برعکس ہی ہوتا ہے"۔

"اب امی آپ خود کو ہی دیکھ لیں۔ اللہ کو حاضر و ناظر جان کر کہیں کہ کبھی آپ نے اپنے شوہر یعنی میرے ابو کا استقبال اِس انداز میں کیا ہے؟ حالانکہ میں جانتی ہوں کہ آپ ابو سے بے حد محبت کرتی ہیں لیکن آپ نے اپنے حلیے کا تو کبھی خیال نہیں رکھا۔ آپ ہی نہیں میں نے تو خاندان بھر کی کسی عورت کو اس والہانہ و دلبرانہ انداز میں استقبال کرتے نہیں دیکھا۔ ایسا تو درکنار وہ تو اپنے شوہروں کی آمد پر مسکرا کر دیکھنا بھی شاید گناہ سمجھتی ہیں۔ زیادہ تر اُن کی آمد پر جلے بھنے انداز میں گھر کا کوئی نہ کوئی مسئلہ لے کر ہی بیٹھ جاتی ہیں۔ کیوں ابو میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں؟"

"ہاں میری بیٹی۔ کہہ تو تم بالکل ٹھیک ہی رہی ہو"۔ پھر زندگی سے بھرپور ایک قہقہہ لگا کر بولے "چلو اچھا ہوا ارشد کمال کے افسانوں پر تم نے یہ تبصرہ اپنی امی کے سامنے کر دیا۔ اب ہوسکتا ہے تمہارا یہ تنقیدی تبصرہ سننے کے بعد تمہاری امی ہمارا استقبال ذرا بہتر انداز میں کرنا شروع کر دیں"۔

"ہاں ابو بالکل میں بھی یہی چاہتی ہوں"۔ پھر ہنستے ہوئے بولی! "لیکن ابو یہ آپ کے ارشد کمال کا کیا ہوگا؟ انھوں نے تو شاید اپنے تصور میں کسی ایسی ہی بیوی کو اپنے ذہن میں بٹھا رکھا ہے۔ شادی کے بعد جب اس کے برعکس ہوا تو یہ صاحب بُری طرح ہارے جائیں گے۔ بے چارے حقائق کی دنیا سے کٹ کر بالکل ہی اپنے خوابوں کی دنیا میں گم جو رہتے ہیں"۔

☆☆☆

کراچی پہنچ کر دو دن تو مکان سنوارنے میں لگ گئے پھر باری باری سب رشتے داروں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ آخر میں راشد کمال کے گھر پہنچے۔ انھوں نے اپنے دوست کا استقبال بڑے والہانہ انداز میں کیا لیکن پھر بڑے دکھی انداز میں بولے۔ "یار صفدر، میرا تو خیال تھا تم سب سے پہلے میرے گھر آؤ گے لیکن ہُوا اس کے اُلٹ۔ تم سب سے آخر میں میرے گھر آئے ہو یعنی اب میں اتنا گیا گزرا ہو گیا۔" اِس سے پہلے کہ صفدر حیات اپنے دوست کے شکوے کا کوئی جواب دیتے، روشینہ بول پڑی، "انکل ابو تو سب سے پہلے آپ کے گھر ہی آنا چاہتے تھے لیکن میرے کہنے پر انھوں نے آپ کے گھر آنے کا پروگرام سب سے آخر میں رکھا۔"

"اچھا..... یہ بات ہے۔ وہ کیوں بھئی؟ تم نے آخر ایسا کیوں چاہا؟"

"دراصل میں تمام رشتے داروں کے گھروں کا خوب اچھی طرح مشاہدہ کرنے کے بعد آپ کے گھر آنا چاہتی تھی۔ اس میں ایک خاص مصلحت تھی اور وہ تو میں آپ کے افسانہ نگار بیٹے کو ہی بتاؤں گی۔ آپ ان سے بعد میں پوچھ لیجیے گا۔" روشینہ نے آخری الفاظ ارشد کمال کی طرف دیکھتے ہوئے کہے تھے۔

"اچھا..... یہ بات ہے۔" راشد کمال نے زوردار قہقہہ لگایا پھر بولے۔ "اچھا بھئی ارشد کو ہی بتا دینا۔ بعد میں ہم اِن سے پوچھ لیں گے۔ ہاں یاد آیا کہ ایک مرتبہ تمہارے ابو نے ذکر کیا تھا کہ تمہیں بھی اُردو افسانہ نگاری کا شوق ہے۔ تم نے ایک آدھ افسانہ لکھا بھی ہے اور تمہارا ارادہ اردو ادب میں ماسٹرز کرنے کا ہے۔"

"جی ہے تو سہی دیکھیں کیا ہوتا ہے۔" پھر وہ ارشد کمال سے براہ راست بولی۔ "میں نے اب تک آپ کے سات افسانے پڑھے ہیں۔ آپ کے پاس تو اپنے سارے افسانوں کا ریکارڈ موجود ہوگا۔ کیا آپ یہ ریکارڈ مجھے دکھانا پسند فرمائیں گے؟"

"ہاں ہاں..... کیوں نہیں آیئے میرے ساتھ۔" ارشد کمال فوراً اُٹھ کر کھڑا ہوا۔ دونوں مکان کی دوسری منزل پر واقع اُس کے کمرے میں پہنچے جہاں ایک کونے میں رکھے ہوئے ریک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ بولا، "یہ اُوپر

والے خانے میں جتنے رسالے رکھے ہیں ان سب میں میرے افسانے ہیں۔''

''بہت خوب..... ماشاء اللہ یہ تو ڈھیر سارے ہیں''۔ پھر اپنے پرس میں سے چند اوراق نکال کر بولی۔ ''ارشد کمال صاحب، میں نے آپ کے جو سات افسانے پڑھے اُن میں سے یہ سات پیراگراف نوٹ کیے، مجھے یہ بہت دلچسپ لگے۔ ذرا انھیں دیکھیے تو سہی۔ میرا خیال ہے..... بلکہ خیال کیا مکمل یقین ہے کہ اس قسم کا ایک آدھ پیراگراف آپ کے ہر افسانے میں موجود ہوگا۔''

ارشد کمال نے اُس کے ہاتھ سے اوراق لے کر جلدی جلدی پڑھے پھر شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا، ''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔ میرے تقریباً تمام افسانوں میں اس قسم کا ایک آدھ پیراگراف یقیناً موجود ہے۔ دراصل اس قسم کا کردار میرا آئیڈیل ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال تھا لیکن یہ صورتِ حال بہت خطرناک ہے۔ آپ خوابوں کی دنیا میں کچھ زیادہ ہی رہتے ہیں۔ حقائق کی دنیا میں رہنا ہی انسان کے لیے بہتر ہے۔ میں آپ کو چیلنج کرتی ہوں کہ کوئی ایک اس قسم کا کردار مجھے بھی دکھا کر تو بتائیں۔ میں نے اپنے شہر میں بھی تمام رشتے داروں اور دوست احباب کو دیکھا۔ یہاں کراچی آ کر بھی تمام رشتے داروں سے ملی۔ مجھے تو آج تک ایسا کوئی کردار نظر نہیں آیا۔ اگر آپ نے ایسا کوئی کردار دیکھا ہے تو مجھے بھی ملوائیں۔ کیا آپ میرا چیلنج قبول کرتے ہیں؟''

''بات چیلنج قبول کرنے یا قبول نہ کرنے کی نہیں بلکہ کردار کو پسند کرنے اور ناپسند کرنے کی ہے۔ صاف بات یہ ہے کہ مجھے ایسا کردار پسند ہے اور میرا خیال ہے کہ ایک اچھی بیوی کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ کیا میری یہ خواہش غلط ہے؟''

''ہونا تو چاہیے۔ میں نے یہ کب کہا کہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہی تو افسوس ہے کہ ایسا ہوتا نہیں۔ جب ایسا ہوتا نہیں ہے تو اس طرح لکھنے کا فائدہ؟''

''فائدہ ہے، بے حد فائدہ۔ میں نے آپ کی بات تسلیم کر لی کہ اکثر ایسا ہوتا نہیں ہے، لیکن ایسا ہو سکتا ہے۔ اب شاید ہو جب میری اور آپ کی شادی ہوگی۔ کیوں کہ ابھی آپ اس بات کا اقرار کر چکی ہیں کہ ایسا ہونا چاہیے، تو پھر کیا خیال ہے میں اپنے والدین کو آپ کے گھر اس نیک مقصد کے لیے بھیج دوں؟'' ارشد کے چہرے پر شرارتی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''کک..... کیا.....'' روشینہ یکدم بُری طرح بوکھلا گئی۔

کچھ دیر بڑے غور سے ارشد کمال کی طرف دیکھتی رہی پھر تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی اُس کمرے میں جا پہنچی جہاں سب لوگ جمع تھے۔

ارشد کمال اُس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے صرف اتنا بولے: ''ہاں یا ناں؟'' کوئی ایک جواب تو دے ہی دیجیے۔

روشینہ نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

جب وہ لوگ رخصت ہو کر ٹیکسی میں بیٹھنے لگے تو صفدر حیات نے ارشد کمال سے پوچھا: ''بیٹا تم نے کوئی نیا افسانہ لکھا؟''

ارشد کمال بولا: ''نہیں انکل! نیا افسانہ لکھا تو نہیں مگر پلاٹ ضرور سوچ لیا ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا اس افسانے کا عنوان ہاں رکھوں یا ناں۔ ویسے میری شدید ترین خواہش ہے کہ میرے اس نئے افسانے کا عنوان ہاں ہی ہو۔ آپ بس اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ میں اپنے افسانے کا عنوان ہاں رکھنے کے قابل ہو جاؤں۔''

ٹیکسی ایک جھٹکے سے اسٹارٹ ہو کر چلنے لگی تو سب نے الوداعی سلام کرنے کے لیے اپنے اپنے ہاتھ اُٹھا دیے۔ ارشد کمال کی نظر روشینہ کے ہاتھ کی ہتھیلی پر پڑی۔ اُسے اپنے افسانے کا عنوان مل گیا تھا۔

ہتھیلی پر بڑے بڑے حروف میں لکھا تھا، ''ہاں''۔ ◆◆◆

شاہد لطیف

بھارت کا بوفورس اسکینڈل

۱۹۸۰ء کی دہائی میں راجیو گاندھی کی حکومت نے فوج کے لیے ۱۵۵ ایم ایم والی تیس کلومیٹر تک مار کی ۴۱۰ توپوں کے ٹینڈر جاری کیے۔ سپہ سالار کی مخالفت کے باوجود ان توپوں کے ٹینڈر سویڈن کی ایک اسلحہ ساز کمپنی بوفورس کے نام منظور ہو گئے۔ طرفہ تماشا یہ کہ اس کمپنی کو ٹینڈر کی دوڑ میں غیر قانونی طور پر شامل کیا گیا تھا۔ اصولاً بھارتی سالارِ اعظم کی بات وزن رکھتی ہے۔ تب کے آرمی چیف کرشنا سوامی سُندر جی فرانسیسی کمپنی سوفا (Sofma) کی توپوں کے حق تھے کیوں کہ ان کی مار بوفورس توپوں کے مقابلے میں آٹھ کلومیٹر زیادہ تھی۔ بات ختم ہو گئی اور بوفورس توپیں بھارتی فوج میں شامل ہو گئیں۔

ابھی راجیو گاندھی کی حکومت جاری تھی کہ اس سودے کے کچھ عرصہ بعد سویڈن کے ایک مقامی ریڈیو اسٹیشن سے ایک رپورٹ نشر ہوئی جس میں دعویٰ کیا گیا کہ

کئی برس پرانا کرپشن پر مبنی کیس
جو دامن پر لگے بدنما دھبے
کی طرح آج بھی گاندھی
خاندان کا تعاقب کر رہا ہے

بوفورس کمپنی نے بھارت سے آرڈر لینے کے لیے رشوت دی ہے۔ اُس وقت وی پی سنگھ راجیو حکومت کے وزیرِ خزانہ تھے۔ وہ کوئی ایکشن لینا چاہتے تھے لیکن حکومت نے انھیں تبدیل کر کے دفاع کی وزارت سونپ دی۔ اس کے

باوجود اُنھوں نے بوفورس اسکینڈل بے نقاب کر دیا۔ اس کی پاداش میں اُن کی وزارت سے چھٹی کروا دی گئی۔ بعد میں اُنھوں نے کانگریس پارٹی سے استعفا دے کر حزبِ مخالف پارٹیوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا۔ ان پارٹیوں، مسیں لوک دل، انڈین نیشنل کانگریس (سوشلسٹ)، جن مورچہ وغیرہ نے وی پی سنگھ کی سرکردگی میں نیشنل فرنٹ بنایا اور ۱۹۸۹ء کے انتخابات میں کامیابی حاصل کر لی۔ اس طرح وی پی سنگھ وزیرِ اعظم بن گئے۔ ان انتخابات میں راجیو گاندھی کی شکست کا سبب یہی رُسوائے زمانہ بوفورس اسکینڈل بنا تھا۔

اس اسکینڈل کا بنیادی کردار اوتاویو کتراچی (Ottavio Quattrocchi) ہے۔ ۱۹۳۸ء میں دنیائے مافیا کا مشہور ''سسلی'' میں پیدا ہونے والا اوتاویو کتراچی ۱۹۶۰ء کی دہائی میں اٹلی کی آئل اینڈ گیس فرم اینی (Eni) اور اسی کی انجینئرنگ شاخ، سنامپروگیٹی (Snamprogetti) کا نمائندہ بن کر بھارت آیا۔ جلد ہی اُس کے تعلقات راجیو اور اُس کی اطالوی نژاد بیوی سونیا گاندھی سے استوار ہو گئے، جو آج کل کانگریس پارٹی کی صدر ہیں۔

۱۹۷۴ء میں کتراچی کی ملاقات راجیو گاندھی اور سونیا گاندھی سے ایک اطالوی شخص، مولیناری (Molinari) نے کروائی۔ اس کے بعد سے کتراچی اور اُس کی بیگم کی راجیو اور سونیا گاندھی سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔ دونوں کے بچے بھی آپس میں گھل مل گئے۔ اُس وقت راجیو گاندھی انڈین ایئر لائن میں پائلٹ تھا۔ ان کے آپس میں اطالوی کھانے اور تحائف کے تبادلے ہونے لگے۔ اس طرح کتراچی خاندان راجیو گاندھی اور اس کی بیوی سونیا گاندھی کے بہت قریب ہو گیا۔

وزیرِ اعظم کے دفتر میں کتراچی کا اثر و رسوخ اتنا بڑھ گیا کہ دہلی کی نوکر شاہی کے اعلیٰ سرکاری افسر اُس کی آمد پر اپنی نشستوں سے اُٹھ کھڑے ہو جاتے تھے۔ گاندھی خاندان کا آخری زمانہ (۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۷ء)، بھارت میں کتراچی کے لیے سنہری دور تھا۔ وہ جس چیز کو ہاتھ لگاتا سونا ہو جاتی۔ اُس کے اور بھارتی سرکار کے مابین سودے کی ایک پیشکش بھی مسترد نہیں ہوئی۔ اُس زمانے کی کانگریس پارٹی کے ایک کارکن کے بقول کھاد کے ٹھیکے بھی سنامپروگیٹی نے حاصل کر لیے جن کے بارے میں یہی سمجھا گیا کہ یہ سونیا اور راجیو گاندھی کے مفاد کی خاطر دیے گئے ہیں۔ ان حضرت کا بھارتی وزرا پر اثر و رسوخ اس قدر بڑھ گیا کہ تب کے مرکزی وزیرِ خزانہ وی پی سنگھ اس سے عاجز آ گئے تھے۔

بوفورس اسکینڈل اس وقت منظرِ عام پر آیا جب بوفورس کے مینیجنگ ڈائریکٹر مارٹن آرڈبو Martin Ardbo کی خفیہ ڈائری بھارتی انگریزی روزنامہ ''دی ہندو'' سے منسلک صحافیوں چترا سُبر امنیم اور این رام کے ہاتھ لگ گئی۔ اس میں دوسری کئی باتوں کے علاوہ جگہ جگہ ''Q'' اور ''R'' کے واضح اشارے تھے۔ جب تفتیشی ٹیم نے سوئس بینکوں میں رقم کی ترسیل کی چھان بین کی تو Q کی شناخت اوتاویو کتراچی سے ہوئی جو اکاؤنٹ ہولڈر تھا۔ R کا بھید بھی جلد کھل گیا۔ اس سے مراد راجیو گاندھی تھا۔ بھارتی سی بی آئی نے بھی اس ڈائری کی نقول حاصل کر لیں لیکن عدالت نے ان کی صحت ماننے سے انکار کر دیا کیوں کہ وہ اصل کے بجائے فوٹو کاپیوں پر مشتمل تھی۔

اسکینڈل روکنے کے لیے بھارتی حکومت نے سویڈش ذمہ داروں سے مل کر معاملہ دبانے کی اپنی سی بہت کوشش کی۔ تاہم امریکی خفیہ ایجنسی، سی آئی اے نے اپنے ذرائع سے معلومات حاصل کر کے حتمی کہہ دیا ''یقیناً اس معاملے میں 'بوفورس' نے کمیشن کی رقم ادا کی ہے۔ براہِ راست بھارتی افسران کو یا کسی بروکر کے واسطے سے ۲۱ ملین ڈالر کی یہ رقم

بھارتی افسروں کی جیبوں میں گئی''۔

قانونی طور پر راجیو گاندھی کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہو سکی لیکن خود کانگریس پارٹی کے سیاست دان اس اسکینڈل کی چھان بین کے درپے ہو گئے۔ اس سے راجیو گاندھی کی حکومت ہل گئی جو بالآخر ۱۹۸۹ء کی انتخابی شکست منتج ہوئی۔ تقریباً چار سال تک (۱۹۸۹ء تا ۱۹۹۳ء) اس اسکینڈل پر کوئی قابلِ ذکر پیش رفت نہیں ہوئی۔ اس دوران ۱۹۹۱ء میں خود راجیو گاندھی ترکِ سدھار گئے۔

اکتوبر ۱۹۹۹ء میں بھارتیا جنتا پارٹی المعروف بی جے پی کی حکومت آ گئی۔ تبھی بھارتی تحقیقاتی ادارے، سی بی آئی سینٹرل بیورو آف انویسٹی گیشن (CBI) نے کتراچی اور اس کی بیوی ماریہ کے خلاف فردِ جرم عائد کر دی۔ ایسا سوئس بینک کی ۵۰۰ دستاویزات کی بنیاد پر کیا گیا۔ ان کے شریکِ کار کے طور پر راجیو گاندھی اور کانگریس پارٹی کے کچھ اور عہدے دار بھی شامل تھے۔ فردِ جرم میں یہ بھی بتایا گیا کہ کتراچی کو A.E. Services کے ذریعہ سات ملین امریکی ڈالروں کا ۳ فیصد بطور کمیشن دیا گیا۔ گویا موت کے بعد بھی بوفورس کا بھوت راجیو گاندھی سے چمٹا ہی رہا۔

فردِ جرم عائد کرنے کے باوجود بی جے پی کو یقینی ثبوت نہ مل سکے لیکن کیس کو مزید تقویت اُس وقت حاصل ہوئی جب جون ۲۰۰۳ء میں انٹرپول کے ہاتھ BSI AG بینک لندن کے دو عدد اکاؤنٹ 5A5151516M اور 5A5151516L لگے جو کتراچی اور اُس کی بیگم ماریہ کے تھے۔ ان میں تین ملین یورو اور ایک ملین امریکی ڈالر موجود تھے۔ اس پر ایک بھارتی اخبار نے لکھا: ''ایک تنخواہ دار شخص کے بچت اکاؤنٹ میں اتنی کثیر رقم کا ہونا تجسس کا باعث ہے''۔ بھارتی سی بی آئی کی سرکاری درخواست پر یہ اکاؤنٹ منجمد کر دیے گئے۔ کتراچی نے اپنے اکاؤنٹ غیر منجمد کروانے کے لیے کئی اپیلیں کر ڈالیں لیکن برطانوی عدالتوں نے وہ تمام مسترد کر دیں۔ سی بی آئی کی بھرپور محنت اور ٹھوس ثبوت کی وجہ سے ممکن ہوا۔

۲۰۰۴ء میں کانگریس دوبارہ برسرِ اقتدار آئی۔ من موہن سنگھ وزیرِ اعظم بنے لیکن پارٹی کی صدارت پر سونیا گاندھی بدستور قائم رہیں۔ یقیناً یہ سونیا گاندھی کا دباؤ ہو گا کہ بائیس دسمبر ۲۰۰۵ء کو بھارتی حکومت نے اس سلسلے میں یکسر اپنا موقف بدل ڈالا۔ وزیرِ قانون ہنس راج بھردواج نے ایڈیشنل سولیسیٹر جنرل آف انڈیا بی دتہ کو خاص طور پر لندن بھیجا تا کہ وہ کتراچی کے منجمد اکاؤنٹ غیر منجمد یا کھلوانے کا بندوبست کریں۔ بھارتی وزارتِ قانون نے اپنے ملک کی سی بی آئی سے اس سلسلے میں سرے سے کوئی مشورہ نہیں لیا۔

۱۶ جنوری ۲۰۰۶ء کو بھارتی سُپریم کورٹ میں ایک دعویٰ دائر ہوا کہ سی بی آئی کو حکم دیا جائے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائے کہ لندن میں واقع کتراچی کے ان اکاؤنٹ میں سے کوئی رقم اُس وقت تک نہ نکلوائی جا سکے جب تک بھارتی حکومت اس سلسلہ میں اپنا موقف واضح نہیں کرتی مگر سپریم کورٹ کے فیصلے سے پہلے ہی چار ملین امریکی ڈالر ان دونوں اکاؤنٹ سے نکلوا لیے گئے۔ اس اقدام سے حکومت پر بہت تنقید ہوئی اور سونیا گاندھی کی پوزیشن بھی کمزور ہو گئی۔

فروری ۲۰۰۴ء میں دہلی ہائی کورٹ نے راجیو گاندھی اور دوسروں پر رشوت لینے کے الزامات منسوخ کر دیے۔ اس کا سبب ناکافی شواہد کے حوالے اور ثبوت بتلائے گئے جس سے یہ ثابت نہ ہو سکا کہ ان لوگوں کو کبھی کوئی کمیشن دیا گیا۔ اس پر سونیا گاندھی نے جشن منایا اور بیان دیا ''آخر سترہ سال کی بدسلوکی اور بدنامی کے بعد یہ میرے اور میرے بچوں راہول اور پریانکا کے لیے بہت خاص لمحہ ہے''۔ البتہ یہ کیس مکمل طور پر ختم نہیں ہوا۔ دھوکا دہی اور حکومت کو غلط طریقے سے نقصان پہنچانے کے دو عدد الزامات عدالتوں میں چلتے رہے۔

اپریل ۲۰۰۹ء میں انٹرپول نے اوتاویو کترا چی کے نام کے سرخ وارنٹ منسوخ کر دیے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ایسا خود بھارتی تحقیقاتی ایجنسی سی بی آئی کی ہی درخواست پر کیا گیا۔ سی بی آئی کی تقریباً دو دہائیوں پر مشتمل تحقیقات کے برعکس انکم ٹیکس کی ایک عدالت میں یہ فیصلہ سنایا گیا کہ کترا چی اور اُس کے ساتھی چڈھا نے بطور بوفورس ایجنٹ ۴۱۰ ملین بھارتی روپے رشوت میں لیے ہیں۔

دوسری طرف ۴ مارچ ۲۰۱۱ء کو دہلی کی عدالت کے چیف مجسٹریٹ ونود یادیو نے پچیس سال پرانا بوفورس کا کیس یہ کہہ کر بند کر دیا کہ سی بی آئی، اکیس سالہ تگ و دو کے بعد بھی کترا چی کے خلاف ۶۴۰ ملین بھارتی روپے بطور کمیشن وصول کرنے کو قانونی طور پر ثابت نہ کر سکی۔

بالآخر ۱۳ جولائی ۲۰۱۳ء کو اٹلی کے شہر میلان میں اوتاویو کترا چی اپنے ساتھ بوفورس کے راز لیے دوسرے جہان سُدھار گیا۔ یوں بوفورس اسکینڈل کا دوسرا کردار بھی اپنے انجام کو پہنچا۔

دفورس کا جن بوتل کے اندر باہر آتا جاتا رہتا تھا کہ ۲۵ جولائی ۲۰۱۷ء کو یہ ایک مرتبہ پھر باہر آ گیا۔ سویڈن کے چیف تحقیقاتی افسر اسٹین لنڈسٹرام (Sten Lindstrom) کا ایک ٹی وی انٹرویو ۲۵ جولائی کو نشر ہوا۔ یہ وہی سویڈش افسر ہیں جنہوں نے ۱۹۸۷ء میں ساڑھے تین سو سے زائد دستاویزات بھارتی صحافی چترا سُبر امنیم کو دی تھیں۔ وہ اُس وقت روزنامہ ''دی ہندو'' میں کام کرتی تھیں اور انھوں نے اسے عام کیا۔ اسٹین لنڈسٹرام کو بوفورس اسکینڈل کی تفصیلات خود بوفورس کمپنی کے چیف، مارٹن نے بتائی تھیں۔

۱۹۸۶ء میں بھارتی حکومت نے توپوں کے ٹینڈر مانگے۔ توپوں کی ڈیل پر دستخط ہونے سے دو ماہ پہلے راجیو گاندھی نے اپنے سویڈش ہم منصب کے ساتھ ایک ہوائی سفر کیا۔ اس سفر میں بوفورس کمپنی کے چیف مارٹن بھی موجود تھے۔ دونوں کے درمیان معاملات طے پا گئے۔ رقم کی ادائیگی کے لیے کترا چی کا انتخاب ہوا اور یہ ادائیگی سوئس بینکوں کے ذریعے ہونا تھی۔ کمپنی نے توپوں کے بروکر کو ۹ء۹ ملین امریکی ڈالر سے زیادہ رقم ادا کی۔ دس ملین امریکی ڈالر بھارتی نامور سیاست دانوں اور وزارتِ دفاع کے اعلیٰ افسروں کو دیے گئے۔

اِس انٹرویو نے تمام پُرانی باتیں بھی یاد دلا دیں جب ۲۰۱۱ء میں سوئٹزرلینڈ میں خفیہ بھارتی اکاؤنٹ میں راجیو گاندھی کے ڈھائی بلین سوئس فرانک کی موجودگی کا انکشاف ہوا اور یہ کہ سونیا گاندھی، اب راجیو گاندھی کی بیوہ کی حیثیت سے اس کے خفیہ ۲٫۵ بلین سوئس فرانک (جو ۲٫۲ بلین امریکی ڈالر بنتے ہیں) کی مالک ہیں۔

یہ دولت اُن بینکوں میں ہے جہاں دنیا کے رسوائے زمانہ بدعنوان ترین افراد اپنے وطن کی لوٹی ہوئی رقمیں رکھا کرتے ہیں۔ اب یہ رقم سونیا گاندھی کے چھوٹے بیٹے کے نام ہے۔ یہ اکاؤنٹ لازماً جون ۱۹۸۸ء سے پہلے کا ہے جب راہول گاندھی جوان ہو گیا تھا۔ یہ لوٹ کا مال اب تقریباً دس ہزار کروڑ بھارتی روپے بنتا ہے۔ سوئس بینکوں میں یہ ''کالا دھن'' خوب پھلتا پھولتا ہے۔ اُس وقت لمبی مُدت پر رکھوائی گئی ۲٫۲ بلین ڈالر کی رشوت کی یہ رقم ۲۰۰۹ء میں ضرب ہو کر ۹ء۴۱ بلین امریکی ڈالر ہو چکی ہو گی۔ یعنی ۴۲,۳۴۵ کروڑ بھارتی روپے۔ اقتصادی ماہرین کے مطابق ایسی رقوم لمبی مدت کے بانڈ میں ۵۰:۵۰ کے تناسب میں محفوظ رکھی جاتی ہے لہٰذا وہ ۱۹ء۱۱ بلین ڈالر ہوئی (بھارتی ۵۰,۳۵۵ کروڑ روپے)۔ اب خواہ آپ کوئی بھی فارمولا استعمال کریں، رشوتوں میں وصول شدہ وہ ۲٫۲ بلین امریکی ڈالر آج کے تقریباً ۸۴,۰۰۰ کروڑ بھارتی روپے ہیں۔

سویڈش تحقیقی افسر لنڈاسٹروم کو اِس بات کا بہت افسوس

ہے کہ پچھلے تیس برس میں بھارت سے کسی سراغ رساں، تحقیقاتی افسر وغیرہ نے اُس سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ خود سویڈن میں یہ کیس ۱۹۸۸ء میں ہی بند کر دیا گیا۔ اب وہ سویڈن اور بھارتی حکام پر کوئی انحصار نہیں کرتے لہٰذا جو کچھ انھیں معلوم ہے وہ چترا کو منتقل کر رہے ہیں۔

آج کل بی جے پی کی حکومت ہے لہٰذا وہ تمام مصلحتیں اور لحاظ قصۂ پارینہ ہوئے جن کی بنا پر ایک طرح یا دوسری طرح بوفورس کیس میں راجیو گاندھی کے ملوث ہونے کی وجہ سے کیس ہی کو داخلِ دفتر کر دیا گیا تھا۔ یہ اسکینڈل بی جے پی کے نشی کانت دُبے نے لوک سبھا میں اُٹھایا۔ بھارتی پارلیمان (لوک سبھا) میں جب ان انکشافات کی بابت سوال جواب ہوئے تو سونیا اور راہول گاندھی واک آؤٹ ہی کر گئے۔

اس طرح بوفورس کی بوتل کا جن ایک مرتبہ اور باہر آ گیا۔ یہ بات طے ہے کہ اس کیس کی تحقیقات صحیح خطوط پر کبھی کی ہی نہیں گئیں۔ نشی کانت نے مطالبہ کیا کہ سی بی آئی دوبارہ سے اس کیس پر تحقیقات کرے اور ساتھ ہی دہلی ہائی کورٹ کے ۲۰۰۵ء والے حکم نامہ کو بھی چیلنج کر دیا۔ یہ بوفورس اسکینڈل تو کانگریس اور گاندھی خاندان کی جان کا عذاب ہی ہو گیا۔ اس نے راجیو گاندھی کی کانگریسی حکومت کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ کوئی خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہتا رہے یہ حقیقت ہے کہ بھارت کی سب سے پرانی سیاسی پارٹی کانگریس کے ماتھے پر یہ کلنک کا ٹیکہ ہے جو دھوئے نہیں دھلتا اور مرنے کے بعد بھی راجیو گاندھی کو چین نہیں لینے دیتا۔

یہ عبرت ناک اسکینڈل پاکستانی سیاستدانوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ ہمارے نبی ﷺ نے بالکل درست فرمایا ہے کہ بنی آدم کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔ اگر اس کے پاس سونے کی ایک وادی ہو تو وہ دوسری کی تمنا کرے گا اور اس کا منہ قبر کی مٹی کے سوا اور کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔ (صحیح بخاری۔ ۶۴۳۹)

چٹکیاں

کھلا پانی کا نکاسب نے برتن بھر لیے
کھڑے ہی رہ گئے لے کر پتیلے خواہ مخواہ

بوٹیاں کیسے چبائیں جب ہتیسی ہی نہیں
کھا رہے ہیں رات دن کیلوں پہ کیلے خواہ مخواہ

لڑائی جب کبھی کہتی ہے بیگم فی البدیہہ
سارے غم دنیا جہاں کے میں نے جھیلے خواہ مخواہ

کام جو نہ کر سکے تھے آج تک پکّے گُرو
خیر سے کرنے لگے ہیں ان کے چیلے خواہ مخواہ

ایک چٹکی میں ہی بس ان کو اڑا کے رکھ دیا
زندگی میں جب کبھی آئے جھمیلے خواہ مخواہ

وہ اگر ہیں لیس ایٹم سے بھلے ہوتے رہیں
ہم نے بھی رکھے نہیں ہیں پاس ڈھیلے خواہ مخواہ

اپنی قسمت میں ہمیشہ ہار ہی آئی ضیاؔء
کھیل اس نے جتنے میرے ساتھ کھیلے خواہ مخواہ

شرافت ضیاء، اسلام آباد

رفعت رفیق

وسیع انتظار گاہ کے خوش گوار حد تک خنک ماحول میں آرام دہ صوفے پر بیٹھے ہوئے ناگواری چہرے پر رقم تھی۔ اکتاہٹ بھرے انداز میں اس نے نظر اٹھا کر سامنے دیوار پر نصب گھڑیال کی جانب دیکھا تو بیزاری میں مزید اضافہ ہوگیا۔ رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے لیکن ڈاکٹر ہمدانی کے کلینک پر ہجوم کم ہونے میں نہیں آرہا۔ ''یوں لگتا ہے کہ ساری قوم ہی نفسیاتی مریض بن چکی۔'' اس نے کوفت بھرے انداز میں سوچا۔

سوچوں کو جھٹکنے کی کوشش میں اس نے اپنا سر جھٹکا اور ساتھ بیٹھی فرحین کو دیکھا جو گردوپیش سے بے خبر خاموشی کے ساتھ بے تاثر نگاہوں سے سامنے دیکھ رہی تھی۔ اس کی سے

مشین

ایک عورت کا پُرحسرت ماجرا

جذبات واحساسات سے دوری نے اُس کی زندگی کو مشینی بناڈالا تھا

پچھ روز سے تو..........

''بیگم فرحین کمال......'' کمال احمد کی سوچوں کا غیر مربوط سلسلہ استقبالیہ پر بیٹھی جدید تراش خراش کے لباس میں ملبوس لڑکی کی قدرے بلند آواز سے معطل ہوا۔ وہ اپنی بیگم کے ساتھ اُٹھے اور ڈاکٹر کے کمرے کی سمت بڑھ گئے۔

ڈاکٹر ہمدانی ساٹھ کے پیٹے میں سرمئی بالوں والے خوش شکل انسان تھے۔ انھوں نے خیر مقدمی مسکراہٹ سے کمال احمد اور مسز کمال احمد کو نوازا، ہاتھ سے سامنے پڑی کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر اپنے سامنے پڑی فائل پر درج نام ''مسز فرحین کمال'' کو بلند آواز سے پڑھتے ہوئے دونوں کی طرف دیکھا اور اُسے میز پر واپس رکھ دیا۔

''جی تو مسز فرحین کمال، اپنے متعلق بتائیے۔'' ڈاکٹر نے خوش شکل مگر آنکھوں کے گرد حلقوں اور پژمردہ چہرے والی خاتون کو مخاطب کیا۔

لیکن خاتون کے انداز میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی۔ وہ اسی طرح لاتعلق انداز میں بیٹھی رہی۔

ڈاکٹر ہمدانی نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اب آواز پہلے کے مقابلے میں بلند تھی۔ یہ آواز مسز فرحین کمال کی سماعتوں پر شاید دستک دینے میں کامیاب ہوگئی لیکن دماغ کے کواڑ اب بھی بند رہے۔ اس نے اپنی بے تاثر نگاہوں کا زاویہ ڈاکٹر کی طرف موڑا لیکن ہونٹ آپس میں یوں پیوست رہے جیسے صدیوں سے بند کوئی قفل۔

اب ڈاکٹر نے کمال احمد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کمال صاحب، آپ اپنی بیگم کی بیماری کے متعلق جو کچھ بھی جانتے ہیں، بتائیے۔''

''ڈاکٹر صاحب! میری بیگم ایک معروف تعلیمی ادارے کے ساتھ بطور استاد منسلک ہیں۔ ہماری شادی کو بارہ سال گزر چکے۔ ہمارے دو بچے ہیں۔ سب کچھ نارمل بلکہ بہت اچھا جا رہا تھا کہ اچانک کچھ دنوں سے فرحین کو یہ وہم ہوگیا ہے کہ وہ انسان نہیں بلکہ ایک مشین ہے۔''

ڈاکٹر نے تفہیمی انداز میں ایک ابرو قدرے بلند کرتے کمال احمد کو دیکھا اور بولے ''اچھا یہ بات ہے۔'' چشمے کو ناک پر دوبارہ درست کیا اور پوچھا:

''اور اندازاً یہ کتنے دن پہلے کی بات ہے کہ جب آپ کی مسز کو یہ وہم ہوا۔''

کمال احمد: ''غالباً ایک ماہ پہلے کی بات ہے۔''

ڈاکٹر: ''اس وہم کے بعد ان کی روزمرہ کی سرگرمیاں اور روٹین کیا ہے؟''

کمال احمد: ''جب سے ان کو یہ وہم لاحق ہوا ہے، کھانا پینا، سونا سب چھوڑ دیا اور کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے منہ سے آوازیں نکالنے لگتی ہے۔''

ڈاکٹر: ''آوازیں؟ کیسی آوازیں؟''

کمال احمد: ''مختلف آوازیں کھڑ کھڑ کھڑ، پٹر پٹر پٹر، ٹھک ٹھک ٹھک۔''

ڈاکٹر: ''اوکے کمال صاحب، میں آپ سے کچھ ذاتی نوعیت کے سوالات پوچھنا چاہتا ہوں تا کہ مسئلے کو سمجھا جا سکے۔''

کمال احمد: ''جی پوچھیے ڈاکٹر صاحب! میں تو عاجز آچکا ہوں۔''

ڈاکٹر: ''آپ کی شادی کو بارہ سال ہوچکے۔ یہی بتایا نا آپ نے؟''

کمال احمد: ''جی ڈاکٹر صاحب۔''

ڈاکٹر: ''آپ کے گھر پر افراد کی تعداد۔''

کمال احمد: ''میرے والدین، میں، میری بیوی اور

ہمارے دو بچوں سمیت کل چھ افراد۔"

ڈاکٹر: "اچھا آپ کی بیگم کسی ذہنی دباؤ کا شکار ہیں؟ میرا مطلب ساس بہو کی روایتی چپقلش؟"

کمال احمد: "نہیں نہیں ڈاکٹر صاحب۔ میرے والدین کو فرحین سے کوئی شکایت نہیں۔"

ڈاکٹر: "ادارے میں ان کو کسی منفی رویے کا تو سامنا نہیں؟"

کمال احمد: "فرحین ایک قابل اور محنتی استاد ہیں۔ اس لیے اپنے ادارے میں عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔"

ڈاکٹر: "آپ کے آپس کے تعلقات کیسے ہیں؟ میرا مطلب آپ کی دلچسپی کہیں اور....."

کمال احمد: "بالکل نہیں ڈاکٹر صاحب۔ میری زندگی فرحین کے سامنے کھلی کتاب کی طرح ہے۔ میں ایک بڑے سائنسی تحقیقی ادارے سے منسلک ہوں۔ میرا سارا دن دفتر اور گھر پر بھی مطالعے اور تحقیق کی نذر ہو جاتا ہے۔ میں ان خرافات میں وقت ضائع کرنے کا قائل نہیں۔"

ڈاکٹر: "آپ کی شادی پسند کی تھی یا اہلِ خانہ نے کروائی؟"

کمال احمد: "فرحین میری پسند تھی پھر میرے خاندان نے بھی میرے فیصلے پر صاد کیا اور یوں وہ زندگی کا حصہ بن گئی۔"

ڈاکٹر: "یہ بتایئے، وہ گھر کے انتظام، بچوں کی تربیت اور اپنی ذمہ داریوں کے حوالے سے کیسی ہیں؟"

کمال احمد: "بالکل ٹھیک۔ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں۔"

ڈاکٹر: "آپ کی بیگم کے مشغلے کیا ہیں؟"

کمال احمد: "شادی سے پہلے تو اسے موسیقی اور شاعری پسند تھی۔ مصوری بھی کرتی تھی۔"

ڈاکٹر: "اور اب؟"

کمال احمد نے سوچتے ہوئے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی لیکن پھر خاموشی سے سر جھکا لیا۔

ڈاکٹر: "چلیں آپ کو اپنی بیگم کے پسندیدہ رنگ، فلم، اداکار یا کتاب وغیرہ کے متعلق تو ضرور پتا ہوگا۔"

کمال احمد: "فرحین کا پسندیدہ رنگ شادی سے پہلے تو گلابی تھا"۔

ڈاکٹر: "اور اب؟"

کمال احمد نے پھر خاموشی سے سر جھکا لیا۔

ڈاکٹر: "اچھا آپ شاپنگ تو مل کر کرتے ہوں گے۔ آخری دفعہ آپ نے انھیں تحفہ کیا دیا؟"

کمال احمد: "تحفہ؟ میں نے بتایا نا کہ وہ خود ملازمت کرتی ہیں۔ وہ اپنی مرضی سے شاپنگ بھی کر لیتی ہیں۔"

کمال احمد: "آپ کی بیگم کھانا تو اچھا بناتی ہوں گی۔ آپ کو ان کے ہاتھ کے بنے کھانوں میں سے کیا پسند ہے؟"

کمال احمد: "جی واقعی وہ کھانا اچھا بناتی ہے مثلاً بریانی، مچھلی، کڑاہی اور سوپ تو خاص کر بہت ہی اچھا بناتی ہیں۔"

ڈاکٹر: "واہ! پھر تو آپ ان کی خوب ستائش کرتے ہوں گے۔"

کمال احمد: "ستائش؟ یہ تو معمول کے کام ہیں جو سبھی خواتین کرتی ہیں۔"

ڈاکٹر نے خاموش ہو کر چشمہ آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے گہری سانس لی اور تھکے ہوئے لہجے میں بولا: "بہت شکریہ مسٹر کمال احمد۔"

کمال احمد: "لیکن ڈاکٹر صاحب ایک بات سمجھ نہیں آئی کہ وہ خود کو مشین کیوں سمجھنے لگی ہیں؟؟؟" ◆◆◆

صبا عمران

کافی

ایک قدیم اور مفید مشروب

ایک پودے کے بیج پیس کر بنائی جانے والی کافی کا شمار دُنیا بھر خصوصاً یورپی ممالک میں سب سے زیادہ استعمال کیے جانے والے مشروبات میں ہوتا ہے لیکن جتنی یہ یورپی ممالک میں مقبول ہے، اتنی ہی مشرقِ وسطیٰ اور ایشیائی ممالک میں بھی شوق سے پی جاتی ہے۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب گھر میں ایک کپ کافی تیار کرنا بھی دردِ سر تھا۔ یہ ایک طویل عمل ہوتا تھا۔

پہلے کافی کے بیجوں کو چولہے پر کسی برتن میں بھونا جاتا پھر ان بھنے بیجوں کو سل بٹے یا کھرل میں باریک پیسا جاتا۔ اس کے بعد اس پسی کافی کو چھانا اور پھینٹا جاتا پھر دودھ، پانی اور شکر وغیرہ حل کر کے پیا جاتا۔ اب لوگوں کی اکثریت کافی کی صرف اُس قسم سے واقف ہے جو سفوف یعنی پاؤڈر کی شکل میں بوتلوں اور ساشوں میں بازار میں دستیاب ہے۔ اب تو اس حد تک آسانی ہو گئی ہے کہ صرف کافی کا ساشے لائیے اور گرم پانی میں اُسے انڈیل دیں۔ اس میں کافی، دودھ، شکر سب شامل ہے لیکن اب بھی کچھ لوگ گھروں میں خود کافی تیار کرتے اور اس کے لیے مہنگی برقی مشینیں خریدتے ہیں۔

یہ سیاہ مشروب کافی غذائی خصوصیات رکھتا ہے۔ ان کا تذکرہ درج ذیل ہے:

جگر کے لیے ٹانک:

ایک تحقیق جاپان میں مکمل کی گئی۔ اس کی رو سے دن میں ایک سے زائد کافی کے کپ پینے والے افراد میں جگر کا سرطان ہونے کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ جاپانی محققین نے جگر سکڑنے کی بیماری میں کافی کو بے حد مفید قرار دیا ہے۔ کافی کے بیجوں میں موجود ایک کیمیائی مادہ کولورجینک تیزاب جگر کے سرطان کے خلاف مزاحمتی ہتھیار بن جاتا ہے۔

کافی پینے سے سخت، بوجھل اور محنت طلب کاموں سے نمٹنے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ انسان تھکاوٹ سے بھی

نجات حاصل کرلیتا ہے کیونکہ کافی پینے سے جسم کا میٹابولزم بڑھ جاتا ہے۔

ذیابیطس :

ہارورڈ میڈیکل اسکول نے قسم دوم ذیابیطس میں کافی کا استعمال مفید قرار دیا ہے۔

پتے کی پتھری :

ہارورڈ ہی کی ایک تحقیق کے مطابق جو لوگ کافی پیتے ہیں، اُن میں پتے کی پتھری کے امکانات اُن لوگوں سے ۳۰ فیصد کم ہوجاتے ہیں جو کافی بالکل بھی نہیں پیتے۔

دل کی تکالیف :

ایک زمانہ تھا جب کافی کو دل کے مریضوں کے لیے شدید مضر قرار دیا گیا تھا مگر جدید تحقیقات نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ کافی کا ایک کپ روزانہ پینا دل کی تکالیف کے خلاف تحفظ فراہم کرتا ہے۔

کینسر کے خلاف تحفظ :

اٹلی میں کی گئی ایک تحقیق کے مطابق اچھی طرح بھنے بیجوں سے تیار شدہ کافی مفید غیر تکسیدی مادوں یعنی اینٹی آکسیڈینٹس پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ اینٹی آکسیڈینٹس مختلف اقسام کے کینسر کے خلاف جسم کو قوتِ مدافعت فراہم کرتے ہیں۔

ذہنی صلاحیتوں کے لیے :

کافی ذہن کو تازہ دم کرتی ہے۔ توجہ اور ارتکاز کو بہتر بناتی ہے۔ اس کے علاوہ یادداشت اور حافظے کو بہتر بنانے میں بھی مددومعاون ثابت ہوتی ہے۔ اسی لیے سائنسدان اسے الزائمر کی بیماری میں مفید قرار دے رہے ہیں۔

پارکسنز سے تحفظ :

چین میں ہونے والی ایک تحقیق میں سائنسدانوں نے یہ بات ثابت کی ہے کہ کافی کا استعمال پارکسنز یعنی رعشہ کی بیماری سے بچاؤ میں نہایت اہم ثابت ہوتا ہے وجہ یہ کہ کافی اعصاب کو طاقت بخشتی ہے اور دماغ کے ساتھ اُن کا رابطہ مزید مؤثر بناتی ہے۔

گلے کی بیماریاں :

نزلہ، زکام اور بلغمی کھانسی میں کافی کا استعمال بے حد مفید ثابت ہوتا ہے۔

دمہ :

جن لوگوں کو دائمی دمہ ہو، اُن کے لیے کافی کا ایک کپ دوا سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے۔ امریکا میں ہونے والی ایک تحقیق میں سائنسدان یہ بات ثابت کرچکے۔

ڈپریشن :

کافی کا شمار اُن اشیاء میں ہوتا ہے جنہیں سائنسدان موڈ کو خوشگوار بنانے والے مشروبات کہتے ہیں۔ سو اگر آپ ذہنی دباؤ کا شکار ہیں۔ آپ کا موڈ بگڑا ہوا ہے تو ایک کپ کافی آپ کو پُرسکون کرسکتی ہے۔

کیفین کے اثرات :

کافی میں ایک کیمیائی مادہ، کیفین پایا جاتا ہے۔ یہ مادہ خصوصاً زیادہ مقدار میں لیا جائے، تو منفی اثرات بھی مرتب کرتا ہے۔ یہی کافی کو پیشاب آور بناتا ہے۔

بعض لوگ اسے پی کر دل کی دھڑکن تیز محسوس کرنے لگتے ہیں ایسا کیفین کی وجہ سے ہوتا ہے۔

چونکہ کیفین مرکزی اعصابی نظام پر اثرانداز ہوتی ہے اس لیے کمزور مدافعتی نظام والے افراد اس کو برداشت نہیں کر پاتے۔ بہر حال جدید تحقیقات کی رو سے کافی کے فوائد اس کے مضر اثرات سے زیادہ ثابت ہوچکے۔ اسی لیے بعض لوگ دن میں تین سے چار کپ تک کافی پیتے ہیں۔

کہتے ہیں نا کہ پانی بھی اگر ضرورت سے زیادہ پی لیا جائے تو نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے کافی کا ایک خوش ذائقہ کپ بھی کافی ہوتا ہے۔ ♦♦♦

انتظار لاحاصل

ایک مجبور عورت کی دل گداز کتھا
جذبہ ہمدردی نے اُسے اَنہونے کام کرنے پر اُکسائے رکھا

آمنہ زبیر

باورچی خانے میں چائے بناتے ہوئے مجھے ایک دم خیال آیا کہ شکر تو ہے ہی نہیں۔ کل بھی بڑی مشکل سے گزارا ہوا تھا۔ اب چونکہ میں چائے بنا چکا تھا، سوچا برابر والے گھر سے شکر لے آتا ہوں۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو خالہ بیلن لیے باہر نکلیں۔

”خیریت ہے خالہ یوں بیلن لیے آپ باہر آگئیں؟ مجھ سے ایسی کیا خطا ہوگئی؟“ میں نے مذاق کرتے ہو کہا: ”ارے میں روٹی ڈال رہی تھی۔ تم نے گھنٹی بجائی تو ایسے ہی چلی آئی۔ خیر بولو کس کام سے آئے ہو لکھاری میاں؟“

مجھے تمام محلے والے لکھاری میاں کے نام سے پکارتے تھے۔ میں رسالوں اور اخباروں وغیرہ میں کہانیاں لکھتا ہوں اور یہ میرا شوق بھی ہے۔“ خالہ شکر ختم ہوگئی تھی۔ چائے بنائی تو دیکھا۔ اب آپ ایک کپ کے لیے شکر دے دیں“۔ میں نے مظلومانہ شکل بنا کر کہا۔

”اچھا اچھا۔ تم کپ لے کر آجاؤ اور جتنی چاہو شکر ڈال لو“۔

میں فوراً جا کر کپ لے آیا اور شکر ڈال کر چمچ گھمانے لگا: ”ابھی کوئی نئی کہانی نہیں لکھی تم نے؟“ خالہ مجھ سے مخاطب ہوئیں: ”نہیں ابھی تو نہیں لکھی، اس مرتبہ کوئی حقیقت پر مبنی کہانی لکھنا چاہتا ہوں۔ ڈھونڈ رہا ہوں۔ مل گئی تو ضرور لکھوں گا۔“ میں نے چائے ختم کرتے ہوئے کہا اور اٹھ کر جانے لگا ہی تھا کہ یکایک وہ بولیں۔

”حقیقت پر مبنی ایک کہانی میرے پاس بھی ہے۔ چاہو تو سن سکتے ہو اور لکھو بھی۔“

میں جو جانے کے لیے تیار تھا ایک دم رُک گیا اور اُن سے پوچھا: ”کیا مطلب؟ کیسی کہانی؟؟“ انھوں نے ایک سرد آہ بھری اور بولیں ”میری کہانی“۔

”آپ کی کہانی؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔ آپ کی کیا کہانی ہے؟“ میں نے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔

”تم ایسا کرو کل صبح میرے گھر آجاؤ۔ بچے پڑھنے جاچکے ہوں گے پھر میں فرصت سے تمھیں اپنی کہانی سناؤں گی اور ہاں کاغذ قلم بھی لے کر آنا۔ مجھے یقین ہے میری کہانی سننے کے بعد تم اُسے لکھے بغیر نہ رہ سکو گے۔“ یہ کہہ کر خالہ باورچی خانے میں چلی گئیں اور میں واپس آگیا۔

رات بھر مجھے تجسس رہا کہ خالہ شبانہ کی ایسی کیا کہانی ہو سکتی ہے۔ امی ان دنوں ایک شادی کے سلسلے میں چچا کے گھر

گئی ہوئی تھیں لہٰذا گھر کے کچھ نہ کچھ کام مجھے کرنے پڑ رہے تھے۔ صبح ناشتا کیا، کچھ ضروری کام نبٹائے اور خالہ شبانہ کی طرف چل پڑا۔ دروازے پر دستک دی۔ ''کون؟'' خالہ نے پوچھا۔ ''میں ہوں مومن۔''

جواب سن کر انھوں نے دروازہ کھولا اور مسکراتے ہوئے بولیں: ''ہاں بھئی کہانی کی تلاش تمھیں صبح صبح میرے گھر لے آئی اچھا یہ بتاؤ چائے پیو گے؟'' میں نے کہا: ''نہیں ناشتا تو میں کر کے آیا ہوں بس آپ جلدی سے کہانی شروع کریں۔'' وہ ایک دم خوش ہوگئیں اور بولیں: ''اب تم قلم لے کر بیٹھ جاؤ اور لکھنا شروع کردو۔''

میں اپنے ساتھ ایک ٹیپ ریکارڈر بھی لے گیا تھا تاکہ روانی سے کچھ نہ لکھ سکوں تو بعد میں سن کر لکھ لوں۔ خالہ نے ایک سرد آہ بھری اور پھر بولیں:

''میری زندگی تو انتظار میں گزر گئی، ایک ایسا انتظار جو لاحاصل سا لگتا ہے۔ یہ تب کی بات ہے جب میں شبانہ انور نہیں بلکہ شبانہ ناصر تھی۔ والدین کی اکلوتی اولاد۔ ناز و نعم میں پل کر بڑی ہوئی۔ بچپن کھیل کود میں گزرا۔ کالج کی تعلیم سے فارغ ہوئی تو گویا شادی کی عمر کو پہنچ چکی تھی۔ انور صاحب کے ابا میرے والد کے قریبی دوستوں میں سے تھے لہٰذا ہمارے گھر اُن کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے لیے لڑکی دیکھ رہی تھیں۔ انھوں نے اماں سے میرا رشتہ مانگ لیا۔ منع کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔''

''انور صاحب کام کے سلسلے میں بیرونِ ملک جاتے رہتے تھے۔ اُن دنوں لاہور آئے ہوئے تھے۔ شادی سے پہلے ابا کو پوری امید دلائی گئی کہ انور صاحب شادی کے بعد مجھے اپنے ساتھ ولایت لے جائیں گے، لیکن میری قسمت میں شاید کچھ اور لکھا تھا۔'' وہ سرد آہ بھر کر ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئیں پھر بولیں: ''ابا نے اپنی بساط سے بڑھ کر میری شادی پر خرچ کیا کہ بیٹی شادی ہو کر ولایت جا رہی ہے اور اُن دنوں یہ بہت بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ ہر شخص خوش تھا۔''

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور بولتیں میں نے جھٹ سوال کر ڈالا: ''کیا آپ بھی اتنا ہی خوش تھیں جتنا باقی گھر والے؟''

سوال سن کر خالہ کچھ دیر تو خاموش رہیں پھر کہنے لگیں: ''ہاں بیٹا مومن! میں بھی بے حد خوش تھی لیکن شادی کی رات ایک خبر مجھ پر بم کی طرح گری اور وہ خبر انور صاحب کی ولایت میں شادی کی تھی!! وہ شادی جس کا ذکر انور کے ابا اور اماں نے میرے والدین سے کرنا گوارا نہ کیا۔ وہ رات مجھے آج تک یاد ہے اور شاید مرتے دم تک یاد رہے گی۔ لوگوں پر سے بھروسا شاید اُس دن سے اُٹھ گیا۔ زندگی بے معنی سی ہوگئی۔ انور صاحب نے مجھے اپنی پہلی شادی کی اطلاع میرے والدین کو دینے سے سختی سے منع کیا اور دھمکی دی کہ اگر میں نے ایسی کوئی حرکت کی تو اس کے نتائج انتہائی سنگین ہوں گے۔ میں مجبور تھی اور تم جانتے ہو بیٹا کہ عورتیں اس معاملے میں عموماً مجبور ہوتی ہیں۔''

''کچھ دن بعد انور صاحب کی واپسی تھی۔ جانے سے پہلے انھوں نے مجھے اپنے پاس بٹھایا اور بولے میں شادی نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن والدین کے سامنے مجبور تھا۔ میں نے بارہا ان سے کہا کہ میری پہلی شادی کا تمہارے والدین کو بتا دیں مگر وہ نہ مانے۔ اگر میں وہاں شادی نہ کرتا تو پاکستان واپس نہیں آ سکتا تھا اور اگر یہاں آ جاتا تو دوبارہ وہاں جانا ممکن نہ ہوتا۔ میں بے بس تھا۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔''

''اتنا کہہ کر وہ اٹھے اور باہر آنگن میں آ گئے جہاں سب اُن کا انتظار کر رہے تھے۔ سب کو اللہ حافظ کہا اور چلے گئے۔ کئی سال گزر گئے لیکن انور ولایت سے واپس نہیں آئے۔ اپنی اماں کو پابندی سے فون کرتے، کبھی کبھار مجھ سے بھی بات ہو جاتی۔ گھر خرچ بہرحال بھیجا کرتے تھے۔ ایک دن اچانک انور کا فون آیا۔ انھوں نے اپنی اماں سے کہا کہ شبانہ سے

میری بات کروائیں۔ یہ میرے لیے ایک نئی بات تھی۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ میں ایک انجانی خوشی دل میں لیے فون کی طرف جیسے بھاگتی ہوئی گئی۔''

''سلام کے بعد انور بولے: ''میں اس مہینے کے آخری ہفتے پاکستان آ رہا ہوں۔'' اس سے پہلے کہ میں اپنی خوشی کا اظہار کرتی وہ بولے: ''یہ بات ابھی کسی کو مت بتانا۔ میں خود آ کر بات کرلوں گا۔ تمہیں پہلے اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم میرے ساتھ گھر والوں کو بھی منا لوگی اور مجھے یقین ہے وہ مان جائیں گے۔ اس کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے تاکہ وہ میری بیوی اور بیٹے کو کھلے دل سے اپنا لیں۔ بولو تم میری مدد کرو گی ناں؟''

''میں جو اتنی دیر سے گم کھڑی تھی، یکا یک چونک گئی اور صرف اتنا ہی کہہ سکی ''آپ پاکستان آ جائیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' نم آنکھیں لیے کمرے کی طرف پلٹی۔ اماں نے پوچھا کیا کہہ رہا تھا۔ میں نے اُن کے پاکستان آنے کی خبر سنائی تو اماں خوشی سے جھوم اٹھیں لیکن میری نم آنکھوں کو دیکھنے وہاں کوئی نہ تھا''۔ میں خالہ کی آنکھوں میں نمی اس وقت بھی محسوس کر سکتا تھا جب یہ سب بتا رہی تھیں۔ وہ نہایت کرب میں تھیں جبکہ یہ بات اب اُن کے ماضی کا حصہ بن چکی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ پھر سے غمگین ہوگئی ہیں۔

انھوں نے بات جاری رکھی۔ ''بہرحال چند ہفتے بعد انور پاکستان آ گئے۔ پہلے تو اُن کے اماں ابا نے خاصا ہنگامہ کیا فحش میرا دل خوش کرنے کے لیے کیونکہ چند دن بعد ہی اُن کی بہو اور نیلی آنکھوں والا پوتا اُن کے دل میں جگہ بنا چکا تھا۔''

''اور خالہ آپ؟ آپ کے دل پر کیا گزری؟'' میں نے جھٹ سوال کر ڈالا۔

میرا سوال سن کر وہ مسکرائیں پھر اداسی سے بولیں: ''میرے دل پر کیا گزری اس کی اہمیت کب تھی؟ اور کس کے لیے تھی؟ بہرحال میں نے اپنے وعدے کے مطابق کسی قسم کا کوئی احتجاج نہیں کیا۔''

''اور آپ کے والدین؟'' میں نے پھر سوال کر ڈالا۔

''وہ آئے تھے۔ اس بارے میں بات کرنا چاہتے تھے۔ شدید غم اور غصے کا شکار تھے لیکن میں نے انھیں منع کر دیا کیونکہ اس کے بعد میرا کیا انجام ہوتا یہ مجھے بخوبی معلوم تھا۔''

''میں نے انور اور اُن کی پہلی بیوی کا پورا پورا خیال رکھا۔ میں ان کی بیوی سے نفرت کرنے کا حق رکھتی تھی لیکن میں نے نجانے کیوں ایسا نہیں کیا! ہماری زبانیں مختلف تھیں۔ بظاہر وہ بے حد معصوم نظر آتی تھی۔ شاید ہو بھی؟ جیسے میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ شاید اُس کا بھی نہ ہو۔ اصل قصوروار تو انور تھے۔''

''ایک مہینا گزر گیا اور واپسی کے دن آ گئے۔ جانے سے پہلے ایک دن انور میرے کمرے میں آئے اور بولے شبانہ میں نے تم سے بڑی قربانیاں مانگی ہیں ایک مہربانی اور کرو میری ذات پر۔''

''کیا؟'' میں نے دوسری طرف منہ پھیرے لاپروائی سے پوچھا۔ ''شبانہ میں بیٹے، علی کو تمہارے حوالے کر کے جانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں وہ یہاں رہے اور تم اُسے ماں بن کر پالو۔''

''کیا؟ یہ کہا تھا انکل نے آپ سے؟ اور آپ مان گئیں؟'' میں جذباتی سا ہو گیا اور یک دم کئی سوال کر ڈالے۔ خالہ نے آہستگی سے جواب دیا: ''نہیں پہلے تو میں نے انکار کر دیا تھا لیکن بعد میں مجھے ان کا فیصلہ ماننا پڑا۔ انور کا فیصلہ مجھے اُس عورت پر بھی ظلم لگ رہا تھا لیکن پھر میں نے دیکھا کہ اُس انگریز عورت کو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ اُس کا بچہ یہاں میرے پاس رہے۔ جب گھر والوں کو اس بات کا علم ہوا تو سب نے مجھے یہی کہا کہ تم انور کی بات مان لو۔ شاید وہ لوگ پہلے ہی، دل سے اس فیصلے پر راضی ہو چکے تھے۔''

''انور اور اُس کی بیوی چلے گئے اور ننھے علی کو میرے پاس چھوڑ گئے۔ وقت گزرتا گیا۔ علی جو اُس وقت صرف چھ ماہ کا تھا وقت کے ساتھ ساتھ بڑا ہوتا گیا۔ انور کے والدین کی طبیعت ناساز رہتی تھی۔ پورا دن اُن کی اور علی کی دیکھ بھال کرتے گزر جاتا۔ رات کو جب تھک کر بستر پر لیٹتی تو کبھی اپنی قسمت کو ملامت کرتی اور کبھی اپنے والدین کے فیصلے کو یاد کر کے روتی۔ چند سال بعد یکے بعد دیگرے انور کے والدین اس دنیا سے رخصت ہو گئے''۔

''اب گھر میں صرف علی اور میں رہ گئے۔ کبھی کبھی مجھے علی پر شدید غصہ آتا اور میں اسے معمولی باتوں پر شدید سزا دے ڈالتی، لیکن پھر سوچتی آخر اس ننھی جان کا کیا قصور؟ لیکن میرا بھی تو کوئی قصور نہ تھا۔ میں بھی تو ایک ایسی سزا کاٹ رہی تھی جس کا کوئی انجام نظر نہیں آتا تھا۔ علی جب بارہ سال کا ہوا تو انور عید پر پاکستان آئے۔ وہ اس دفعہ بھی تنہا نہیں تھے۔ اس بار وہ اپنے ایک سالہ بیٹے فرخ کو میرے حوالے کرنے آئے تھے''۔

''میں ایک مرتبہ پھر خاموش رہی۔ اس عرصے میں میرے والدین بھی اس دنیا سے جا چکے تھے۔ کون تھا جسے میں اپنا دکھ سناتی؟'' خالہ کی آنکھیں ایک مرتبہ پھر آنسوؤں سے بھیگ گئیں اور کیوں نہ بھیگتیں خود میری آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ کوئی کسی پر اتنا ظلم کیسے کر سکتا ہے؟

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئیں۔ ''انور ہر مہینے مجھے رقم ارسال کرتے تھے اور میں اُن کے بچوں کی ضروریات پوری کرتی رہتی۔'' پھر مسکراتے ہوئے بولیں ''اب بھی پوری کر رہی ہوں اور یونہی کرتی رہوں گی۔''

میں نے سوال کیا: ''لیکن آپ نے یہ سب کیوں کیا؟ اپنے حق کے لیے کیوں نہیں لڑیں؟''

خالہ نے میری بات سن کر نرمی سے جواب دیا: ''مومن بیٹا! آج جو یہ سب کچھ تم دیکھ رہے ہو، اُن بچوں کی وجہ سے ہی ہے۔ اُس وقت اگر میں وہ تلخ فیصلہ نہ کرتی تو آج میرے پاس یہ گھر نہ ہوتا۔ انور ان بچوں کی بدولت ہی سہی مجھ سے رابطہ تو رکھتے ہیں۔ بے شک یہ بات ظلم ہے مجھ پر لیکن میرا گھر ہے، معاشرے میں عزت سے رہ رہی ہوں، یہ اُس ایک فیصلے کی وجہ سے ہی تو ہے۔ یہ بچے میرے نہیں لیکن مجھے ان سے بے حد محبت ہے۔ مارتی تو سگی ماں بھی ہے۔ میں ماروں گی تو سوتیلی کہلاؤں گی۔ یہ مجھے معلوم ہے لیکن پھر بھی مجھے ان سے محبت بھی ہے۔''

میں نے پھر سوال شروع کر دیے: ''یہ سب باتیں اپنی جگہ لیکن آپ نے تو ساری زندگی ان بچوں کے نام کر دی۔ انور صاحب نے تو کبھی آپ سے محبت نہیں کی پھر آپ اُن کے بچوں پر کیوں جان نچھاور کر رہی ہیں؟''

''ایسا نہیں ہے''۔ خالہ نے یقین سے جواب دیا: ''انور کو کبھی تو میری قربانیوں کا احساس ہو گا۔ کبھی تو وہ میری جانب پلٹیں گے۔''

وہ خاموش ہوئیں تو میں نے ایک سرد آہ بھر کر کہا: ''خالہ شبانہ جب آپ کی اتنی قربانیاں انھیں قائل نہ کر سکیں کہ آپ کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے تو یہ بچے کیا قائل کریں گے؟ آپ کا انتظار تو انتظار لا حاصل ہے جیسا کہ آپ نے پہلے کہا تھا''۔ یہ کہہ کر میں دروازے کی طرف چل پڑا پیچھے مڑ کر نہ میں نے دیکھا نہ آنٹی نے آواز دی کیونکہ ہم دونوں کی آنکھیں نم تھیں۔

قارئین!! انور صاحب کا ایک بیٹا کالج اور دوسرا پرائمری میں ہے۔ نجانے آنے والے برسوں میں کیا ہو گا۔ انور صاحب اپنے بچوں کو اپنے پاس بلوا لیں گے یا پھر بچے اپنی اس ماں کے لیے جو بظاہر تو سوتیلی ہے لیکن بے حد محبت سے انھیں پال رہی ہے، اس کی محبت میں جانے سے انکار کر دیں گے۔ یہ جاننے کی خاطر آپ کو چند سال انتظار کرنا ہو گا۔ اگر ممکن ہوا تو چند سال بعد آپ کو اس کہانی کا اختتام ضرور بتاؤں گا۔

سَر داؤد کی مَجلس

عبدالصبور شاکر

ایک بابرکت محفل کا ایمانی جذبے سے سرشار ذکرِ خیر

سر داؤد میرے پسندیدہ ترین استاد ہیں۔ ان کی ایک عادت ہے کہ جب بھی جماعت میں آئیں، ایک آدھ دلچسپ واقعہ، نصیحت آموز کلمہ یا حدیث مبارکہ ضرور سناتے ہیں۔

ایک دن تشریف لائے، اپنی عینک اتاری اور کپڑے کے پلو سے اُسے صاف کرنے لگے پھر فرمایا:

''عزیز طالب علمو! ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ نے ہمیں زندگی گزارنے کا مکمل طریقہ سکھایا ہے۔ انسان فطری طور پر سماج میں رہنا پسند کرتا ہے۔ مل جل کر بیٹھنا، باہم مشورہ اور مجالس منعقد کرنا اس کی بنیادی ضرورت ہے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے مجلس کے آداب بھی اپنی امت کو سکھائے ہیں۔ کیا میرے شاگردوں میں سے ایک مجھے اس سلسلے میں نبی ﷺ کا کوئی فرمان سنا سکتا ہے؟''

یہ کہہ کر سر داؤد نے اپنی مخصوص مسکراہٹ پوری جماعت پر ڈالی اور پھر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ احمد جو ہمیشہ ایسی باتوں میں دل چسپی لیتا ہے، کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا: ''سر! مجھے

پروفیسر ڈاکٹر مجیب ظفر انوار حمیدی

گُلچے والا!

سُنّتِ نبوی ﷺ پر عمل کرتے ہوئے مصنف نے وی آئی پی کا مرتبہ حاصل کرلیا

دستگیر بلاک ۱۵، فیڈرل بی ایریا، کراچی ہمارا من پسند علاقہ ہے۔ وجہ بتائے دیتے ہیں کہ مرکزی سڑک کے دائیں بائیں کھانے پینے کی کئی دُکانیں ہیں۔ ہوٹل بھی جو پورا سال ''آباد'' رہا کرتے ہیں لیکن موسم سرما میں کھانے پینے کا مزہ دوبالا ہوجاتا ہے۔ اس لیے وہاں خوب رونق لگی رہتی ہے۔

مرکزی راہ سے پیچھے خوبصورت، صاف ستھرے مکانات

ہیں۔ ان ہی گھروں میں سے ایک ہمارے رفیق کار اور بچوں کی جریدی صحافت کے انتہائی بزرگ ادیب جناب مسعود احمد برکاتی کا بھی ہے۔ ہماری عادت ہے کہ ہم نمازِ فجر اپنے گھر سے دُور واقع مساجد میں ادا کرتے ہیں۔ بعد نماز اپنے معالج کے مشورے کے مطابق صاف ستھری فضا میں تیز اور دست قدمی کرتے ہیں۔ اس دوران ہم اپنے علاقے اور آس پاس کے ''بلاکس'' کا جائزہ بھی لیتے اور ''صفائی ستھرائی'' کے کئی مسائل متعلقہ محکمہ کے افسروں سے حل کروا لیتے ہیں۔ اسی باعث ہمیں نیک لوگوں کی ڈھیر ساری دعائیں بھی مل جاتیں اور لوگوں کا کام بھی سہل ہوجاتا۔

ہم روزانہ علیل مسعود برکاتی صاحب کو زحمت دینا مناسب نہیں سمجھتے چنانچہ اُن کے ''گیٹ'' کو سلام گزار کر واپس اپنے گھر لوٹ آیا کرتے۔

برکاتی صاحب کے گھر سے واپسی پر دائیں جانب، ایک گلچے والا اپنی دُکان، علی الصبح سجائے اور تنور گرم کرتے ملا کرتا۔ پورے علاقے میں اُس جیسا ماہر ''گلچہ گر'' نہیں تھا۔ ہم واپسی پر ناشتے کے لیے چند گلچے خرید لیتے، ایک دو سادہ گلچے اپنے اور بیگم کے لیے اور باقی روغنی گلچے بچوں کے واسطے۔ بچے پارٹی جس روز عجلت میں ہوتی تو وہ اپنے مزے دار گلچے اسکول کی آدھی چھٹی میں کھانے کو ساتھ لے جاتی۔ یُوں جب تک بچے چھوٹے رہے، ہماری بیگم ہمیں بچوں کو ''لنچ'' بنا کر نہ دینے پر ہمیں دعائیں دیتی رہیں۔

لیکن بھئی کب تک؟؟ ہم بوڑھے اور بچے ماشاء اللہ

بڑے ہوگئے۔ پھر شادیوں کے بعد، اُن کے بھی بچے تولد ہوئے۔ وقت کا کام ہی گزرنا ہے۔ گلچے والے صاحب بھی ضعیف ہوگئے۔ اب اُن میں جوانی والی طاقت نہیں رہی تھی لیکن سابقہ تجربے کی بنا پر کام کیا کرتے۔ ساتھ اُن کی جوان اولاد بھی تھی اور ملازم بھی۔ دُکان کے گاہکوں میں گزشتہ چالیس برس میں اچھا خاصا اضافہ ہوا تھا، لیکن ہر کوئی سودا پہلے حاصل کرنا چاہتا تھا۔

لیجیے! ہم گلچے والے کا نام بتانا تو بھول ہی گئے۔ رشید نام تھا اُن کا۔ ہم جس مسجد میں جایا کرتے، وہاں رشید میاں بھی نماز ادا کرتے۔ نماز کے بعد ہم اِدھر اُدھر کی باتیں اور سیر کیا کرتے پھر رشید میاں اپنے گلچے لگانے کا کام شروع کردیا کرتے اور ہم پارکوں کا رُخ کرتے۔ صبح چار بجے اُن کی اہلیہ گلچوں کا آٹا گوندھ کر رکھ دیا کرتیں، پھر وہ اور رشید میاں اللہ رب العزت کے حضور نمازِ تہجد ادا کرتے۔ گُندھا آٹا لے کر وہ صبح چھ بجے اپنی دُکان پر آجاتے۔

ٹھیک سات بجے گرما گرم خستہ اور سنہرے گلچے پکانے لگتے۔ گاہکوں کا ہجوم لگ جاتا۔ رفتہ رفتہ یہی پُرانے گاہک انتہائی بے صبری کا مظاہرہ کرنے لگے کیونکہ وہ بھی بوڑھے ہو رہے تھے۔ بڑھاپا تو ہے ہی سرتاپا کمزوری اور ''غصہ'' اس کی علامت ہوا کرتا ہے۔

اب ہوتا یوں کہ جلدی جلدی گلچے لگانے میں کبھی رشید میاں گلچے جلا دیا کرتے اور کبھی کچے نکال لیتے۔ اُن کی نظر بھی کمزور ہو چلی تھی۔ موتیے کی بیماری سے بینائی مدہم پڑ چکی تھی۔ اُنھیں نظر کم آتا لیکن پرانے گاہک اُن ہی کے ہاتھوں کے لگے گلچوں کی فرمائش کیا کرتے۔ اکثر رشید میاں پِٹ جاتے، لیکن ہر دم اُن کے چہرے پر ''رزقِ حلال'' کی طمانیت رہا کرتی۔ وہ مسکراتے رہتے اور جلدی جلدی گلچے لگایا کرتے۔

دن مزید گزرے اور اب پُرانے گاہکوں کی جوان اولادوں اور نئی نسل کا اضافہ ہوا۔ اسمارٹ فون اور سوشل میڈیا کے دور کی نئی نسل، جس کی اکثریت کو ''بڑوں بوڑھوں'' کو سلام تو درکنار، سیدھے مُنہ بات کرنے کی توفیق بھی نہیں۔ وہ ''خود رَو'' نجانے کس قوم کی نقالی میں، اُڑتی شور مچاتی موٹر سائیکلوں پر آنکلتے اور روغنی گلچوں کے ساتھ گرما گرم نہاری کی فرمائش کیا کرتے۔

نئی نسل کے یہ بے تابانہ اور بے حجابانہ انداز دیکھ کر رشید میاں نے بھی دو چار ''مسٹنڈے'' ملازم رکھ لیے جو ان جیسوں کا دماغ خُوب درست رکھا کرتے۔ مال بہترین دیتے اور دام ''منہ مانگا'' وصولتے، لیکن رشید میاں کے سال خوردہ گاہکوں کے لیے رویہ بالکل مختلف رکھا کرتے۔ اُن کے ساتھ انتہائی ادب اور احترام سے پیش آتے اور جب تک سودا تیار ہوتا، وہ بزرگ گاہک کو آرام دہ نشست پر بٹھا دیا کرتے۔ سامنے تازہ اخبار رکھا کرتے۔ صاف ستھرا پانی اور چائے بھی کبھی کبھار ہوا کرتی۔ رشید میاں اب بہت کم کام کرتے لیکن جب کام کی زیادتی ہوتی تو خود بھی ''تنور'' سنبھال لیا کرتے۔

ایک روز ایک جوان گاہک آیا۔ دولت اور طاقت کے نشے میں چُور۔ اُس نے دو سو گلچوں کا آرڈر دیا اور شرط رکھی کہ رشید میاں اپنے ہاتھوں سے تیار کریں گے۔ رشید صاحب بولے: ''بیٹا! دوپہر بارہ بجے تک لے جانا۔ اتنا سارا مال مجھ اکیلے سے اتنی جلد تیار نہیں ہوگا۔ ذرا صبر کرلو تو بہترین مال بن جائے گا!''

وہ لڑکا بدتمیزی پر اُتر آیا۔ رشید میاں کے جوان ملازم تو اُس سر پھرے ''نو دولتیے'' کا دماغ درست کردینا چاہتے تھے، لیکن رشید میاں نے اُنھیں خاموش کردیا۔ گلچوں کا تنور رشید میاں کے نئے ملازم نے دہکایا تھا۔ آنچ کافی تیز تھی۔ رشید میاں نے چھ گلچے لگائے تو وہ مقررہ مدت میں گہرے سُرخ ہوگئے۔ مزید چار لگائے تو وہ کچے رہ گئے۔ اب تو جوان آپے سے باہر ہوگیا اور ان کی عمر کا لحاظ کیے بغیر ٹھیک ٹھاک بے عزتی کردی۔ رشید میاں روہانسے ہوکر بولے:

''لڑکے! میں نے تو پہلے ہی تجھ سے صبر کرنے کو کہا تھا، مگر اس نسل میں صبر بھلا کہاں؟''

اتنا سُننا تھا کہ جوان لونڈے نے اُنھیں انتہائی نامناسب لفظ کہہ دیا۔ اس پر ایک جوان ملازم نے آپے سے باہر ہو کر گرم سلاخ اٹھا جو اُس کو دے ماری تو وہ کُتے کی طرح چاؤں چاؤں کرتا اپنی بیش قیمت کار کی جانب دوڑا۔ رشید میاں ہکا بکا، دم بخود کھڑے تھے۔

اتفاق سے میں بھی اُس روز تنور پر موجود تھا۔ وہ اتوار کا دن تھا۔ ہفتہ وار تعطیل کی وجہ سے گاہکوں کا ہجوم تھا۔ ''نان پائے'' اور ''کلیجہ نہاری'' کا تازہ تازہ ناشتا بھی بھوک کی اشتہا بڑھا رہا تھا۔ گاہکوں کے ٹھٹھ لگے تھے۔

رشید میاں کی آنکھوں سے موتیوں جیسے آنسو جاری ہو گئے۔ حالانکہ ہم اور رشید میاں عمر کے جس حصے میں تھے، اُس میں آنسوؤں کے غدود اتنے آنسو نہیں بنا سکتے۔ دُکھ اور بے عزتی کے کرب کی وجہ سے رشید میاں رو پڑے۔ میں آگے بڑھا اور ادھ جلے کچے کلیجوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑتے ہوئے بولا: ''رشید میاں یہ تو کافی حد تک لال ہو چکے۔ عنقریب تھا کہ جل جاتے۔ اس پورے علاقے میں تم جیسا ماہر کاری گر تو موجود ہی نہیں ہے۔ برسوں سے یہ کام کر رہے ہو۔ ماشاء اللہ!! اللہ تمہیں اور تمہاری اولاد، گھر بار، گاہکوں کو سلامت رکھے اور ہم سب کے رزق حلال میں خُوب خُوب برکت دے، آمین! اس طرح کے لال کلیجے کوئی عام آدمی لگا ہی نہیں سکتا۔''

میری بات سُن کر اُنھوں نے میری طرف ایسے دیکھا جیسے اُنھیں یقین نہ آیا ہو۔ آس پاس کھڑے گاہک بھی میری بات کی گہرائی تک پہنچ کر مسکرا اُٹھے۔ میں نے اُن کا حوصلہ مزید بڑھاتے ہوئے کہا: ''اس پورے علاقے میں تمہارے جیسا اُستاد نہیں ہوگا۔ کاش تم خود ہی تنور بھی گرم کرتے۔''

یہ سُن کر رشید میاں کو جیسے نئی توانائی مل گئی۔ یکدم اُن کا موڈ خوشگوار ہو گیا۔ چہرے پر مسکراہٹ آ گئی اور اُنھوں نے کہا: ''پروفیسر صاحب! اگر سب لوگ تھوڑا صبر کر لیں تو سب کو بہترین سودا مل جائے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں تنہا بھی یہ کام کر سکتا ہوں لیکن گاہکوں کو صبر اور عزتِ نفس کا احترام کرنا ضروری ہے۔ اب میرے ساتھ نیا اسٹاف بھی تو ہے نا!''

وہ دن ہے اور آج کا دن، میں جب بھی جاؤں، رشید میاں میرے لیے ''اسپیشل کلیجے اور نان'' خود لگاتے ہیں۔

آج صبح، جب میں بیوی کے کہنے پر کلیجے خریدنے گیا تو رشید میاں ناشتا ہی کر رہے تھے۔ اُن کا ملازم کلیجے لگا رہا تھا۔ ہجوم کافی ہونے کے باوجود اُنھوں نے اپنے ملازم سے کہا کہ میرے لیے وہ خود تنور پر کلیجے لگائیں گے۔ تاؤ اتنا کم کر دو اور باقیوں کے تم خود کلیجے لگا دو۔ ملازم ''جی بہتر'' کہہ کر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ رشید میاں جلدی جلدی ناشتے سے فارغ ہو کر میرے لیے کلیجے لگانے لگے۔ بہترین قسم کے بھرے ہوئے تِلّوں والے، خستہ و کرارے کلیجے جو تازہ دہی کے ساتھ مزہ دے جاتے ہیں۔ اس جگہ موجود باقی لوگ مجھے کوئی ''وی آئی پی'' سمجھ رہے تھے۔ مجھے ہنسی آ گئی۔

وہ واقعہ یاد دلا کر رشید میاں کو چھیڑا تو ہنس کر بولے: ''آپ پڑھے لکھے، قابل انسان ہیں پروفیسر صاحب، الفاظ کا استعمال جانتے ہیں۔ ہم ٹھہرے ان پڑھ لوگ!'' وہ مسکراتے رہے، زمانے نے اُنھیں بھی بہت کچھ سکھا دیا تھا۔

میں سوچ رہا تھا۔ مجھ گناہ گار نے تو صرف سرکارِ دو جہاں ﷺ کے ایک قول پر عمل کیا تھا، جس میں آپ ﷺ نے دوسروں سے اخلاق اور شفقت سے پیش آنے کا حکم دیا ہے۔ اس قول پر عمل کرنے سے ہی مجھے نہ صرف عزت ملی بلکہ ''بہترین سروس'' ملنا شروع ہو گئی۔ اگر نبی کریم ﷺ کے تمام افکار پر عمل کر لیا جائے تو مسلمانوں کو دنیا ہی میں جنت مل جائے اور ان کی زندگی امن و امان اور سلامتی کا گہوارہ بن جائے۔ سبحان اللہ!!

ارم ناز

موسم بہار نے جیسے ہی سبز رنگ کا لبادہ اوڑھا، ہم سب دوستوں نے بھی ہائیکنگ کے لیے شمالی علاقہ جات کا رخ کر لیا۔ موسم خاصا خوشگوار تھا۔ وہاں پہنچ کر سب نے سامان رکھتے ہی اپنے شوق کو مہمیز دیتے خوبصورت پہاڑی سلسلے پر ہائیکنگ کا آغاز کر دیا۔ سب ہنستے مسکراتے، ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ اور اردگرد کے ماحول پر تبصرے کرتے چلتے چلے جا رہے تھے کہ اچانک ایک خطرناک موڑ پر ذرا سا احتیاط کا دامن چھوٹا اور ہمارا ایک دوست پھسل کر چند فٹ نیچے کھائی میں جا گرا۔

آپ مرنا چاہتے ہیں؟

گھر یا دفتر میں فرسٹ ایڈ بکس کی عدم موجودگی از خود موت کو دعوت دینے کے برابر ہے

ہم سب واپس بھاگتے ہوئے جب دوست تک پہنچے تو اس کے سر سے خون فوارے کی طرح جاری تھا۔ اس سنگین صورتحال میں پہلے تو سمجھ ہی نہ آیا کہ کیا کریں؟ سب فوراً اپنے سامان کو کھنگالنے لگے کہ شاید ایسی کوئی چیز مل جائے جو خون بند کرنے کے کام آ سکے لیکن کسی کے پاس ابتدائی طبی امداد کا کوئی سامان موجود نہیں تھا۔ اس وقت ہمیں فرسٹ ایڈ بکس کی اہمیت کا احساس ہوا جس کے بارے میں ہمارے اساتذہ ہمیں بتاتے تھے۔

مایوس ہو کر ہم نے مدد کے لیے پکارنا شروع کیا لیکن کوئی آس پاس ہوتا تو مدد کو آتا۔ جب تک ہم اپنی مدد آپ کے تحت اسے اسپتال لے کر پہنچے تب تک ہمارا پیارا ساتھی زیادہ خون بہہ جانے کے باعث زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔

☆☆☆

حادثات اور ناگہانی آفات انسان کے روزمرہ معمول کا حصہ ہیں۔ تاریخی نکتہ نظر سے دیکھیں، تو قبل از تاریخ بیماری یا حادثات کی صورت میں ان سے نمٹنے کے اصولوں سے انسان

مکمل طور پر نابلد تھا۔ اس لیے اکثر زخمی ناقص طریقوں اور طبی سہولیات کی عدم دستیابی کے باعث راہِ عدم سدھار جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ انسان نے ترقی کی اور اپنی ضرورت کے پیشِ نظر بیماریوں اور زخمیوں کا علاج کرنے کے لیے جہاں جدید طریقوں کو دریافت کیا وہیں ابتدائی طبی امداد کی فراہمی کے لیے بھی اقدامات کیے۔ ابتدائی طبی امداد کا باقاعدہ آغاز ۱۰۹۹ء میں ہوا جب سینٹ جان نے طبی علاج کا انتظام کیا اور حکم دیا کہ ایسے بہادر آدمیوں کو علاج معالجے کی تربیت دے کر تیار کیا جائے جو دورانِ جنگ جنگجوؤں کے زخموں کے علاج میں خصوصی مہارت رکھتے ہوں۔ اس طرح انھوں نے ابتدائی امداد کا انتظام کرنے والے افراد کی پہلی ریکارڈ مثال قائم کی۔

اسی طرح ۱۷۹۲ء میں، زخمی فوجیوں کی دیکھ بھال کے لیے فرانسیسی آرمی سرجن جنرل نے پہلا سرکاری آرمی میڈیکل کور قائم کیا اور لوگوں کو اسپتالوں سے دور رہ کر نامساعد حالات اور دستیاب آلات کے ساتھ کام کرنے کے لیے تربیت دی گئی۔ تربیت کے بعد ان کو پہلا ٹاسک یہ دیا گیا کہ جنگ کے دوران جو بھی فوجی زخمی ہوں ان کو فوری طور پر ابتدائی طبی امداد فراہم کی جائے اور شدید صورتحال میں انھیں گھوڑا گاڑیوں کے ذریعے فیلڈ اسپتال منتقل کر دیا جائے، یوں بہت سے افراد کی زندگی بچائی گئی۔

''فرسٹ ایڈ'' کی اصطلاح کا آغاز سب سے پہلے ۱۸۷۸ء میں برطانیہ میں ہوا۔ یہ اصطلاح ''فرسٹ ٹریٹمینٹ'' اور ''نیشنل ایڈ'' کے ملاپ سے بنی ہے۔ اس طرح تاریخ میں فرسٹ ایڈ یعنی ابتدائی طبی امداد کی اصطلاح کا باقاعدہ آغاز ہوا۔

حادثات کے رونما ہونے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ انسان کو کبھی بھی پریشان کن حالات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ ایسے کسی بھی سنگین حادثے کے باعث جب ہم یا ہمارا کوئی عزیز زخمی یا بیمار ہو جائے تو فوراً اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ہمارے اردگرد کوئی تو ایسا ہو جو فوری ہماری مدد کو پہنچ کر تکلیف کی شدت کو کم کرے یا مزید نقصان سے بچا سکے۔ اس لیے حادثاتی

جگہ سے اسپتال پہنچنے تک کا وقفہ نہایت اہم ہوتا ہے اور اسی پر مریض کی زندگی کا دارومدار ہوتا ہے۔

حقائق سے واضح ہے کہ پوری دنیا میں ہر پانچ سیکنڈ کے بعد ایک شخص کسی نہ کسی حادثے کا شکار ہو کر صرف بروقت اور مناسب ابتدائی طبی امداد نہ ملنے سے لقمۂ اجل بن جاتا ہے۔ پاکستان بیورو آف شماریات کے مطابق ۲۰۱۶ء میں میں تقریباً ۹۱۰۰ روڈ ایکسیڈنٹ ہوئے جن میں سے ۱۴۴۴۸ افراد بروقت طبی امداد نہ ملنے کے باعث خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق صرف ٹریفک حادثات میں ہی ۱۲۰۰ سے زیادہ افراد روزانہ زخمی یا معذور ہو جاتے ہیں۔

ابتدائی طبی امداد یا فرسٹ ایڈ ایسی ہی صورتحال میں ''کسی زخم یا حادثے کی صورت میں تفصیلی طبی تشخیص سے قبل دی جانے والی مرہم پٹی ہے''۔ اس کے درج ذیل مقاصد ہو سکتے ہیں:

☆ بہتے خون کو روکنا
☆ زخم کو گہرا نہ ہونے دینا
☆ زخمی کی جان بچانا
☆ اعضا کا تحفظ
☆ چوٹ یا زخموں کے اثرات حتی الامکان کم سے کم کرنا
☆ مزید علاج و معالجے میں مدد دینا
☆ وقت ضائع کیے بغیر طبی امداد دینا

اس لیے حادثات کی صورت میں فرسٹ ایڈ، یعنی ابتدائی طبی امداد بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس سے نہ صرف مریض کو فوری آرام پہنچا کر طبی پیچیدگیوں میں کمی لائی جاتی ہے بلکہ ناگہانی موت کے خطرے کو بھی وقتی طور پر ٹالا جا سکتا ہے۔ حادثات ہمیں گھر اور باہر دونوں جگہ پیش آ سکتے ہیں۔ گھر سے باہر پیش آنے والے حادثات میں روڈ ایکسیڈنٹ، اونچائی سے گرنا یا آگ سے جل جانا وغیرہ شامل ہیں۔ ایسی صورتحال میں زیادہ تر اموات سانس نہ آنے، آگ میں جھلس جانے، خون کے بہت زیادہ مقدار میں ضائع ہو جانے یا دل بند ہونے کی صورت میں ہوتی ہیں اور اگر خوش قسمتی سے متاثرہ شخص بچ جائے تو نتیجہ دائمی معذوری کی صورت میں سامنے آتا ہے جو زیادہ تر مریض کی نامناسب دیکھ بھال، ابتدائی طبی امداد کی عدم دستیابی یا پھر غلط طریقے سے جائے حادثہ سے اسپتال منتقلی کی وجہ سے رونما ہوتا ہے۔

گھر میں پیش آنے والے حادثات اور ایمرجنسی صورتحال مختلف طرح کی ہو سکتی ہیں جیسے بخار کا تیز ہونا، سر یا جسم کے کسی حصے میں چوٹ کا لگنا، گرنے سے ہڈی کا ٹوٹ جانا یا موچ آنا، انگلی پر کٹ لگ جائے یا قے دست ہو جائیں وغیرہ۔ ایسی تمام صورتحال میں اگر ہنگامی بنیاد پر اسپتال جانا، ڈاکٹر سے رابطہ کرنا ممکن نہ ہو یا پھر پیشہ ورانہ مدد پہنچنے میں دیر ہو تو فوری اور مناسب طریقۂ کار استعمال کر کے دی جانے والی ابتدائی طبی امداد نہ صرف شرح اموات بلکہ روزمرہ حادثات کے جسمانی اثرات میں بھی واضح کمی کا سبب بنتی ہے۔

ابتدائی طبی امداد کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ متاثرہ شخص کو وقتی آرام پہنچا کر، اس کی تکلیف میں کمی لائی جا سکے اور اسپتال پہنچنے تک مریض کو کسی قسم کی سنگین یا ناگہانی صورت حال پیش نہ آئے۔ یہ بات بھی مدنظر رہے کہ ابتدائی طبی امداد کے ذریعے حتمی چیک اپ نہیں کیا جاتا۔ اس لیے اسی پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی پیشہ ورانہ طبی امداد ایمرجنسی سروس یا اسپتال کا نعم البدل ہے۔ یہ محض وہ بنیادی اقدامات ہیں جن کی بدولت مریض کی زندگی پر منڈلانے والی موت یا معذوری کے خطرے کو وقتی طور پر دور کر کے متاثرہ شخص کی حالت مزید بدتر ہونے سے بچائی جاتی ہے۔

کامیاب طبی امداد کا دارومدار اس بات پر ہے کہ مدد فراہم کرنے والا شخص فرسٹ ایڈ میں ماہر ہو تاکہ حادثے کی نوعیت اور صورتحال کے لحاظ سے وہ اپنی ذمہ داری بطریق احسن ادا کر سکے۔ اس کو طبی امداد کے بنیادی اصول و ضوابط کی باقاعدہ تربیت دی جائے کہ کس قسم کے حادثے میں کونسا عمل پہلے یا بعد میں کرنا ہے، کس طرح جائے سانحہ کا جائزہ لے کر متاثرہ افراد تک رسائی حاصل کر کے ان کو وہاں سے نکالنا

ہے۔ مثال کے طور پر جائے حادثہ پر موجود بے ہوش، زخمی یا جل جانے والے شخص کو کیا ابتدائی طبی امداد دینی چاہیے؟ نبض کا معائنہ کس طرح کیا جائے؟ تنفس کو کیسے بحال کیا جائے اور ہوش میں لانے کے لیے کیا طریقے اختیار کیے جائیں؟ دم گھٹ جانے یا دل کا دورہ پڑنے پر ایسے کیا اقدامات کیے جائیں جو مریض کو اسپتال تک پہنچنے میں فائدہ مند ہوں، چنانچہ کسی بھی ایسی صورت حال میں حواس بحال رکھ کر ہنگامی اقدام کرنا ایک ماہر فرسٹ ایڈر کا ہی کام ہوتا ہے۔ یہ تب ہی ممکن ہے جب اس کے پاس بنیادی معلومات ہوں بلکہ وہ ابتدائی طبی امداد فراہم کرنے والے آلات بھی رکھتا ہو۔ یہ مرحلہ باقاعدہ تربیت حاصل کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

اس ضمن میں فرسٹ ایڈ باکس بے حد اہمیت کا حامل ہے، یعنی ''ایسا ڈبا جس میں وہ تمام ادویہ اور ضروری اشیاء موجود ہوں جو کسی بھی ہنگامی صورت حال میں ابتدائی طبی امداد فراہم کرنے کے کام آئیں''۔ اس میں ہر وہ چیز شامل ہے جس سے مریض کی فوری طور پر جان بچائی جاسکے لیکن اپنی ضرورت اور علاقے کے مطابق ردوبدل کرنا ممکن ہے۔

فرسٹ ایڈ بکس کو گھر، دفتر، کار اور ہر اس مقام پر ساتھ رکھنا چاہیے جہاں کسی بھی وقت ایمرجنسی کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ اس کٹ میں بنیادی بیماریوں، حادثات اور سنگین صورتحال سے نمٹنے کے لیے اشیاء جیسے ادویہ، آلات اور انجیکشن وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کے مطابق فرسٹ ایڈ بکس میں درج ذیل اشیاء لازمی ہونی چاہئیں۔

ادویات

تمام ادویات ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق فرسٹ ایڈ بکس میں رکھیں۔

☆ آنکھوں میں ڈالنے کے لیے قطرے، جو جلن یا کسی بھی حادثے کی صورت میں آنکھوں کی حفاظت کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

☆ قے یا دست روکنے کے لیے سیرپ

☆ اسپرٹ: زخم صاف کرنے کے لیے

☆ کیڑے مکوڑے بھگانے کے لیے ریپیلنٹ

☆ کیڑے یا سانپ کے کاٹنے کا علاج

☆ اینٹی الرجی ادویہ

☆ پیراسیٹامول، اسپرین یا درد و بخار کی دیگر گولیاں

☆ ناک میں ڈالنے والے قطرے

☆ اورل ری ہائیڈریشن سالٹ

☆ اینٹی بائیوٹک کریم یا لیکوئیڈ: زخموں پر لگانے اور انھیں صاف کرنے کے لیے۔

☆ اینٹی فنگل کریم: پھپھوندی کے باعث زخم خراب ہونے سے بچاؤ کے لیے۔

دیگر آلات

دیگر آلات میں درج ذیل اشیاء شامل ہیں۔

☆ ٹروما شئیر

جسے ٹف کٹس کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔ یہ پیرامیڈیکس اور دیگر ہنگامی طبی اہلکار کے استعمال میں آنے والی قینچی کی ایک قسم ہے جو فوری طور پر اور محفوظ طریقے سے زخمی لوگوں کے لباس کاٹنے میں استعمال ہوتی ہے۔ عام طور پر دھاتی بلیڈ کے ساتھ ایک پلاسٹک کے ہینڈل پر مشتمل ہوتی ہے جو ۱۵۰ ڈگری میں پھیل جاتی ہے، عام قینچی کے مقابلے میں اس کے غیر معمولی ہونے کی وجہ اس کا طویل ''لیور آرم'' ہے۔

☆ بینڈ ایجز یا پلاسٹر

یہ چپکنے والی سٹرپس ہیں۔ ان کو ۱۹۲۰ء میں جانسن نے اپنے ملازم ایرلے ڈکسن کی مدد سے اپنی بیوی جوزفین، کے لیے ایجاد کیا۔ کھانا پکانے کے دوران نہ صرف اس کے ہاتھ پر کٹ لگ گیا بلکہ آئل کے چھینٹوں کے باعث وہ جل بھی گئی تھی۔ اس کو چھوٹے اور معمولی نوعیت کے زخموں پر لگانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

☆ عینک یا آنکھوں کی حفاظت کے لیے کور

☆ وائپس: زخموں کی صفائی کے لیے وائپس استعمال کیا جاتا ہے۔

☆ قینچی: پٹیاں کاٹنے کے لیے قینچی بہت ضروری ہے۔

☆ پٹی کا رول: زخموں کی ڈریسنگ کے لیے۔

☆ ڈسپوزیبل نان لیٹیکس گلوز۔۔۔ دستانے

☆ سرجیکل ماسک

☆ چمٹیاں

☆ سیفٹی پن

☆ چپکنے والی ٹیپ

☆ تھرمامیٹر

☆ گرم پانی کی بوتل

☆ سن سکرین

☆ آئس بیگ

☆ لائٹر

☆ ٹارچ

☆ ایمرجنسی کمبل

☆ ائیر پلگ

☆ ابتدائی طبی امداد کی ضروری ہدایات

وطن عزیز کے اخبارات روزانہ ایسی خبروں سے بھرے ہوتے ہیں کہ ٹریفک حادثے کے بعد افراد زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسے۔ ہمارے ہاں ایسے لوگ بکثرت پائے جاتے ہیں جو حادثے کے بعد زخمیوں کی جان بچانے کے بجائے کھڑے تماشا دیکھتے رہتے ہیں۔ لوگوں کی جان اس لیے بھی نہیں بچائی جاتی کہ ان کے آس پاس موجود کسی بھی فرد کو ابتدائی یا فوری طبی امداد دینا نہیں آتی۔ عام لوگوں میں ابتدائی طبی امداد سے متعلق معلومات بھی بہت کم ہوتی ہیں۔ حتیٰ کہ حادثے کے بعد اسپتال لانے تک جونیئر ڈاکٹروں کی اکثریت کو بھی مناسب تربیت دینا نہیں آتی۔

ان وجوہات کی بنا پر حادثے کے فوری بعد کا قیمتی وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً لوگ جائے حادثہ سے اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتے ہیں۔ پاکستان جیسے ملک میں جہاں حادثات بہت عام ہیں، فرسٹ ایڈ کی چند بنیادی باتیں سیکھ کر کئی قیمتی جانیں بچانا ممکن ہو سکتا ہے۔ عوام الناس میں فرسٹ ایڈ سے متعلق شعور بیدار کرنے اور لوگوں میں اس کی اہمیت اجاگر کرنے کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات کیے جاسکتے ہیں:

☆ ہر وقت ابتدائی طبی امداد کی رسائی کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے میں زیادہ سے زیادہ ''فرسٹ ایڈ'' کی تربیت عام کی جائے۔ اس کے لیے کالج و یونیورسٹی اور دفاتر میں تربیتی کورسز کا انعقاد کیا جائے۔ اس کے علاوہ سرکاری و غیر سرکاری ملازمت کے حصول کے دیگر کوائف کے ساتھ فرسٹ ایڈ کا تربیتی سرٹیفکیٹ بھی لازمی قرار دیا جائے۔

☆ عام عوام کو نہ صرف زندگی بچانے کی مہارتوں پر عبور حاصل کرنے کے طریقے بھی بتائے جائیں بلکہ فرسٹ ایڈ میں کام آنے والے ہر طبی آلے اور ادویات کے بارے میں بھی بنیادی علم موجود ہو۔

☆ ایمرجنسی سروس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن بحیثیت شہری ہر ایک کو طبی امداد کی تربیت حاصل کرنی چاہیے تاکہ حادثے یا سانحے کی صورت میں وہ زیادہ سے زیادہ متاثرین کو امداد فراہم کر سکیں۔

ابتدائی طبی امداد کی فراہمی ہر زخمی شخص کا بنیادی حق ہے اور عام آدمی کا فرض بھی۔ اس لیے مندرجہ بالا چھوٹے مگر انتہائی دوررس نتائج کے حامل اقدامات سے ہم وطن عزیز میں ایسی بہترین اور تربیت یافتہ افرادی قوت تیار کر سکتے ہیں جو ارد گرد حادثات کی صورت میں بروقت اور فوری طبی امداد دے کر بہت سی قیمتی جانوں کو ضائع ہونے سے بچانے میں معاون ثابت ہوگی نیز وہ حادثات و سانحات کی صورت میں پورے اعتماد کے ساتھ ایمرجنسی سروسز کے شانہ بشانہ کام کرے گی۔

شاکر لطیف

معصوم دُعا

ایک نادان کی پُر اثر کہانی

قدرت الٰہی نے عجیب طور پر اُسے سیدھا راستہ دکھا دیا

اگر دل میں ہے ریاکاری
تو تیری دعا ہے بس وقتِ زیاں
اک دعائے دلِ معصوم
نزولِ رحمتِ آسماں

''کہتے ہیں معصوم کی دُعا میں بڑا اثر ہوتا ہے اور یہ فوراً قبول ہو جاتی ہے۔'' ٹی وی پر چلنے والے مشاعرے میں شاعر نے درج بالا شعر پڑھا تو فرخندہ نے اپنے شوہر افتخار سے کہا۔

''یہ سب دقیانوسی اور افسانوی باتیں ہیں۔'' افتخار نے رعونت بھرے لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''کسی معصوم ذہن کو تو یہ بھی اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ کیا دُعا مانگ رہا ہے۔ تو پھر اُس کی دُعا میں اثر کیسا؟''

''ایسا نہیں کہتے''۔ فرخندہ ناصحانہ لہجے میں بولی۔ ''کبھی کبھی آپ کی باتیں مجھے خوفزدہ کر دیتی ہیں۔ انسان کو بڑا بول نہیں بولنا چاہیے۔''

''اس میں خوفزدہ ہونے کی بھلا کیا بات ہے؟'' افتخار نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''میں دُعاؤں کی بجائے محنت اور لگن سے کام کرنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے، آج اگر میرا شمار اس شہر کے چند رئیس لوگوں میں ہوتا ہے تو کیا یہ تمہاری دعاؤں کا اثر ہے؟''

''آپ کی بات درست نہیں۔'' فرخندہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''محنت تو ساری دنیا ہی کر رہی ہے مگر ہر کوئی آپ کی طرح کامیاب نہیں ہو سکا۔ میں محنت اور لگن سے کام کرنے سے انکاری نہیں ہوں۔ محنت سے ہی انسان اپنی زندگی بناتا ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ دعاؤں کے ثمرات بھی انسان کو ملتے ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کی کامیابی کے پیچھے بھی آپ کی مرحومہ والدہ کی دعاؤں کا اثر ہو۔''

''اچھا اب یہ بحث بند کرو۔'' افتخار نے بیزار سے لہجے میں کہا۔ ''میں حقیقت پسند انسان ہوں اور حقیقت کی دنیا میں ہی رہنا چاہتا ہوں۔ میرا سارا کاروبار تمہاری دعاؤں نہیں بلکہ میری ذہانت اور محنت کی وجہ سے چل رہا ہے۔''

اسی لمحے اُس کی دو سالہ بیٹی پری جو سامنے ہی کھیل رہی تھی، قریب آئی تو افتخار نے اُسے گود میں اُٹھا لیا۔ پری افتخار کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ اس قدر پیاری اور معصوم تھی کہ جو بھی اُسے دیکھتا اُس کی معصومیت پر فدا ہو جاتا اور اُسے بے اختیار گود میں اُٹھا لیتا۔ وہ فرخندہ اور افتخار کی آنکھوں کی

ٹھنڈک تھی۔ اُسے ذرا سی تکلیف میں دیکھ کر وہ دونوں پریشان ہو جاتے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اب وہ پری کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اُنھوں نے تو اپنی بیٹی کا نام بھی سب سے منفرد اور الگ رکھا تھا..... پری، جو اُنھیں اپنی توتلی زبان میں مخاطب کرتی تو دونوں خوشی سے سرشار ہو جاتے۔

افتخار کا شمار شہر کے چند مانے ہوئے کاروباری افراد میں ہوتا تھا۔ اُس نے اپنی محنت اور لگن سے بہت جلد کاروباری طبقے میں اپنا ایک الگ مقام بنا لیا تھا۔ اُس کے والدین وفات پا چکے تھے اور وہ اب اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ خوش و خرم زندگی بسر کر رہا تھا۔

آج چھٹی کا دن تھا اور اُس کی یہ عادت تھی کہ وہ تعطیل اپنے گھر میں ہی گزارتا تھا۔ اُسے اپنی بیٹی کے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ گھر کے ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔ حسبِ معمول اُس کا آج بھی کہیں جانے کا موڈ نہیں تھا۔ اُس کی ننھی بیٹی کبھی کھیلتی ہوئی اُس کے پاس آ جاتی اور کبھی سامنے موجود قالین پر اُچھل کود کرنے لگتی۔ افتخار اُس کی معصومانہ حرکتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اسی لمحے اُسے موبائل فون پر اپنے فیملی ڈاکٹر کا پیغام موصول ہوا۔ ڈاکٹر دانش کا شمار شہر کے چند قابل ترین طبی ماہرین میں ہوتا تھا۔ حکومتی سطح پر بھی اُن کی خدمات کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ وہ اپنا ایک پرائیویٹ اسپتال چلاتے تھے اور اُنھوں نے افتخار کو بھی وہیں بلایا تھا۔

دو دن پہلے افتخار کو اپنے گلے میں ہلکی سی تکلیف محسوس ہوئی تو وہ دفتر سے گھر آتے ہوئے ڈاکٹر دانش کے پاس چیک اَپ کروانے چلا گیا تھا۔ ڈاکٹر دانش نے اُس کا معائنہ کرنے کے بعد اسپتال کی لیبارٹری سے افتخار کے کچھ ٹیسٹ کروائے تھے جن کی رپورٹ ابھی ملنا تھی۔ ڈاکٹر دانش کا کہنا تھا کہ رپورٹیں دیکھنے کے بعد ہی وہ اُس کے مرض کی درست تشخیص کر سکیں گے۔

افتخار کا خیال تھا کہ اُسے گلے میں انفیکشن وغیرہ ہو گیا ہے مگر نہ جانے کیوں ڈاکٹر دانش نے معائنہ کرنے کے بعد مختلف ٹیسٹ تجویز کر دیے تھے۔ اب اُنھوں نے اُس کے موبائل پر باقاعدہ میسج ارسال کر دیا تھا کہ وہ اسپتال پہنچے۔ ایک لمحے کے لیے تو افتخار کے دِل میں آیا کہ ڈاکٹر دانش کو فون کر کے میسج کی وجہ دریافت کرے مگر پھر اُس نے جا کر مل لینا ہی بہتر سمجھا کیونکہ اُس کے گلے کی سوزش ابھی تک برقرار تھی۔

اُس نے اپنی ننھی پری کا ایک بوسہ لیا اور پھر فرخندہ کو ایک دو گھنٹے تک واپسی کا کہہ، ڈاکٹر دانش کے اسپتال کی جانب روانہ ہو گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ اسپتال پہنچ گیا۔ ڈاکٹر دانش نے افتخار سے سلام دعا کے بعد بیٹھنے کا کہا۔ افتخار خاموشی سے اُن کے سامنے موجود کرسی پر براجمان ہو گیا۔

ڈاکٹر دانش اس وقت افتخار کی رپورٹوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ اُن کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ وہ کچھ دیر تک جائزہ لیتے رہے اور پھر سر اُٹھا کر بولے۔ ''معاملہ تو میری توقع سے بھی زیادہ گمبھیر ہے۔''

''کیا ہوا ڈاکٹر صاحب؟ کیا آپ میری رپورٹس بابت بات کر رہے ہیں؟'' ڈاکٹر دانش کی سنجیدگی دیکھ کر افتخار نے دھڑکتے دِل سے استفسار کیا۔

''جی افتخار صاحب''۔ ڈاکٹر دانش نے تاسف بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ گلے کے کینسر میں مبتلا ہیں اور یہ بالکل آخری دور میں پہنچ چکا۔'' افتخار کو گلے کا کینسر تھا۔ یہ روح فرسا خبر سُن کر کچھ دیر کے لیے وہ سکتے میں آ گیا۔ اُس کی زندگی تو بہت حسین اور خوشگوار

تھی۔ اُس نے تو اپنے تابناک مستقبل کے لیے بڑے بڑے منصوبے سوچ رکھے تھے مگر یہ اچانک کیا ہوگیا۔ ''مجھے یقین ہے آپ صبر اور حوصلے سے کام لیں گے''۔ ڈاکٹر دانش نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''مگر ڈاکٹر صاحب، اس بیماری کا کوئی تو علاج ہوگا۔ میرے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں۔ میں بیرون ملک جا کر بھی اپنا علاج کروا سکتا ہوں۔'' افتخار نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔

''میں آپ کو کسی قسم کی جھوٹی تسلی نہیں دینا چاہتا۔ میرے خیال میں اب بہت دیر ہو چکی۔ رپورٹس کے مطابق آپ کا کینسر آخری حد تک پھیل چکا ہے۔ اس مرض کا علاج تبھی ممکن ہوتا ہے جب بروقت تشخیص ہو جائے۔ ویسے آپ کی صحت سے تو اندازہ نہیں ہوتا کہ آپ اس قدر متعدی اور موذی مرض میں مبتلا ہیں۔ بہرحال میری رائے کے مطابق اب آپ کو دوا کی نہیں دعا کی ضرورت ہے''۔

''میرے پاس اب کتنی زندگی بچی ہے ڈاکٹر صاحب؟'' افتخار نے سوال کیا۔ اپنی بیماری کے بارے میں جاننے کے بعد اُس کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ چہرے سے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ابھی بے ہوش ہو کر زمین پر جا گرے گا۔

''زندگی اور موت تو انسانی اختیار میں نہیں افتخار صاحب۔'' ڈاکٹر دانش نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''بس اندازے سے کہہ سکتا ہوں کہ ایک نہیں تو دو مہینے۔''

''ہم.....م.....م''۔ افتخار کے حلق سے بس اتنا ہی نکل سکا۔

''میرے خیال میں آپ کچھ دیر اسپتال کے پرائیویٹ کمرے میں آرام کر لیں۔ میں نرس سے کہہ دیتا ہوں کہ وہ آپ کو ڈرپ لگا دے۔ اس طرح آپ کے جسم میں کچھ تو انائی آجائے گی۔'' ڈاکٹر دانش نے افتخار کا زرد چہرہ دیکھ کر ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ افتخار نے اثبات میں سر ہلا دیا کیونکہ وہ خود بھی یہ روح فرسا خبر ملنے کے بعد کافی کمزوری محسوس کر رہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں وہ اسپتال کے ایک کمرے میں بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ نرس نے اُسے ڈرپ بھی لگا دی تھی۔ اُس نے اپنی بیوی فرخندہ کو فون کر کے اسپتال آنے کا کہہ دیا تاہم فی الحال اُسے اپنی بیماری کے متعلق کچھ بتانے سے گریز کیا۔ اس وقت وہ بیڈ پر لیٹا اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا جو یک لخت تاریک ہو گیا۔ آج اُسے اچانک اس بات کی خبر ہوئی تھی کہ وہ اب اس دنیا میں چند دن کا مہمان رہ گیا ہے، جلد اپنی بیوی اور بیٹی سے ہمیشہ کے لیے جُدا ہونے والا ہے۔

وہ ایک دولت مند شخص تھا۔ اُسے اپنی دولت کی طاقت پر بڑا یقین اور گھمنڈ تھا مگر آج اُس کا سارا گھمنڈ کسی شیشے کی طرح چکنا چور ہو گیا تھا۔ وہ اپنی اس دولت سے اپنے لیے نئی زندگی خریدنے سے قاصر تھا۔ ڈاکٹر دانش کا کہنا تھا کہ اب دوا نہیں دُعا کی ضرورت ہے۔ ''دُعا''۔ جب اس کی بیوی فرخندہ اُسے کہا کرتی تھی کہ دُعا انسان کی تقدیر بدل دیتی ہے تو وہ اس کا مذاق اُڑایا کرتا تھا مگر آج اُسے احساس ہو رہا تھا کہ اُس کے پاس دُعا کے سوا کچھ باقی ہی نہیں بچا۔

کمرے کا دروازہ کھلا تو وہ چونک کر اپنے خیالات کی دنیا سے باہر آ گیا۔ فرخندہ پری کو گود میں اُٹھائے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ ''افتخار یہ کیا ہو گیا؟'' فرخندہ اندر داخل ہوتے ہی بولی۔ ''آپ نے مجھے فون پر تو کچھ نہیں بتایا لیکن میں ابھی ابھی ڈاکٹر دانش سے مل کر آ رہی ہوں۔ اُنھوں نے بتایا ہے کہ آپ کو کینسر ہے اور وہ بھی لاسٹ اسٹیج پر! یہ ہماری خوشیوں کو کس کی نظر لگ گئی۔'' بات کرتے ہوئے فرخندہ کی

آواز رندھ گئی۔

''یہی سچ ہے فرخندہ۔'' افتخار نے افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''ہمیں اب اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا۔ میری موت کے بعد میری بیٹی کا خیال رکھنا۔''

''آپ مایوسی کی باتیں کیوں کرتے ہیں۔'' فرخندہ نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''مایوسی کی باتیں نہ کروں تو کیا کروں؟ ڈاکٹر نے مجھے جواب دے دیا ہے۔'' افتخار نے غمگین لہجے میں کہا۔

''ڈاکٹر نے جواب دیا ہے مالک کائنات نے جواب تو نہیں دے دیا جو آپ اتنے مایوس ہو گئے۔'' فرخندہ ناصحانہ لہجے میں بولی۔

افتخار نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس مسکرا کر رہ گیا تاہم اُس کے چہرے سے عیاں تھا کہ فرخندہ کے تسلی دینے کے باوجود اُسے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ اُس کے چہرے پر شدید مایوسی کے تاثرات نمایاں تھے۔ شاید اُسے اب اپنی موت کا یقین ہو چکا تھا۔

وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''فرخندہ! میرے کچھ افراد کے ساتھ کاروباری معاملات میں تنازعات ہیں۔ اگرچہ میرا خیال ہے کہ میں نے اُن تمام افراد کو اُن کا حق دے دیا ہے، جو مجھ پر اعتراض اُٹھاتے ہیں مگر اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ممکن ہے مجھ سے کچھ زیادتی ہو گئی ہو۔ میں مرنے سے پہلے اُن لوگوں کے اعتراضات دور کرنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری موت کے بعد لوگ مجھے بُرے الفاظ میں یاد کریں''۔

''آپ بار بار مرنے کی باتیں کیوں کرتے ہیں؟'' فرخندہ خفا لہجے میں بولی۔ ''بہرحال آپ اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے جو کرنا چاہتے ہیں، کریں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ جس کو جتنے پیسے دینا چاہتے ہیں دے دیں۔ خاص کر آپ کو یاد ہوگا کہ حارث بیگ کے ساتھ آپ کا مالی تنازع کافی عرصے تک چلتا رہا۔ میں نے سنا ہے کہ اُنھیں اپنے ذاتی کاروبار میں بہت بڑا نقصان ہو گیا ہے۔ آج کل وہ اور اُن کی فیملی خاصی کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزار رہے ہیں۔ آپ کو اُن کی مالی معاونت کرنی چاہیے۔ ہمارے پاس ویسے بھی دولت کی کوئی کمی نہیں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے اُن سے بات کرنی چاہیے۔ اُس نقصان کے بارے میں، میں نے بھی سُن رکھا ہے۔''

اسی لمحے کمرے میں نرس داخل ہوئی۔ افتخار کو لگائی گئی ڈرپ اب ختم ہو چکی تھی۔ نرس نے ڈرپ اُتاری اور پھر کمرے سے باہر چلی گئی۔ افتخار نے اپنا موبائل فون اُٹھا لیا۔ اُس کے پاس حارث بیگ کا نمبر موجود تھا۔ افتخار نے نمبر ڈائل کر دیا۔ کچھ دیر تک بیل جاتی رہی اور پھر دوسری طرف سے فون اُٹھا لیا گیا۔ ''ہیلو''۔ دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔ افتخار نے برسوں بعد بھی حارث بیگ کی آواز پہچان لی۔ حارث بیگ سے کسی دور میں اُس کے بہت اچھے تعلقات رہے تھے مگر پھر کاروباری تنازع کی وجہ سے دونوں نے آپس میں قطع تعلق کر لیا تھا۔ آج افتخار نے اُنھیں بہت عرصے بعد فون کیا تھا۔ ''افتخار بول رہا ہوں حارث صاحب، کیسے ہیں؟''

''اوہ آپ!'' اُس کی آواز سُن کر حارث بیگ کے مُنہ سے بس اتنا ہی نکل سکا۔

''کیا ہوا حارث صاحب، آپ خاموش کیوں ہو گئے؟ کیا میرا فون کرنا آپ کو اچھا نہیں لگا؟'' افتخار نے استفسار کیا۔

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے افتخار صاحب۔ اصل میں آپ کا فون میرے لیے غیر متوقع تھا۔ اسی لیے وقتی طور پر

چونک گیا تھا۔'' حارث بیگ نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''حارث صاحب! ماضی میں ہمارے درمیان لین دین کے معاملے میں تنازع ہو گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں نے آپ کو آپ کی تمام رقم دے دی ہے مگر اس کے باوجود آپ کو مجھ سے شکوہ تھا۔'' افتخار نے کہا۔

''میرا شکوہ بجا تھا افتخار صاحب۔'' حارث بیگ نے جواب دیا۔ ''آپ کی جانب اب بھی میرے بیس لاکھ روپے بنتے ہیں۔''

''مجھے نہیں معلوم حارث صاحب کہ آپ کی بات کس حد تک درست ہے۔ پھر بھی میں آپ کو بیس لاکھ روپے دے رہا ہوں۔ آپ آج ہی جا کر میری کمپنی کے منیجر سے مل لیں۔ وہ آپ کو چیک دے دے گا۔''

افتخار کا جواب سُن کر دوسری طرف ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ قدرے توقف کے بعد حارث بیگ کی آواز سنائی دی۔

''میں آپ کا احسان مند رہوں گا افتخار صاحب۔ آپ نے اِس وقت بیس لاکھ دینے کی ہامی بھر کر مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اِس رقم سے میرے بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے ورنہ آج کل میں مالی طور پر خاصی مشکلات کا شکار ہوں''۔ بات کرتے ہوئے حارث بیگ کی آواز رندھ گئی۔

''شکریہ کی ضرورت نہیں حارث صاحب۔'' افتخار نے انکسار سے کہا۔ ''بس مجھے اپنی دُعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ میرے منیجر سے مل لیں۔ میں اُسے فون پر آپ کو بیس لاکھ کا چیک دینے کا کہہ دیتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے افتخار نے فون کاٹ دیا۔ پھر اُس نے اپنے منیجر کو فون کیا اور اُسے حارث بیگ کو کمپنی اکاؤنٹ میں سے بیس لاکھ کا چیک دینے کا کہہ دیا۔ یہ اُس کا بہت بااعتماد منیجر تھا۔ افتخار کی یہ عادت تھی کہ وہ اپنے دستخط شُدہ چیک اپنے منیجر کے حوالے کر دیتا تھا تاکہ اُس کی غیر موجودگی میں بھی کسی کو رقم دیتے وقت کوئی مسئلہ نہ آئے۔

شام تک افتخار نے اُن تمام لوگوں کو رقم ادا کر دی جن کے ساتھ اُس کے کاروباری تنازعات چل رہے تھے۔ اُس نے اپنے منیجر کو بھی دیر تک دفتر میں موجود رہنے کا حکم دے دیا تاکہ چیک لینے کے لیے آنے والوں کو کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ اب وہ خاصی قلبی سکون محسوس کر رہا تھا۔

''افتخار! آپ نماز بالکل ادا نہیں کرتے۔ اِس وقت مغرب کی نماز کا وقت ہو رہا ہے۔ آپ بھی پڑھ لیں۔ پھر ہم دونوں مل کر آپ کی صحت یابی کے لیے دُعا بھی کریں گے۔'' فرخندہ نے کہا تو افتخار سر ہلاتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کی بیٹی پری ہر چیز سے بے نیاز بدستور کمرے میں اِدھر اُدھر بھاگ کر خوش ہو رہی تھی۔

افتخار اور فرخندہ نے کمرے سے مُتصل بنی جگہ سے وضو کیا اور پھر کمرے میں مریضوں کے لیے رکھے گئے جائے نماز لے کر، نماز پڑھنے لگے۔ افتخار نے طویل عرصے بعد نماز کا فریضہ ادا کیا تھا تاہم ایسا کرنے سے اُسے بہت دِلی سکون محسوس ہو رہا تھا۔ نماز ختم کرنے کے بعد جب دونوں نے اپنے ہاتھ دُعا کے لیے بلند کیے تو پری کو نہ جانے کیا سوجھی، وہ بھی اچانک بھاگ دوڑ کا کھیل ترک کر کے اُن کے ساتھ آ بیٹھی اور اپنے دونوں ہاتھ دُعا کے لیے اُٹھا کر، آنکھیں بند کر لیں۔ فرخندہ اور افتخار اُسے ایسا کرتے دیکھ کر بے اختیار مُسکرا دیے۔ وہ دونوں اپنی دعا ختم کر کے کھڑے ہو چکے تھے مگر اُنھوں نے پری کو ویسے ہی بیٹھے رہنے دیا۔ اُس کے چہرے پر گہری معصومیت اور پاکیزگی تھی۔ افتخار اُسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ شاید اِس لیے کہ وہ جانتا تھا جلد

ہی وہ اپنی بیٹی سے ہمیشہ کے لیے بچھڑنے والا ہے۔ اُس کی دو سالہ بیٹی نے معصومانہ انداز میں دُعا کے لیے ہاتھ تو اُٹھا رکھے تھے مگر شاید اُسے یہ بھی علم نہیں تھا کہ دُعا کیسے اور کیوں مانگی جاتی ہے؟

اِسی لمحے کمرے کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر دانش اندر داخل ہوئے۔

''میں بہت معذرت خواہ ہوں افتخار صاحب۔ میں آپ سے بے حد شرمندہ ہوں۔'' اُنھوں نے اندر داخل ہوتے ہی افسوسناک لہجے میں کہا۔

''کیوں کیا ہوا ڈاکٹر صاحب؟'' افتخار نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

ڈاکٹر دانش کی بات سُن کر اُس کے ساتھ ساتھ فرخندہ کے چہرے پر بھی حیرت کے تاثرات عود آئے تھے۔

''بات دراصل یہ ہے افتخار صاحب کہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہو گئی۔'' ڈاکٹر دانش نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''دراصل جس دِن آپ کے گلے کے ٹیسٹ ہوئے اُسی دِن ایک اور صاحب کے بھی یہی ٹیسٹ لیے گئے تھے۔ حُسنِ اتفاق کہہ لیجیے کہ اُن صاحب کا نام بھی افتخار تھا۔ ناموں کی اسی مماثلت کی وجہ سے لیبارٹری میں رپورٹ بناتے وقت کوائف کے اندراج میں غلطی ہو گئی۔ اُن صاحب کے کوائف غلطی سے آپ کی رپورٹ میں درج ہو گئے تھے''۔

''وہ صاحب اپنے مرض سے باخبر تھے۔ جب اُنھوں نے اپنی رپورٹ پر ہم سے حیرت کا اظہار کیا تب ہم نے تفصیل سے دوبارہ سارے کوائف چیک کیے۔ جس پر ہمیں پتا چلا کہ ناموں کی مماثلت کی وجہ سے رپورٹ بنانے والے نے جلد بازی میں غلط رپورٹ بنا دی۔ اُسے کہیں جانے کی جلدی تھی اور اُس نے جلدی میں ولدیت تک چیک کرنا گوارا نہیں کی۔ بہرحال رپورٹ بنانے والے بھی انسان ہی ہوتے ہیں۔ انسان کی فطرت میں غلطیاں کرنا شامل ہے۔ میں آپ سے سخت شرمندہ ہوں کیونکہ ہماری اِس معمولی غلطی کی وجہ سے آپ کو شدید ذہنی اذیت برداشت کرنا پڑی۔ میں آپ کی اصل اور درست رپورٹ لے آیا ہوں۔ آپ کو گلے کا کینسر بالکل نہیں۔ بلکہ آپ کے گلے میں تو معمولی سا انفیکشن ہے۔ میں نے دوا لکھ دی ہے۔ آپ ایک دو روز میں ٹھیک ہو جائیں گے۔ میری طرف سے آپ جا سکتے ہیں۔''

افتخار اور اُس کی بیوی نے انگشت بدنداں چہرے اور متحیر نگاہوں کے ساتھ ڈاکٹر دانش کی باتیں سُنیں۔ لمحہ بھر کے لیے تو اُنھیں یقین ہی نہ آیا۔ گویا زندگی کی خوشیاں جاتے جاتے پھر سے لوٹ آئی تھیں۔ افتخار تو سمجھ رہا تھا کہ اُس کی زندگی کی شام ہو چکی، مگر اب اُسے نوید سحر مل گئی تھی۔

اُس نے بیوی کی جانب خوشگوار حیرت کے ساتھ دیکھا اور پھر اُن دونوں کی نگاہیں اپنی معصوم بیٹی پر ٹک گئیں، جو ابھی تک جائے نماز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کے دونوں ہاتھ بڑے معصومانہ انداز میں دُعا کے لیے اُٹھے ہوئے تھے۔ اُسے شاید اپنے والدین کی مشکلات کا احساس بھی نہیں تھا مگر اُس نے جس ذات کے سامنے ہاتھ پھیلا رکھے تھے۔ اُس پیدا کرنے والے سے تو کوئی بات چھپی ہوئی نہیں تھی۔

آج افتخار کو یقین آ گیا تھا کہ معصوم کی دُعا میں بڑا اثر ہوتا ہے۔ اُس کے لبوں سے بے اختیار یہ الفاظ نکلنے لگے۔

اگر دل میں ہے ریاکاری
تو تیری دُعا ہے بس وقتِ زیاں
اک دُعائے دِلِ معصوم
نزول رحمت آسماں

نقصان نہ پہنچاؤ

تہذیبِ نفس کا سبق دیتا اور راہِ حق دِکھلاتا ایک بیش قیمت شہ پارہ

ڈاکٹر فیاض ہرل

چلتے چلتے میں ٹھٹک کر رک گیا۔ کسی کے دعا مانگنے کی آواز آ رہی تھی۔ مسجد کے ستون کی اوٹ میں کوئی صاحب نہایت خشوع و خضوع سے ایک ہی دعائیہ جملہ بار بار دہرا رہے تھے۔ میری حیرانی کا سبب یہ تھا کہ میں نے زندگی میں کسی کو اتنی عجیب دعا مانگتے نہیں سنا تھا۔ دبلے پتلے باریش بزرگ صف پر دوزانو بیٹھے اور نہایت عاجزی سے ہاتھ پھیلائے بار بار دعا دہرا رہے تھے:

''یا اللہ میرے شر سے اپنے بندوں کو بچا، یا اللہ میرے باطن کے شر سے اپنے بندوں کو بچا۔''

میں سکتے کے عالم میں ان کی آہ و زاری سنتا رہا۔ اچانک مسجد میں کھٹکے کی آواز سن کر انھوں نے دعا ختم کی اور اٹھ کر باہر جانے لگے۔ میرے قریب سے گزرے تو نہ چاہتے ہوئے بھی میرے منہ سے بے اختیار سوال نکل گیا ''بابا جی! آپ یہ دعا کیوں مانگ رہے تھے؟''

انھوں نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا، ہلکا سا مسکرائے اور پھر بولے ''غور کرو تو سمجھ میں آجائے گا۔''

یہ کہہ کر وہ اپنے جوتے لے کر باہر نکل گئے۔ میں کافی دیر تک سوچتا رہا کہ انھوں نے میرے سوال کا جواب وضاحت سے دینا کیوں مناسب نہ سمجھا۔ آخر ایک دن اچانک ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ جس سوال کا جواب عین سامنے طاق میں دھرا ہو، کیا زبان سے اس کا اظہار کرنا ضروری ہے؟

اس دن ایک صوفی بزرگ کی لکھی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا کہ ایک جملے پر میری نظر ٹھہر گئی:

''فقر کی ابتدا مخلوقِ خدا کے لیے بے ضرر بن جانے سے ہے اور انتہائی نفع بخش ہو جانے پر۔''

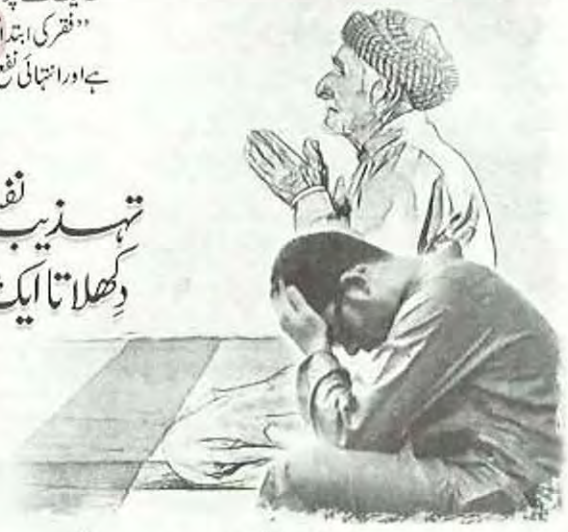

مجھے فوراً مسجد والا واقعہ یاد آ گیا۔ ''اچھا تو وہ بزرگ تہذیبِ نفس کا سبق پختہ کر رہے تھے۔'' میں نے سوچا۔

''میرا دھیان پھر اس بقراطی حلف نامے (Hippocratic oath) کے الفاظ کی طرف گیا جس کی پاسداری کرنا ہر میڈیکل ڈاکٹر پر لازم ہے۔ وہ الفاظ یہ ہیں: ''نقصان نہ پہنچاؤ۔'' ان الفاظ کا مفہوم بھی یہی ہے کہ ڈاکٹر کی طرف سے قصداً کوئی ایسا عمل سرزد نہ ہو جس سے مریض کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو۔ خواہ یہ نقصان جان، مال، عزت و آبرو کسی بھی شے سے متعلق ہو۔

آپ نے اکثر یہ جملہ سنا ہوگا کہ بندہ چاہے ضائع ہو جائے لیکن فقرہ ضائع نہیں ہونا چاہیے۔ اس جملے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں بلا سوچے سمجھے جو منہ میں آئے کہہ دینے والے لوگ دوسروں کے احساسات کو شدید نقصان پہنچانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس خصوصیت کو محفل آرائی کے لیے ضروری خوبی سمجھا جاتا ہے۔ بہت سی محفلوں میں شمعِ محفل ایسے لوگ ہوتے ہیں جو منہ پھٹ، بدلحاظ اور زہر آلود پھبتیاں کسنے میں طاق ہوں۔

ایک دن میرے نفسیاتی کلینک میں ایک صاحب تشریف لائے۔ لگ بھگ پچاس برس کی عمر کے وہ صاحب معقول شخصیت کے مالک لیکن اپنی شخصیت کے حوالے سے شدید احساسِ کمتری میں مبتلا تھے۔ بچپن کے ماحول پر بات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ ایک چچا ان کی سانولی رنگت کے

اخلاص

☆ ایک بزرگ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منقول ہے کہ وہ یہاں تک اخلاص کی کوشش کرتے تھے کہ ہمیشہ جماعت کی صفِ اول میں شامل ہوتے، ایک دن اتفاقاً آخری صف میں کھڑے ہوئے اور دل میں خیال آیا کہ آج لوگ مجھے آخری صف میں دیکھ کر کیا کہیں گے۔ اس خیال کے سبب لوگوں سے شرمندہ ہو گئے یعنی یہ خیال آیا کہ پچھلی صف میں لوگ دیکھ کر کہیں گے کہ آج اس کو کیا ہو گیا ہے کہ پہلی صف میں نہیں مل سکا۔ اس خیال کے آتے ہی یہ سمجھا کہ میں نے جتنی نمازیں پہلی صف میں پڑھی ہیں اس میں لوگوں کے لیے نمائش مقصود تھی۔ تو تیس سال کی نمازیں قضا کیں۔ (کیمیائے سعادت)

☆ حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرمایا کرتے تھے: ''اخلاص کر! تاکہ تو خلاصی پائے''۔ آپ نے یہ بھی فرمایا: ''مخلص وہ ہے جو اپنی نیکیوں کو بھی ایسے ہی چھپائے جیسے کہ اپنی برائیوں کو چھپاتا ہے''۔

☆ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے میری والدہ نے فرمایا: اے میرے بیٹے! ''علم پر اگر عمل کی نیت ہو تو پڑھو ورنہ وہ علم قیامت کے دن تم پر وبال ہوگا''۔ (تنبیہ المغترین)

☆ حضرت یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے سوال ہوا کہ انسان کب مخلص ہوتا ہے۔ فرمایا: جب شیر خوار بچہ کی طرح اس کی عادت ہو۔ شیر خوار بچے کی کوئی تعریف کرے تو اسے خوشی نہیں ہوتی اور مذمت کرے تو اسے بری نہیں معلوم ہوتی جس طرح وہ اپنی مدح اور ذم سے بے پرواہ ہوتا ہے اسی طرح انسان جب مدح و ذم کی پرواہ نہ کرے تو مخلص کہا جا سکتا ہے۔ (تنبیہ المغترین)

☆ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے پوچھا گیا کہ آدمی مخلص کس وقت ہوتا ہے۔ فرمایا: جب عبادت الٰہی میں خوب کوشش کرے اور اس کی خواہش یہ ہو کہ لوگ میری عزت نہ کریں۔ جو عزت کہ لوگوں کے دلوں میں ہے وہ بھی جاتی رہے۔ (تنبیہ المغترین)

سب انھیں مذاق سے کالا کوا کہہ کر بلاتے تھے۔ انھیں سخت برا لگتا لیکن احتراماً کچھ کہہ نہ پاتے۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ اپنی رنگت کے بارے میں زود حس ہوتے گئے۔ لوگوں کا سامنا کرنے سے کتراتے اور آئینے میں گھنٹوں اپنے آپ کو دیکھ کر کڑھتے۔

رنگ گورا کرنے کے بہت سے نسخے بھی آزمائے۔ اب یہ صورتِ حال تھی کہ آس پاس یا کام کی جگہ پر لوگ دھیمے لہجے میں بات کرتے تو انھیں شک گزرتا کہ ان کے بارے میں بات کی جارہی ہے یا تمسخر اڑایا جارہا ہے۔ لوگ یقین دہانی بھی کرواتے لیکن ان کا شک رفع نہ ہوتا۔ خود سمجھتے بھی تھے کہ ان کا شک اکثر بے بنیاد ہوتا ہے لیکن منفی سوچ سے نجات نہ ملتی۔

اس طرح کے تجربات عیاں کرتے ہیں کہ ہمارے بے احتیاط رویے دوسروں کو کتنی اذیت پہنچا سکتے ہیں۔ عمر میں چھوٹے افراد اور ماتحت لوگوں کو بسا اوقات سرزنش اور تنبیہ کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس دوران خوب ناپ تول کر الفاظ استعمال کرنے چاہئیں۔ گالیاں اور تمسخر آمیز الفاظ استعمال کرنا اصلاح کا سبب نہیں بنتا بلکہ الٹا کسی منفی ردِعمل کو جنم دینے کی وجہ بن جاتا ہے۔ ایک مثال سنیے۔

ایک صاحب کا اپنے گھریلو ملازم سے روّیہ بہت برا تھا۔ بات بے بات اس کو برا بھلا کہنا اور عزتِ نفس کو مجروح کرنا روزمرہ کی عادت بن گئی تھی۔ ملازم خون کے آنسو پیتا لیکن اپنے آپ کو بے بس پاتا۔ آخر کار اس کے اندرونی کرب اور غصے نے تسکین کی ایک راہ ڈھونڈ لی۔ اب وہ صاحب کے لیے چائے تیار کرتا تو پہلے کپ میں اپنا لعابِ دہن ڈالتا اور پھر چائے ڈال کر ان کے سامنے لے جاتا۔ وہ چائے پیتے اور یہ انھیں دیکھ کر دل ہی دل میں ہنستا اور تسکین محسوس کرتا۔ اسے یوں لگتا جیسے اس کے زخموں پر کسی نے شفا بخش مرہم رکھ دیا ہے۔

بلاشبہ اس واقعے میں ملازم کا ردِعمل منفی اور کراہت آمیز تھا۔ سوال یہ ہے کہ اس کو ردِعمل پر مجبور کرنے والا کیسے بری الذمہ ہوسکتا ہے؟

ایک نفسیاتی تحقیق کا موضوع یہ تھا کہ گزری زندگی کے کن جذبات یا واقعات کا نقش کبھی نہیں مٹتا۔ تحقیق کا نتیجہ یہ نکلا کہ ماضی میں شرمندگی اور ذلت کے عالم میں گزرے لمحات کا نقش طویل ترین عرصے تک قائم رہتا ہے اور انسان اس تجربے کی اذیت کبھی نہیں بھول پاتا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے عمومی رویوں اور دوسرے لوگوں سے معاملات میں کس قدر احتیاط سے کام لیا جانا چاہیے۔

کسی کو نقصان پہنچنے کی بہت سی صورتیں ہوسکتی ہیں! کچھ تو واضح اور سیدھی ہیں اور کچھ باریک اور ڈھکی چھپی۔ مثلاً غیبت اور بہتان کے ذریعے کسی کو پہنچنے والے نقصان کو تو ہم سمجھتے ہی ہیں۔ اس کے علاوہ کسی کے بارے میں بری نیت سے ایسا راز افشا کرنا جس سے اس کی جان و مال اور عزت و آبرو کو زک پہنچنے کا احتمال ہو، بحیثیت ملازم ذاتی ناراضی پر ماتحت کی رپورٹ، اے سی آر وغیرہ خراب کردینا' ناجائز دباؤ ڈلوا کر کسی کو حق سے محروم کرنا، کسی کو ایسی امید دلا دینا جسے پورا کرنے پر ہم قادر نہ ہوں یا جسے پورا کرنے کا دل سے ارادہ ہی نہ ہو بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔

ایک صاحب ایک دانا بزرگ کے پاس مشورہ کرنے پہنچے اور بتایا کہ ان سے کسی کو نقصان پہنچ گیا ہے حالانکہ ارادہ نہیں تھا۔ بزرگ نے نقصان کے ازالے کی صورت بھی بتائی لیکن ساتھ ہی یہ بھی سمجھایا کہ عدم قصدِ ایذا یعنی نقصان پہنچانے کا ارادہ نہ ہونا کافی نہیں بلکہ برتر کیفیت قصدِ عدم ایذا ہے یعنی نقصان نہ پہنچانے کا ارادہ دل میں ہو۔ پہلی صورت میں انسان غفلت کی کیفیت میں ہو تو کسی کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔ دوسری صورت میں انسان روزمرہ امور میں اپنا جائزہ لیتا رہتا اور اہتمام سے فکر کرتا ہے کہ اس کی ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ ◆◆◆

(یہ مضمون ڈاکٹر فیاض ہرل کی زیرِ تحریر کتاب 'امراضِ ذہن و نفسیات' سے لیا گیا)

عذرا فردوس

باضمیر

ترقی کے خواہش مند کا ماجرا' اُس نے آگے بڑھنے کی بڑی انوکھی راہ تلاش کرلی

نیشنل فارمرز بینک کے سربراہ موسیو دلبرائٹ نے ایک روز صبح سویرے اپنے معتمد فلبرٹ کو طلب کرلیا۔

''مجھے ذرا یہ تو بتاؤ فلبرٹ۔'' اُس نے کہا: ''ہمارے بینک کی پیراگان شاخ میں فلوریوٹ نامی شخص کس عہدے پر فائز ہے؟''

''فلوریوٹ! وہ وہاں کا کیشیئر ہے جناب! لیکن عارضی طور پر وہ منیجر کی ذمے داریاں بھی نبھا رہا ہے۔ آپ کو وہ بوڑھا منیجر باؤچر تو یاد ہے نا۔ اس کی موت کے بعد سے اب تک ہم اُس کے جانشین کے لیے کوئی مناسب شخص تلاش نہیں کر پائے۔ اس اثنا میں وہاں کے معاملات فلوریوٹ ہی دیکھ رہا ہے۔ پیراگان میں زیادہ کاروبار بھی نہیں''۔

موسیو دلبرائٹ نے میز پر پڑا خط اٹھایا اور بولا: ''یہ شخص غالباً ہمارے مال پر فراخ دلی سے ہاتھ صاف کررہا ہے۔ یہ خط مجھے پیراگان سے موصول ہوا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ یہ گم نام ہے لیکن...... خیر تم اسے پڑھ لو۔''

فلبرٹ نے کاغذ کا میلا سا ٹکڑا اُس کے ہاتھ سے لے لیا۔ خط میں بھدی لکھائی میں درج ذیل سطور درج تھیں۔:

برائے توجہ
سربراہ نیشنل فارمرز بینک
جناب عالی!
ہم کسان اپنے خون پسینے کی کمائی آپ کے بینک کی پیراگان شاخ میں جمع کرواتے ہیں لیکن وہ دن دور نہیں جب ہمیں بتایا جائے گا کہ بینک دیوالیہ اور ہم سب کنگال ہوچکے۔ یہاں کی جو صورتحال ہے وہ آپ کو کیا بتائی جائے۔ یقیناً آپ

کے علم میں نہیں کہ آپ کا کیشیئر موسیو فلوریوٹ پچھلے کئی ماہ سے مسلسل غبن کر رہا ہے۔ وہ اب تک بھاری رقم ٹھکانے لگا چکا۔ جب تک پیرس میں چین کی بانسری بجاتے بینک کے اعلیٰ حکام صورتِ حال سے آگاہ ہو پائیں گے وہ تمام مال سمیٹ کر یہاں سے غائب ہو چکا ہوگا۔"

فلبرٹ نے خط پڑھ کر میز پر رکھا تب دلبرائٹ نے کہا: "فلبرٹ! تم کل ہی ایک انسپکٹر پیراگان بھیج دو لیکن اسے تاکید کر دینا کہ خوش تدبیری کا مظاہرہ کرے۔ ہم اس شخص کو بدظن نہیں کرنا چاہتے۔ ہوسکتا ہے کہ جو کہانی اس خط میں لکھی گئی وہ بے بنیاد ہو۔"

☆☆☆

پیراگان شاخ کا قائم مقام منیجر موسیو فلوریوٹ خوف آمیز تعجب سے پیرس سے آئے انسپکٹر کو گھور رہا تھا۔ وہ بولا:

"میرے کھاتوں کا معائنہ کرنا ہے کیا مطلب؟ مہینے کے وسط میں؟ کسی اطلاع کے بغیر؟ یہ قدرے خلافِ معمول ہے، ہے نا؟"

اپنی حیرت اور اشتعال چھپانے کی کوشش کرتے مصروف محنتی شخص سے، انسپکٹر کو ہمدردی محسوس ہوئی:

"اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں موسیو فلوریوٹ۔ ہم اپنی تمام برانچوں میں وقتاً فوقتاً ایسا کرتے رہتے ہیں۔ بینک کے سربراہ کو اچانک اس طرح کے دورے پڑتے ہیں۔ یہ محض رسمی کارروائی ہے جو نصف گھنٹے میں مکمل ہو جائے گی۔"

"لیکن آپ جانتے ہیں کہ لوگ کیسی کیسی باتیں بنائیں گے خصوصاً اس چھوٹے سے قصبے میں۔" فلوریوٹ نے دہائی دی۔ "سب کہیں گے کہ میں نے ضرور کوئی گھپلا کیا ہے۔ ذرا سوچیں میری کتنی بے عزتی ہوگی۔"

"کسی کو کچھ نہیں معلوم ہو پائے گا"۔ معائنہ کار نے قدرے بے قراری سے کہا: "اگر تم نے کسی کے سامنے زبان نہیں کھولی تو کسی کو کیسے معلوم ہوگا۔ اچھا اب مجھے اپنے حساب کتاب کے کھاتے دکھاؤ۔"

موسیو فلوریوٹ اٹھ کر اس الماری کی جانب بڑھ گیا جس میں کھاتے سے متعلق فائلیں رکھی تھیں۔

☆☆☆

دو دن بعد فلبرٹ بینک کے سربراہ کے کمرے میں داخل ہوا اور بتایا: "پیراگان شاخ کے معائنے کی رُوداد مجھے مل گئی ہے۔ وہاں سب کچھ ضابطے کے عین مطابق ہے۔ ایک دھیلا بھی کم نہیں پایا گیا۔"

"بہت خوب! میرا خیال ہے ہمیں اس طرح کے گمنام اور گمراہ کن خطوط پر توجہ نہیں دینی چاہیے۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

ایک مہینا بھی نہیں گزرا تھا کہ بینک کے سربراہ نے ایک بار پھر فلبرٹ کو طلب کر لیا:

"یہ خاصی مضحکہ خیز بات ہے"۔ اُس نے قدرے محتاط لہجے میں کہا: "لیکن مجھے پیراگان کے بارے میں ایک اور گمنام خط موصول ہوا ہے۔ لکھنے والے کا دعویٰ ہے کہ کھاتوں کا صحیح طرح جائزہ نہیں لیا گیا۔ بظاہر یوں لگتا ہے فلوریوٹ نے معائنہ کار کو واویلے اور احتجاج میں اتنی دیر الجھائے رکھا کہ اُس کے کسی ساتھی کو غبن شدہ رقم واپس رکھ کر حساب پورا کرنے کا موقع مل گیا۔ ہمیں اس معاملے میں زیادہ باریک بینی سے کام لینا چاہیے تھا۔"

"آپ کے خیال میں کیا ہمیں ایک بار پھر چھان بین کرنی چاہیے جناب؟" فلبرٹ نے تاسف سے پوچھا۔

بینک کے سربراہ نے میز پر انگلیوں سے جلترنگ بجاتے ہوئے کہا:

"مجھے یہ اچھا تو نہیں لگ رہا لیکن یہ ہمارا فرض ہے اور

ہمارے کھاتے داروں کا حق ہے۔ اگر اس الزام میں واقعی کوئی حقیقت ہوئی اور لوگوں کو معلوم ہوا کہ انتباہ کیے جانے کے باوجود ہم نے کوئی انسدادی کارروائی نہیں کی تو یہ ایک تباہ کن اسکینڈل بن جائے گا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ایک بار پھر معائنہ کار وہاں بھیجا جائے، جو اس مرتبہ انتہائی تفصیل سے جائزہ لے۔ میں یہ معاملہ انجام تک پہنچا دینا چاہتا ہوں۔"

اُسی روز بینک کے تین کہنہ مشق معائنہ کار پیراگان روانہ کر دیے گئے۔ اس بار موسیو فلوریوٹ کو واقعی سنبھلنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ تینوں معائنہ کاروں میں سے ایک مسلسل اُس کی نگرانی پر مامور رہا جب کہ باقی دو اپنی خرانٹ نظروں سے کھاتے کھنگالنے لگے۔ اُن کی کارروائی چار گھنٹے جاری رہی۔ حساب کتاب میں کمی نہیں پائی گئی۔ تمام کھاتے بے ضابطگی سے پاک تھے۔

"کاش ہماری تمام برانچوں میں ایسی ہی تسلی بخش صورتِ حال ہوتی۔" بڑے معائنہ کار نے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔ جذباتی اور اعصابی شکست و ریخت کا شکار فلوریوٹ اس پزیرائی پر اظہارِ تشکر بھی نہ کر پایا۔

ایک ہفتے بعد فلبرٹ نے بینک سربراہ کو مطلع کیا:

"موسیو فلوریوٹ آپ سے ملاقات کے منتظر ہیں جناب۔"

خلاف عادت موسیو دلبرائٹ اپنی نشست سے اُٹھ کر مہمان کی طرف بڑھے اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ تاہم فلوریوٹ نے رکھائی سے سرخم کرنے پر اکتفا کیا:

"میں اپنا استعفا آپ کے حوالے کرنے آیا ہوں جناب۔"

"استعفا؟ تم یہ کیا کہہ رہے ہو فلوریوٹ؟ آخر کیوں تم استعفا دے رہے ہو؟"

"آپ نے پے در پے دو مرتبہ میرے کھاتوں کی چھان بین ضروری سمجھی جناب! ظاہر ہے اس کے نتیجے میں بے تحاشا چہ مگوئیاں کی گئیں۔ اگرچہ میری دیانت ثابت ہوگئی لیکن اس سے میرے بارے میں غلط تاثر قائم ہوا۔ لوگ کہہ رہے ہیں کہ کوئی تو اہم وجہ ہوگی کہ صدر دفتر سے دو مرتبہ ہمارے کھاتوں کی چھان بین کروائی گئی۔ میں اپنی ساکھ گنوا چکا ہوں۔ اب میں کوئی نوجوان نہیں ہوں، مجھے اپنی اور اپنی بیوی کی عزتِ نفس کے بارے میں بھی سوچنا ہے۔"

موسیو دلبرائٹ یہ سُن کر بہت متاثر ہوئے اور بولے:

"تمہارے نام سے کالک ہٹانا میں اپنی ذاتی ذمے داری سمجھتا ہوں۔ ایک ثانیہ، ٹھہرو، منیجر کی جگہ ابھی تک خالی ہے۔ کیا تم اُسے قبول کرو گے؟ اس کے بعد کوئی تمہاری دیانت پر شبہ نہیں کر سکے گا۔ جب کہ تمہاری تنخواہ اور مراعات میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہو جائے گا۔"

"کیا واقعی آپ مجھے منیجر بنانا چاہتے ہیں کہ......"

فلوریوٹ کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"ہاں بلاشبہ، تم جیسے باضمیر کارکن کی خدمات سے استفادہ بینک کی خوش قسمتی ہوگی۔"

☆☆☆

گھر پہنچنے پر فلوریوٹ نے اپنی بیوی پر والہانہ مسکراہٹ نچھاور کرتے ہوئے کہا: "بالآخر میں نے منزل پا لی۔"

اُس کے لہجے سے خوشی ٹپک رہی تھی۔

"ایسی ایمان داری کس کام کی جس کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو پائے۔ میں کیشیئر کی حیثیت سے ساری عمر گزار دیتا، لیکن صدر دفتر میں کسی کو معلوم نہ ہوتا کہ میں کتنا دیانت دار تھا۔"

"اب تو انھیں معلوم ہو گیا نا کہ تم کتنے باضمیر ہو۔"

ماریہ فلوریوٹ نے تحسین آمیز نظروں سے اپنے شوہر کو دیکھا اور بولی:

"خطوں والا تمہارا منصوبہ واقعی شان دار تھا۔"

فیصل حسین

دنیائے حیوانات کا باکسر

حریف کے چھکے چھڑا دینے والے منفرد جانور کا دلفریب قصّہ

۱۷۷۰ء میں جب کیپٹن جیمز کک آسٹریلیا کے ساحلی علاقے میں اپنی تاریخ ساز مُہم پر تھا تو اس کے ساتھیوں نے جنگل میں ہرن سے ملتا جلتا، ویسا ہی پھرتیلا اور چاق و چوبند جانور دیکھا۔ وہ اپنی پچھلی ٹانگوں پر سیدھا کھڑا ہو جاتا۔ اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ تھی کہ وہ اپنی لمبی دم زمین پر ٹکا کر اپنے پورے قد کے ساتھ دم پر کھڑا ہو سکتا تھا۔ دوڑتے وقت کئی کئی گز لمبی چھلانگیں لگاتا۔ یوں سفید فام نسل کے کینگرو سے پہلا آمنا سامنا ہُوا۔

روئے زمین پر رہنے بسنے والے جانوروں کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان میں سے عجیب جانوروں کی تعداد بھی اتنی ہے کہ شمار نہیں کیا جا سکتا۔ عجیب تر جانوروں کی فہرست بھی مختصر نہیں۔ چند عجیب ترین میں سے ایک کینگرو ہے جو جانوروں کی اُس نوع سے تعلق رکھتا ہے جسے حیوانیات کی اصلاح میں مارسوپیل یا تھیلی دار جانور کہتے ہیں۔

تھیلی دار جانور دراصل دودھ پلانے والے قدیم جانوروں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی ۲۵۰ اقسام باقی رہ گئی ہیں، باقی سب نابود ہو چکیں۔ زندہ باقی ۲۵۰ اقسام سے ۱۷۰ اقسام صرف آسٹریلیا میں موجود ہیں۔ ان ۱۷۰ اقسام میں سے ایک قسم ''کینگرو'' ہے۔ کینگرو کی بھی

کئی قسمیں ہیں، جن میں سے بھورے کینگرو اور لال کینگرو زیادہ مشہور ہیں۔

کینگرو کا چہرہ بڑا معصوم اور بھولا بھالا ہے۔ جسم نیچے سے بھاری اور اُوپر سے ہلکا پھلکا ہوتا ہے۔ جوڈو کراٹے، باکسنگ، لانگ جمپ اور ہائی جمپ میں سلطنت حیوانیہ میں اُس کا ثانی نہیں۔ اوّل تو مقابلے میں آتا نہیں اور اگر مجبوراً مقابلہ کرنا پڑ جائے تو جب تک اوّل نہ آئے، چین نہیں پڑتا۔ حیرت کی بات ہے کہ اتنا بڑا جانور جب پیدا ہو تو کل ایک انچ کا ہوتا ہے۔ بڑا ہو کر درازیٔ قد میں انسان سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔

پورا کینگرو، جسے بُومر کہتے ہیں، جب اپنے پورے قد کے ساتھ کھڑا ہو تو اس کی لمبائی سات سوا سات فٹ ہوتی ہے۔ اُس کا وزن دو سو پونڈ کے لگ بھگ ہوتا ہے، ناک سے دم تک جسم کی لمبائی دس فٹ ہوتی ہے۔

کینگرو دیہات اور جنگلوں میں اپنی پچھلی ٹانگوں کے بل چلتا ہے۔ چلتا نہیں کیونکہ یہ چلنا نہیں جانتا، چھلانگیں بھرتا ہوا پندرہ میل فی گھنٹا کی رفتار سے بھاگتا ہے۔ یہ اس کے چلنے کی عام رفتار ہے۔ کسی وجہ سے تیز دوڑنا پڑ جائے تو یہ اپنی رفتار تیس، چالیس اور پچاس میل فی گھنٹا کے حساب سے بڑھا سکتا ہے۔ بھورا کینگرو ہائی جمپ اور لال کینگرو لانگ جمپ میں خصوصی مہارت رکھتا ہے۔

تمام تھیلی دار جانوروں کی طرح مادہ کینگرو بھی اپنے بچے کو اپنے پیٹ سے لگی تھیلی میں پالتی ہے۔ یہ تھیلی نرم و ملائم، سمور دار جلد میں قدرت کی طرف سے بنی ہوتی ہے۔ جب بچہ ایک انچ کا ہوتا ہے تو پہلے کچھ ماہ اسی تھیلی میں رہائش اختیار کرتا ہے۔ پیدا ہوتے ہی اس کا منہ خود بخود ماں کے پیٹ میں لگی چُسنی سے چپک جاتا ہے۔ چُسنی بچے کے منہ میں جاتے ہی اتنی پھول جاتی ہے کہ ننھا کینگرو کئی ماہ تک اپنا منہ اس کی گرفت سے نہیں چھڑا سکتا اگر اتفاق سے بچے کا منہ چُسنی تک نہ جا سکے تو وہ فوراً مر جاتا ہے۔ بچے میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ منہ مار کر پھولی ہوئی چُسنی سے دودھ پی سکے۔ اس کے برعکس قدرت نے ماں کو ایک ایسا عضو عطا کیا ہے جس کے ذریعے وہ اپنا دودھ پمپ کر کے بچے کے منہ میں پہنچاتی ہے۔

جب بچہ چار ماہ کا ہو تو اس میں اتنی قابلیت اور طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ تھیلی کی پناہ گاہ سے منہ نکال کر باہر کی دنیا میں تانک جھانک کرنے لگتا ہے۔ اگر ماں کے دل میں رحم آ جائے تو وہ اتنا جھک جاتی ہے کہ بچہ زمین پر منہ مار کر گھاس کے تنکے چبانے لگتا ہے۔ دو چار ہفتوں بعد وہ جسارت کر کے تھیلی سے باہر آتا اور کھیت میں اپنی خوراک کی جستجو میں اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا ہے۔

لیکن جب سونے کا وقت آتا یا کسی قسم کا خطرہ پیدا ہوتا ہے تو وہ چھلانگیں لگاتا ہوا ماں کے پاس آتا اور تھیلی میں گھس جاتا ہے۔ اگر کوئی خطرہ ایسی صورت میں اچانک پیدا ہو کہ بچہ ماں سے دور ہو تو پھر وہ برق رفتاری سے لمبی لمبی چھلانگیں لگاتے بچے کے پاس پہنچتی اور دوڑتے دوڑتے اپنے اگلے پنجوں سے بچے کو اُچک کر لے جاتی ہے۔ راستے میں لمحے بھر کے لیے بھی رُکے بغیر بچے کو تھیلی میں بٹھا لیتی ہے۔

لال کینگرو بھورے کینگرو سے قد و قامت میں بڑا ہے۔ ولارو نام کا کینگرو قدرے لحیم شحیم لیکن قد میں دوسروں سے چھوٹا ہوتا ہے۔ ولارو سے بھی چھوٹے قد کا کینگرو ''ولابی'' کہلاتا ہے۔ ولابی چھوٹے گروہوں میں گھاس پھونس چرتے، جھاڑیوں میں اچھلتے کودتے، درختوں کے پتے چباتے، ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے ہیں۔ ان کی آنکھیں، ناک اور کان اس قدر حساس

ہوتے ہیں کہ بہت دور سے تعاقب کرنے والے شکاری یا اپنے سب سے طاقتور دشمن یعنی جنگلی کتے کے خطرے کو فوراً بھانپ لیتے ہیں۔

کینگرو کا شکار ایک تو اس لیے کیا جاتا ہے کہ وہ کارواں درکارواں فصلوں کو اجاڑتے چلے جاتے ہیں۔ دوسرے اس لیے بھی کہ اس کا گوشت نرم اور زود ہضم ہوتا ہے۔ اس کی کھال سے لچک دار ملائم چمڑا بنتا ہے۔ چمڑے سے دستانے اور ہلکے جوتے بنائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ کینگرو کی کھال سے پوستین بھی بنا لیتے ہیں۔

کینگرو بڑا خاموش طبع، نرم خو اور شرمیلا جانور ہے۔ مگر بزدل ہرگز نہیں۔ اگر اسے چھیڑا جائے اور یہ طیش میں آجائے تو پھر چھیڑنے والے کو چھٹی کا دودھ یاد آجاتا ہے۔ جنگ کی حالت میں یہ اپنے پچھلے پاؤں زمین پر اتنی مضبوطی سے جما لیتا ہے، جیسے لوہے کی سلاخیں گاڑ دی جاتی ہیں اور پھر غضبناک ہو کر غرانے لگتا ہے۔ کسی ماہر باکسر کی طرح اپنے اگلے ہاتھوں سے پینترے بدل بدل کر ایسی ضربیں لگاتا ہے کہ حریف کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔

لمبی لڑائی لڑنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ دو چار ضربوں ہی میں ناک آؤٹ کر دیتا ہے۔ جنگلی کتے کو تو ایک ہی مکے میں ہلاک کر دیتا ہے۔ اگر کئی کتے جمع ہو کر اُس پر پل پڑیں اور یہ اکیلا ان میں گھر جائے تو یہ کوشش کر کے قریب ہی کسی جوہڑ، جھیل یا تالاب اُتر جاتا ہے۔ عام طور پر کتے پانی میں نہیں جاتے لیکن اگر کوئی جیالا ہمت کر کے کینگرو کے تعاقب میں اتر جائے تو وہ اپنے اگلے ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچ کر پانی میں اس وقت تک ڈبوئے رکھے گا جب تک اس کا دم نہیں نکل جاتا۔

چھوٹے کینگروؤں میں پہاڑی ولابی، خرگوش نما ولابی اور چوہے نما ولابی زیادہ مشہور ہیں۔ یہ زیادہ تر چٹانوں یا گھنی جھاڑیوں میں رہتے ہیں۔ بعض چھوٹے کینگرو درختوں پر رہنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ عام کینگرو کے برعکس ان کی پچھلی ٹانگیں چھوٹی اور اگلی لمبی ہوتی ہیں۔ یہ درختوں پر بندروں کی طرح کود کر نہیں چڑھتے بلکہ ریچھ کی طرح قدم جما کر چڑھتے ہیں۔ یہ گھاس اور پتوں کے علاوہ کیڑے مکوڑے بھی کھا لیتے ہیں۔

حیاتیات کے نکتہ نظر سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شجرۂ حیات میں کینگرو کا حسب نسب کیا ہے؟ اس کے آباء و اجداد کون تھے؟ وہ آسٹریلیا میں اتنی تعداد میں کیوں ہیں اور دنیا کے دوسرے علاقوں میں کیوں نہیں؟ ماہرین حیاتیات کا پہلے تو یہ خیال تھا کہ کینگرو کے باپ دادا شمالی امریکا سے بحرۂ بیرنگ کے راستے آسٹریلیا آئے تھے لیکن تازہ ترین تحقیق کا خیال کچھ اور ہے۔

اب یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ لاکھوں سال قبل براعظم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تھے۔ اس لیے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کینگرو جنوبی امریکا سے آسٹریلیا آئے تھے۔ آسٹریلیا میں پائے جانے والے رکازات اور دوسری شہادتوں سے پتا چلتا ہے کہ تھیلی دار جانور ڈھائی کروڑ سال پہلے یہاں موجود تھے۔ حال ہی میں ایک ایسا ڈھانچا ملا ہے جو اونچائی میں دس فٹ اور لمبائی میں بیس فٹ ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ شکلیں صورتیں اور قد و قامت بدلتے گئے۔ کچھ ارتقا کی زنجیر میں بندھ کر معدوم ہو گئے۔ کچھ نے موجود وصورت اختیار کر لی۔

اب کینگرو کے جوڑے دنیا بھر میں تحفۃً بھیجے جاتے ہیں۔ ایک زمانے میں لاہور اور کراچی کے چڑیا گھروں میں بھی کینگرو موجود تھے مگر اب دکھائی نہیں دیتے۔ ◆◆◆

حبیب اشرف صبوحی

ملک

امیر محمد خان، گورنر مغربی پاکستان اللہ بخشے بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ بہت دلیر، ایماندار، اچھے منتظم، با اُصول، پُر رعب اور اسلامی ذہن رکھنے والی شخصیت تھے۔ اسلامی اور پاکستانی تشخص کو قائم رکھنے کے لیے ہمیشہ شلوار، شیروانی اور گلے کا استعمال کرتے۔ اُن کے دورِ حکومت میں ملک میں بڑا امن، سکون اور انصاف کا دور دورہ تھا۔ اشیاء کی قیمتوں پر کنٹرول تھا۔ کسی تاجر کو یہ جرأت نہیں تھی کہ قیمتوں کو بڑھائے۔

اگرچہ وہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں پڑھے تھے لیکن وہ اسلامی طور طریق اور روایات اپنائے ہوئے تھے۔ اُن کے بارے میں مشہور ہے کہ جب ملکہ برطانیہ، الزبتھ پاکستان کے دورے پر لاہور آئی تو گورنر صاحب اُن کے استقبال کے لیے ہوائی اڈے پہنچے۔ جب وہ جہاز سے نیچے اُتری اور استقبال کرنے والوں سے ہاتھ ملانا شروع کیا تو امیر محمد خان صاحب نے ہاتھ ملانے سے انکار کر دیا اور کہا: ''اسلام میں عورت سے ہاتھ ملانے سے منع کیا گیا ہے، میں معذرت چاہتا ہوں۔''

اُن کی اُصول پسندی اور وضع داری کے بہت سے واقعات ہیں جن میں سے کچھ کا ذکر درج ذیل ہے۔

ملک امیر محمد خان کی پنجاب میں نیو خان ٹرانسپورٹ کے نام سے ایک بس سروس چلتی اور مختلف شہروں میں جاتی تھی۔ یہ بس سروس وقت کی پابندی کے لیے مشہور تھی۔ بسیں بہت

نواب آف کالا باغ نے پولیس انسپکٹر سے کیا کہا؟

سخت مزاج مگر ایک با اصول گورنر کے نصیحت آموز واقعات

صاف ستھری اور پُرسکون ماحول ہوتا تھا۔

ایک دفعہ ایک پولیس انسپکٹر نے اوورلوڈنگ پر بس کا چالان کر دیا۔ بس ڈرائیور اور کنڈیکٹر نے بہت احتجاج کیا اور اُس انسپکٹر کو یاددہانی کروائی کہ یہ بس گورنر صاحب کی ہے اور تم ہمارے ساتھ زیادتی کر رہے ہو۔ ہم تم سے اس کا بدلہ لیں گے، تمہیں سبق سکھائیں گے اور کچھ نازیبا باتیں بھی کیں۔ انسپکٹر نے ایک رات کے لیے بس، کنڈیکٹر اور ڈرائیور کو تھانے میں بند کر دیا۔

ٹرانسپورٹ کے منتظمین بات کو بہت بڑھا چڑھا کر گورنر صاحب کے نوٹس میں لائے اور اُس پولیس انسپکٹر کا نام وغیرہ بھی بتایا۔

گورنر صاحب نے متعلقہ انسپکٹر کو حکم جاری کیا کہ وہ گورنر ہاؤس میں آ کر اُن سے ملے۔ مقررہ تاریخ کو پولیس انسپکٹر خوف زدہ حالت میں گورنر صاحب کے سامنے پیش ہوا۔ اُنھوں نے پوچھا کہ واقعہ کیا تھا، تفصیل سے بتاؤ۔ پولیس انسپکٹر نے سارا واقعہ من وعن بتا دیا۔

گورنر نے بڑے اطمینان کے ساتھ اُس کی بات سنی۔ اُس کے بعد اُنھوں نے انسپکٹر کو اپنے پاس بلایا۔ کُرسی سے کھڑے ہو گئے۔ اُس کو گلے سے لگا لیا، بڑی خوشی کا اظہار کیا اور کہا: ''میں آج سے تمہاری ترقی کے احکامات جاری کرتا ہوں اور تمہیں ڈی۔ ایس۔ پی بناتا ہوں۔ تمہاری بہادری اور جرأت کے سلسلے میں اعزازی پولیس میڈل کی سفارش کرتا ہوں۔ تم نے قانون اور انصاف کی پاسداری بلاخوف وخطر کی۔ کسی دباؤ کو قبول نہیں کیا اور میرے سامنے بھی اپنے بیان میں کسی قسم کی معذرت اور اپنے آپ کو گرانے کی کوشش نہیں کی۔ تمہارے جیسے لوگ محکمہ پولیس کے لیے ایک اثاثہ ہیں۔ تم جیسے لوگ پاکستان اور ہمارے معاشرے کے لیے ایک اعلیٰ مثال اور قابلِ فخر شخصیت ہیں۔''

ایک روز وہ شام کو گورنر ہاؤس کے لان میں ٹہل رہے تھے۔ اُنھوں نے دیکھا کہ گورنر ہاؤس کی سرکاری گاڑی باہر جا رہی ہے۔ انھوں نے اپنے اے۔ ڈی۔ سی کو بلوایا اور بتایا کہ اس نمبر کی گاڑی گورنر ہاؤس سے باہر گئی ہے۔ پتا کر کے بتاؤ کہ یہ گاڑی کیوں باہر گئی اور اسے کون چلا رہا ہے؟

اُن کے اے۔ ڈی۔ سی نے بتایا کہ یہ گاڑی آپ کے صاحب زادے ملک اسد لے کر گئے ہیں اور روزانہ لے کر جاتے ہیں۔ گورنر صاحب نے کہا کہ جب گاڑی واپس آئے تو اس کی لاگ بک چیک کر کے بتاؤ کہ یہ گاڑی کتنے دن سے جا رہی ہے اور کتنے میل روز چلتی ہے؟

جب گاڑی واپس آئی تو گورنر صاحب کو بتایا گیا کہ اس گاڑی پر تقریباً ایک ماہ سے آپ کے صاحب زادے اپنے دوستوں کے ساتھ جاتے ہیں۔ روزانہ اتنے گھنٹے گاڑی چلتی ہے اور اتنا پٹرول استعمال ہوتا ہے۔

انھوں نے حکم دیا کہ جتنا پٹرول استعمال ہوا ہے، اُس کے تمام پیسے میں اپنی ذاتی جیب سے دوں گا اور ٹرانسپورٹ افسر کو یہ حکم دیا کہ آئندہ سے کوئی سرکاری گاڑی میرے گھر کے کسی فرد کے لیے استعمال نہیں ہوگی۔ جب تک امیر محمد خان صاحب زندہ رہے، اس پالیسی پر سختی سے کاربند رہے۔

نواب امیر محمد خان صاحب کا ایک بچپن کا دوست تھا۔ وہ سرکاری اور نیم سرکاری اداروں میں ٹھیکیداری کیا کرتا تھا۔ ایک روز وہ نواب صاحب سے ملا اور اُن کو بتایا کہ اُس کے بل تقریباً ایک سال سے واپڈا کے محکمے میں بغیر کسی اعتراض کے پھنسے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں اُس نے کافی درخواستیں بھی دی ہیں اور اعلیٰ افسران سے بھی ملا ہے لیکن شنوائی نہیں ہوئی۔ مہربانی کر کے آپ وہاں فون کروائیں

تاکہ میرے بل نکل آئیں اور میری پے منٹ ہو جائے۔

نواب صاحب نے کہا: ''میں کبھی کسی کی سفارش نہیں کرتا مگر یہ بتاؤ بل صرف تمہارے پھنسے ہوئے ہیں یا دوسرے لوگوں کے بھی؟'' اُس نے بتایا کہ جو لوگ رشوت دیتے ہیں اُن کے بل نکل جاتے ہیں اور جو رشوت نہیں دیتے اُن کے بل پھنسے رہتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے سیکرٹری سے پوچھا کہ واپڈا کے اعلیٰ افسران کے ساتھ میری میٹنگ کس دن ہے؟ اُس نے بتایا کہ فلاں تاریخ کو ہے۔ اُنھوں نے اپنے دوست سے کہا کہ وہ مقررہ تاریخ پر میرے پاس پہنچ جائیں۔ اُن کا دوست مقررہ تاریخ کو پہنچ گیا۔ وہ اُس کو اپنے ساتھ میٹنگ میں لے گئے اور اپنی کرسی کے ساتھ بٹھایا۔

جب اعلیٰ افسران نے یہ دیکھا کہ ایک معمولی سے ٹھیکیدار کو اتنی عزت ملی ہے کہ وہ گورنر صاحب کے ساتھ بیٹھا ہے تو اُس کی عزت بہت بڑھ گئی۔ اس کے ساتھ اُن کو یہ خوف بھی لاحق ہو گیا کہ اس کی کئی درخواستیں آئیں جن کو ہم نے نظرانداز کر دیا۔ پتا نہیں ہمارے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے۔

میٹنگ کے دوران گورنر صاحب نے جہاں اور خامیوں کی نشاندہی کی وہاں یہ بھی بتایا کہ یہاں لوگوں کے بل بغیر کسی اعتراض کے پھنسے رہتے ہیں اور ان کو مالی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آئندہ سے اگر دو ہفتوں کے اندر بل کلیئر نہ ہوئے تو متعلقہ افسر اور محکمہ کے سربراہ کے خلاف بھی کارروائی ہوگی۔ گورنر صاحب کے ان احکامات کی روشنی میں جہاں ان کے دوست کے بل کلیئر ہوئے وہاں اور ہزاروں کا بھلا ہو گیا۔ گورنر صاحب نے تمام سرکاری اور نیم سرکاری محکموں میں یہ نوٹیفکیشن بھیج دیا کہ لوگوں کے بلوں کی ادائیگی میں دیر نہ کی جائے۔ جلد از جلد ادائیگی کو یقینی بنایا جائے۔

☆☆☆

ملک امیر محمد خان سرکاری دورے پر پشاور پہنچے۔ اُس وقت وہاں کے کمشنر جی۔ اے۔ مدنی تھے۔ اُنھوں نے یہ بات نوٹ کی کہ اُن کے استقبال کے لیے اور اُن کو الوداع کہنے کے لیے کمشنر صاحب ائیرپورٹ پر نہیں آئے۔ البتہ اُن سے ملنے گورنر ہاؤس ضرور گئے۔ گورنر صاحب نے اس بات کا بُرا منایا اور اُن سے ناراض ہو گئے۔

گورنر ہاؤس لاہور پہنچنے پر اُنھوں نے اپنے سیکرٹری کو طلب کیا اور کہا کہ جی۔ اے۔ مدنی کی فائل منگواؤ۔ جب فائل آ گئی تو اُنھوں نے اپنے سیکرٹری سے کہا کہ اس پر میری طرف سے یہ احکامات جاری کرواؤ کہ جی۔ اے۔ مدنی کو کمشنر کے عُہدے سے ہٹا کر کم عُہدے پر لگا دیا جائے۔ اُن کے سیکرٹری نے کہا: ''سر یہ نواب محمد اسماعیل کے صاحب زادے ہیں جو قائداعظمؒ کے قریبی ساتھیوں اور مسلم لیگ کے عہدہ داروں میں سے تھے۔ ان کی ٹرانسفر پر سفارشیں آنی شروع ہو جائیں گی''۔

گورنر صاحب کچھ دیر سوچتے رہے پھر کہنے لگے: ''وہ بھی نواب ہم بھی نواب۔ اُس نے ہمارے ساتھ وہ سلوک کیا ہے جو نواب نوابوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ ہم اُس کو معاف کرتے ہیں''۔ بعد میں یہ بات جی۔ اے۔ مدنی تک پہنچی۔ اُنھوں نے معذرت کا ٹیلی فون کر کے اُن کی وضع داری اور اعلیٰ حوصلگی کا شکریہ ادا کیا۔

موجودہ حکمرانوں کے لیے نواب امیر محمد خان آف کالا باغ کی ذات ایک روشن مثال اور مشعلِ راہ ہے۔ کہاں گئے وہ لوگ جن کی وضع داریاں، سادگی، اور کارنامے بھولے سے نہیں بھلائے جاتے۔ یہ لوگ رہتی دُنیا تک اپنا نام چھوڑ گئے۔

وینکٹیش ماڈگولکر

ولایتی مُرغی

ایک مسکین دیہاتی کی سبق آموز کتھا

وہ شاطر سرکاری افسر کے چنگل میں جا پھنسا

صبح ناشتے کے بعد گاؤں والے اپنے کھیتوں کی طرف جانے لگے۔ گاؤں کا مکھیا پٹیل اپنی شکستہ حویلی کے سامنے صحن میں مرغیوں کو دانا چگاتا ہوا دکھائی دیا۔ صبح کی سنہری دھوپ میں پٹیل مٹھیاں بھر بھر کر دانے پھینک رہا تھا۔ دو ولایتی مرغے ان دانوں کو چگے جا رہے تھے۔

گھر کے کام کاج میں آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھنے والا پٹیل آج مرغیوں کو دانا چگا رہا تھا؟ گاؤں والے سوچ میں پڑ گئے۔ ہاتھ میں ہنسیا اور رسّی لیے دس پانچ لوگ پٹیل کے صحن میں جمع ہو کر اس نظارے سے لطف اندوز ہونے لگے۔

پٹیل گھٹنوں کے بل بیٹھا اپنی بنڈی کی جیب سے سفید جوار کے دانے نکال کر مرغوں کی طرف پھینک رہا تھا۔ پرانی کیڑا لگی جوار چھوڑ کر وہ صاف اور نئی جوار کیسے چگائے جا رہا تھا؟ لوگ تعجب میں پڑ گئے۔ وہ پٹیل کی اس کارستانی کو سمجھ نہ سکے۔

ہاں یہ بات سچ تھی کہ دانہ چگنے والے مرغا اور مرغی بالکل نئی قسم کے تھے۔ گاؤں کے بڑے سے بڑے مرغے کے مقابلے میں وہ خوبصورت اور موٹے تازے تھے۔ بڑا مرغا اپنی بھاری بھرکم کلغی ہلاتے دانہ چگ رہا تھا۔ سفید رنگ کا یہ مرغا کسی پولیس افسر سے شان میں کم دکھائی نہ دیتا۔ گردن اوپر کر کے لوگوں پر ایک نظر ڈالتا اور پھر دانہ چگنے میں مصروف ہو جاتا۔

ویسی ہی مرغی بھی تھی۔ دیکھنے میں حسین مگر جسامت میں بالکل کسی بڑے افسر کی بیوی نظر آتی۔ عجیب شان سے چلتی تھی اور گردن مٹکا کر دانے چگتی تھی۔

بے شک مرغیاں اچھی ہیں مگر اس کا یہ مطلب تھوڑے ہی ہے کہ پٹیل خود انھیں دانا چگائے؟ ان ولایتی مرغیوں کو بوئی جانے والی جوار چگائی جا رہی تھی۔ بہت سے لوگ کھڑے ہوئے تھے مگر اس کا کوئی اثر پٹیل کے چہرے پر نہیں تھا۔ جیسے کوئی کسی افسر سے برتاؤ کرتا ہو، اسی طرح پٹیل مرغیوں کے ساتھ پیش آ رہا تھا۔ بڑے ادب کے ساتھ، بڑے اپنے پن سے لیکن آخر یہ سب کیا ہے؟

بھولا سے نہ رہا گیا۔ ایک بار کھنکھارا پھر دھیرے سے بولا ''ولایتی جوڑا کہاں سے خرید لائے ہو؟''

''ارے یہ شہر سے آئی ہیں''۔

اتنی ہامی بھر کر پٹیل پھر مرغیوں کی طرف ادب سے دیکھنے لگا۔

بکریاں چرانے والا لڑکا دل کو لگنے والی بات کہہ گزرا۔ ''چار سیر گوشت تو نکلے گا ہی ان کا۔ کیوں؟''

پٹیل ہاتھ پیچھے کر کے کھڑا ہوا اور بولا۔ ''بے شک! ہمارے گاؤں کے مرغے تو اس کے پاسنگ بھی نہیں اترتے''۔

لوگوں میں اس جوڑے کا چرچا ہونے لگا۔

''بھائی، کون سے دیس کی ہیں؟''

''میں سمجھتا ہوں ولایتی نہیں ہیں، جرمنی کے دکھائی دیتے ہیں۔''

''جرمنی، کیا؟''

''ایک ملک ہے وہیں کے ہوں گے۔''

''تو نے کیسے جانا؟''

''بمبئی میں ہمارے صاحب کے پاس بھی ایسے ہی مرغ مرغی تھے''۔

دانے چگتے چگتے مُرغے کو ہُڑک سوار ہوئی اور وہ مُرغی کے گرد چکر کاٹنے لگا۔ وہ بھاگنے لگی۔ گردن لمبا کر وہ پیچھا کرنے لگا۔ مرغی کٹ کٹ کرتی چلانے لگی۔ صحن بھر میں ہوبلہ شروع ہو گیا۔

پٹیل بیڑی کا کش لیتے ہوئے یہ سب دیکھ رہا تھا۔

ہلکو نے پوچھا۔ ''جوڑی کتنے کی پڑی پٹیل؟''

''ہلکو، میری نہیں ہیں یہ مُرغیاں۔''

''نئی دکھائی دیتی ہیں۔ سوچا تمہاری ہی ہوں گی''۔

''نہ''۔

''مہمان لے آئے کیا؟''

''ارے نہیں، یہ سرکاری ہیں''۔

''سرکاری؟''

''ہاں، ہاں۔ اپنے گاؤں کے لیے سرکار نے بھیجی ہیں''۔

سب تعجب میں پڑ گئے۔ سرکار سزا دیتی ہے انعام دیتی ہے۔ لیکن مُرغے؟

''گاؤں کو مُرغے دینے والی کون سی سرکار ہے؟ سوچنے کی بات ہے''۔ بھولا بولا۔

''گاؤں میں افسر آتے ہیں۔ انھیں کھانا کھلایا ہی جاتا ہے۔ گاؤں کے مُرغے انھیں کیوں کر پسند آئیں گے، اس لیے سرکار نے مرغے بھیجے ہیں''۔ ایک دیہاتی بولا۔

پٹیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ارے، پاگل، افسروں کو مرغ کھانے سے مطلب ہوتا ہے۔ انھیں کیا پتا کہ مرغ دیسی ہے یا ولایتی!''

''پھر کس لیے دیے؟''

مُرغی ہار گئی تھی۔ اب وہ مرغے کے قریب چل رہی تھی۔ مُرغے نے رک کر، بایاں پاؤں اٹھا، سینہ تان، ایک لمبی بانگ دی۔

بانگ سن کر، پڑوسی سنار باہر آیا اور مجمع میں شامل ہو گیا۔ ولایتی مرغے کو دیکھ کر پوچھنے لگا۔ ''بانگ اس نے دی؟''

سنار بوڑھا تھا۔ اس کے دانت جھڑ چکے تھے۔ پوپلا منہ، کان اور سینے کے بال سفید ہو چکے تھے۔ لوگوں کے ہاں کہنے پر وہ ہاتھ کا چپٹا اوپر کر کے کہنے لگا۔ ''اتنے سال سے مُرغے کی بانگ سنتا ہوں مگر آج صبح جیسی بانگ کبھی نہیں سنی تھی''۔

پٹیل خوشی سے پھولا نہیں سمایا۔ کہنے لگا: ''آج صبح نا؟ پھر وہ بانگ تو ان سرکاری مرغوں کی تھی۔''

سنار خوش ہو گیا اور بولا: ''سرکاری ہیں نا، چلو بات ختم ہوئی۔ روپے ادا کیے ہوں گے تم نے؟''

''ہاں''۔ پٹیل نے صفائی پیش کی۔ ''سرکار اب گاؤں میں مُرغیوں کی افزائش نسل کو ترقی دے گی۔ یہ مُرغے ہم سنبھالیں گے تاکہ پانچ سال میں ان مُرغیوں کی اتنی نسل بڑھ جائے کہ گاؤں میں سوائے اس نسل کے اور کسی دوسری نسل کے مرغے باقی نہ رہیں''۔

سب کو یہ بات اچھی معلوم ہوئی۔ تھوڑی دیر غور کرنے

کے بعد بھولا نے کہا: ''اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ جوڑی سرکار نے بھیجی ہے''۔

''اور کیا''۔

''لیکن، پٹیل یہ مرغا مرغی بیماری سے مر گئے تو پھر کیا ہو گا۔ سرکار دام وصول کرے گی؟''

بھولا کا یہ اندیشہ ٹھیک تھا۔ پٹیل بھی سوچ میں پڑ گیا۔ اس مسئلے پر پٹیل نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ تھوڑی دیر رک کر بولا: ''ارے بھولا، ان ولایتی مرغیوں کو بیماری ہی نہیں لگتی۔ اگر بیمار ہو ہی جائیں تو سرکار نے انتظام کیا ہے۔ دوائی کی پیٹی بھیجی ہے جو میرے پاس ہے۔ دوائی دیتے ہی ٹھیک ہو جاتی ہیں''۔

''اچھا۔ پھر ہماری مرغی بیمار پڑے تو لائیں تمہارے پاس؟''

''ہٹ۔ ارے پاگل۔ وہ ولایتی دوائی گاؤں کی مرغیوں پر اثر نہیں کرے گی۔'' پٹیل کی باتیں سن کر گاؤں والوں نے اپنا راستہ لیا۔

آٹھ دس دن گزرے ہوں گے کہ اچانک ایک دن تحصیل دار صاحب کا تانگا گاؤں میں آ کر رکا۔ وہ گاؤں کے حساب کتاب کی جانچ پڑتال کرنے آئے تھے۔ پٹیل گھبرا گیا۔

ہنومان جی کے مندر میں شطرنجی اور تکیے بچھائے گئے چپراسی نے پٹیل سے پانی منگوایا۔ ہاتھ مُنہ دھو کر صاحب تیار ہوئے اور پٹیل سے معائنے کے لیے کاغذات منگوائے۔ کاغذات آتے ہی معائنہ شروع ہوا اور غلطیاں پکڑی جانے لگیں۔ پٹیل اور اس کا کارندہ بستر کے کنارے منہ لٹکائے بیٹھے تھے۔ کچھ گاؤں والے سامنے کے میدان میں بیٹھے زمین پر لکیریں کھینچ رہے تھے۔ سب لوگ اس طرح سے خاموش تھے جیسے انھیں سانپ سونگھ گیا ہو۔

صاحب کاغذات ٹٹول ٹٹول کر غلطیاں پکڑنے میں مصروف تھے۔ چپراسی دیوار کا سہارا لیے قریب ہی کھڑا ہوا تھا۔ کھونٹی پر صاحب کی نیلے رنگ کی شیروانی لٹکی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں بیڈنگ، توشہ دان، چھتری اور چمڑے کا بیگ رکھا تھا۔ یکایک گرجدار آواز میں تحصیلدار کہنے لگے: ''گدھے کہیں کے۔ کام کرتے ہو یا حجامت؟ بے شرم، پاجی، حرامخوری کی تنخواہ پاتے ہو؟ اب کون تمہارا باپ ٹھیک کرے گا اسے؟''

پٹیل اور کارندے کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ افسران کی چمڑی ادھیڑنے پر تلا ہوا ہے۔

آس پاس کے لوگ بھی سہم گئے اور سنبھل کر بیٹھے، اس اندیشے کے پیش نظر کہ کہیں صاحب ان پر بھی برس نہ پڑیں۔ صاحب کے چہرے پر ایک رنگ جا رہا تھا اور ایک رنگ آ رہا تھا۔ زبان سے الفاظ بھی ادا نہیں ہو رہے تھے۔

''کیوں جی پٹیل؟ نوکری کیوں کرنے بیٹھے، حجام کی دُکان کیوں نہیں کھول لی؟ غنڈہ گردی کرتے ہو، پیسے کھاتے ہو، لوگوں کا خون چوستے ہو، حرام خور، پاجی، اُلو کہیں کے!!''

پٹیل ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ گڑگڑا کر کہنے لگا۔ ''سب کچھ اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ صاحب، مہربانی کیجیے، مجھے بچا لیجیے!''

''کیا بچا لوں؟ خاک! شرم نہیں آتی غلطیاں کرتے؟ کتنا پیسا ہضم کر لیا اور ڈکار بھی نہیں لی''۔ پٹیل کے اوسان خطا ہو گئے۔ کھانے کے وقت تک تحصیلدار بولے چلے جا رہے تھے۔ لاکھ غلطیاں تلاش کر ڈالیں۔ صاحب پھر کھانا کھانے اٹھے۔ توشہ دان میں سے کھانا نکالا گیا۔ کھانے کے بعد آرام کرنے لگے۔ بھوک سے کانپتے ہوئے پٹیل کو ایک طرف لے جا کر چپراسی کہنے لگا۔ ''رات کو اچھا کھانا پکواؤ۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا''۔

''بہت اچھا۔ مگر کھانا میٹھا ہو یا نمکین؟''۔ پٹیل نے دریافت کیا۔

''میٹھا کاہے کے لیے؟ ارے مُرغی کا تو مرغی۔ مزہ آ جائے، ایسی بناؤ''۔

''بہت اچھا۔ صاحب''۔

پٹیل واپس گھر آیا اور بیوی کو حکم دینے لگا۔ ''صاحب رات کو یہیں ٹھہرے گا۔ عمدہ کھانا پکاؤ، مگر مُرغی بھی ہونی چاہیے''۔

پٹیل کی بیوی نے عمدہ کھانا بنایا۔ چپراسی توشہ دان بھر کر لے گیا۔ کھانا کھانے کے بعد صاحب ٹھنڈا پڑ گیا اور لہجے میں کچھ نرمی پیدا ہوئی۔ اگلی صبح اچھی خاصی ہدایتیں دے کر جاتے وقت پٹیل سے کہنے لگا: ''کھانا تو نے خوب بنایا، پٹیل اتنی اچھی مرغیاں تمہارے پاس ہیں اس کی خبر ہمیں نہیں تھی''۔

پٹیل ایک دم ہنس دیا اور بولا: ''ضرورت ہو تو ایک دو ساتھ لے جائیے''۔

صاحب اس پر خاموش ہو گئے لیکن چپراسی پٹیل کے اطراف گھومنے لگا۔ پٹیل گھر جا کر بیوی سے کہنے لگا: ''وہ مُرغی چاہتا ہے۔ کہتا تھا، ایسی مُرغیاں تمہارے پاس ہیں، اس کی خبر ہمیں نہیں تھی''۔

پٹیل کے جملہ ختم کرتے ہی اس کی بیوی کہنے لگی۔ ''صاحب کی بڑی خوشامد کرنے لگے ہو! وہ مُرغی مانگتا ہے؟ ہماری مُرغیاں کہاں اچھی ہیں وہ تو اپنی ہی مُرغیاں کھا کر جا رہے ہیں''۔

''کس مُنہ سے ایسا کہوں''۔

''پھر کیا کریں؟ روز تمہارا صاحب آئے گا اور مُرغی مانگے گا۔ پھر ایک بھی مُرغی باقی نہیں بچے گی؟ رات میں پکی ہوئی مُرغیاں اپنی تھوڑے ہی تھیں''۔

یہ سن کر پٹیل سناٹے میں آ گیا۔

''سرکاری مُرغیاں پکائی گئی تھیں''، پٹیل کی بیوی نے بتایا۔

پٹیل ایک دم زمین پر بیٹھ گیا اور اس کی زبان سے نکلا ''ہائے بھگوان۔ اب تو میں مر گیا''۔

باہر کھڑے چپراسی نے سب سن لیا تھا۔ وہ سیدھا صاحب کے پاس پہنچا اور تمام باتوں کی انھیں رپورٹ دے دی۔

تانگا چلنے لگا۔ تب پٹیل اپنی بیوی کے پاگل پن کی وجہ سے پریشان ہو کر تانگے کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

صاحب نے دریافت کیا۔ ''پٹیل مرغی لائے؟''

پٹیل چاپلوسی کی ہنسی ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ ''ویسی مرغیاں اب نہیں رہیں، صاحب!''

''ویسی یعنی کیسی؟ اچھا ولایتی مرغیاں بھی تم پالتے ہو؟''

''میں نہیں صاحب...... وہ مرغیاں......!''

''بولو، کہو! کیوں خاموش ہو؟''

''نہ صاحب...... پر......!''

''بولو، کیا بات ہے؟''

''بچا لو صاحب مجھے۔ بیوی نے غلطی کی ہے۔ میرے پیچھے سرکاری مرغیاں کاٹ کر پکا دیں آپ کے لیے!''

''پاجی، بے شرم۔''!

صاحب پھٹکارنے لگے۔ پٹیل نے تانگے میں بیٹھے صاحب کے قدم تھام لیے اور عرض کرنے لگا۔ ''سنبھال لو صاحب! اب آپ کے ہاتھ میں ہوں۔''

''کیا سنبھالوں، خاک؟ اب کلکٹر مجھے کچا چبائے گا۔ اب میں کیا کروں؟''

''میری غلطی نہیں صاحب! بیوی نے ایسا کر دیا۔ مجھے پتا تک نہیں چلا۔ بچا لو صاحب! اب کی بار بچا لو!!''

''بے وقوف؟ اوپر سے زبان چلاتا ہے۔ اگر تیری بیوی بے عقل ہے تو اس سے مجھے کیا سروکار؟''

تانگا آگے اور پٹیل پیچھے پیچھے۔ صاحب گالیاں دیتے رہے اور پٹیل ان کے پیر پڑتا رہا۔ یہ سلسلہ ایک میل تک چلتا رہا۔ آخر میں صاحب نے کہا:

''جاؤ۔ دفعان ہو یہاں سے۔ درخواست دو مجھے کہ مُرغیاں بیماری سے مر گئیں۔ میں تصدیق کر دوں گا۔ جاؤ پاگل، بے شرم کہیں کے!!!!!''

ڈاکٹر محمد وسیم اکبر شیخ

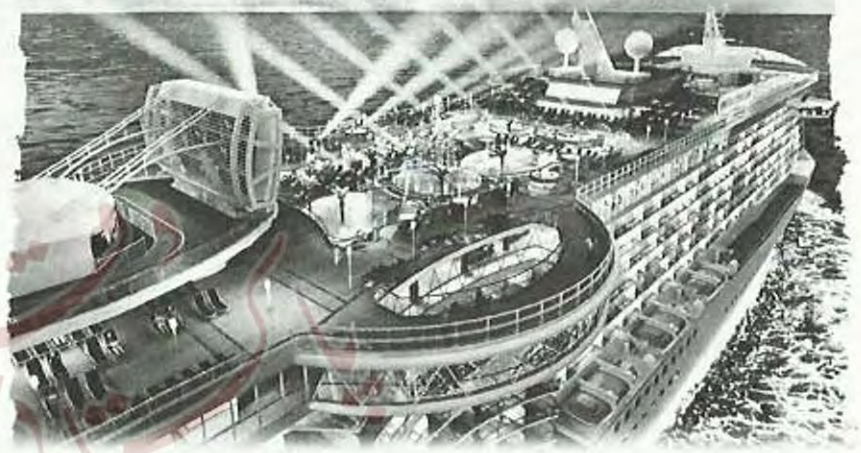

نمود و نمائش کا زہر

ٹی وی ڈرامے معاشرے میں یہ زہر قاتل پھیلانے کا سب سے بڑا ذریعہ بن چکے

ایک بار عالمی شہرت یافتہ شومیکر (موچی) سٹوارٹ وائزمین نے اپنی نگرانی میں چار لاکھ ڈالر کا جوتا بنوایا۔ اس جوتے میں سونے اور پلاٹینم سے خوبصورت نقش و نگار بنائے گئے اور جوتے کی بالائی سطح پر قیمتی ہیرے جواہرات لگا کر اُسے مزید دلکش بنایا گیا۔ اسی طرح فلپائن کی خاتون اول املیڈ مارکوس کے پاس ہزاروں قیمتی لباس سے آراستہ کئی الماریاں تھیں۔ اُس کے پاس چھ سو قیمتی سینڈل اور جوتے تھے۔ جب صدر مارکوس ملک سے فرار ہو رہا تھا تو اس کی بیگم کو قیمتی جوڑوں اور جوتوں کے انتخاب کی پڑی ہوئی تھی۔

ہم سعودی عرب' قطر' کویت اور دبئی کے عربوں کی شاہ خرچیوں کے بارے میں بھی سنتے رہتے ہیں۔ اب ایک سعودی شہزادے نے امریکی کمپنی کو ایسا ہوائی جہاز بنانے کا آرڈر دیا ہے جس کے اندر سوئمنگ پول بھی موجود ہو۔ دنیا میں ارب پتی افراد کی تعداد میں اضافے کے بعد لگژری کاروبار میں بھی اضافہ ہو چکا۔ دولت مند صارفین اب آن لائن

خریداری کرتے ہیں۔ بہت سی کمپنیاں انھیں سفر' ڈنر' تفریح اور شاپنگ کی سہولتیں فراہم کر رہی ہیں۔ بعض کمپنیاں دنیا کے ایک ہزار امیر ترین افراد کے لیے کپڑے اور جوتے تیار کرتی ہیں۔ لگژری برانڈ کی فرموں میں جل سینڈز' جیمی چُو' ورسین اور گویارڈ قابل ذکر ہیں۔

شکاگو' شنگھائی' لندن' پیرس' جنیوا اور نیویارک میں یہ انڈسٹریاں عالمی ارب پتی سرمایہ داروں کے لیے تفریحی ٹور کا اہتمام کرتی ہیں۔ یہ کمپنیاں جنگل میں منگل اور صحرا میں گلستان کا سماں باندھ دیتی ہیں۔ سمندر میں اربوں ڈالر مالیت کے بحری جہازوں میں عیاشی کا سامان فراہم کیا جاتا ہے۔ یہ جہاز تاریک راتوں میں روشن جزیروں کے مانند ہوتے ہیں۔ ایسی تقریبات میں عام دولت مند بھی جانے کا تصور نہیں کر سکتا۔

عالمی بدلتے حالات اور میڈیا کی چکاچوند کی وجہ سے آج انفرادی و اجتماعی اخراجات میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے۔ آج سے تیس پینتیس سال پہلے لوگ جب بازار خریداری کے لیے جاتے تو ان کی فہرست میں درج ذیل اشیاء نہیں ہوتی تھیں مگر آج کل یہ سب ضروریات زندگی میں شامل ہو گئی ہیں: مثلاً شیمپو' سرف' ٹشو پیپر' باڈی لوشن' کولڈ کریم' ٹائیلٹ رول' آئس کریم' کافی' اوولٹین' نوڈلز' کیک' ڈبل روٹی' پیزا' کولڈ ڈرنک' چاکلیٹ' موبائل اور انٹرنیٹ کارڈ وغیرہ۔

اب لوگ بدلتے موسم کے ساتھ لباس' جوتے بھی نئے خریدتے ہیں۔ ہر گھر میں بجلی سے چلنے والی اشیاء کی بھرمار ہے۔ نت نئی کراکری' قالین' صوفے' فانوس' ٹی وی' فریج' کمپیوٹر' فرنیچر اور دیگر آسائشیں زندگی کا حصہ بن چکیں۔ اب انسان' انسانوں کو استعمال کرتا اور چیزوں سے پیار کرتا ہے حالانکہ انسان کو ہمدردی و پیار درکار ہوتا ہے اور چیزیں استعمال کے لیے ہوتی ہیں۔ آج کل تقریباً ہر امیر شخص قیمتی اشیاء جمع کرنے کے چکر میں ہے۔

یہ قیمتی اشیاء انسانی مزاج میں تکبر پیدا کرتی ہیں' تب انسان دوسروں کو حقیر سمجھنے لگتا ہے کہ میرے پاس جو کچھ ہے' وہ تمہارے پاس نہیں۔ یہ تکبر ہی ہے جو فرعونی اور نمرودی مزاج پیدا کرتا ہے۔ آج کل ٹیلی ویژن پہ دکھائے جانے والے ڈراموں میں مصنوعی زندگی کی ٹِپ ٹاپ دکھائی جاتی ہے۔ اُسے دیکھ کر لوگوں میں راتوں رات امیر بننے کا شوق پیدا ہو رہا ہے۔ ان ڈراموں کا طرز زندگی ہمیں غیر محسوس طریقے سے لہو و لعب اور فضول خرچی کی طرف لے جا رہا ہے۔

فضول خرچی اور نمود و نمائش جہاں ایک طرف اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے وسائل کا غلط استعمال ہے' وہیں دیگر طبقات کے لیے آزار کا باعث بھی بنتا ہے۔ فضول خرچ شخص احساس برتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ احساس برتری چاہے دولت کا ہو' چاہے ہنرمندی کا' علم و دانش کا ہو یا حسن و جمال کا' قوت و اقتدار کا ہو یا ذاتی وسائل کا' دوسروں کو کمتر سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ فضول خرچی کا آغاز اوپر سے ہوتا ہے۔ اگر حکمران طبقہ سادہ طرز زندگی اختیار کرے گا تو عوام بھی سادگی کو ترجیح دیں گے۔ لیکن ہم پاکستانیوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ یہاں ایسے امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ رکھنے والے کلب کی حکومت ہے جو عیاش طبقہ ہے اور عوام کو بھوکوں مارنا چاہتا ہے۔

ہم ایک ایسے غریب ملک کے شہری ہیں جہاں کے وزیراعظم ہاؤس کا سالانہ خرچ ۵۴ کروڑ روپے ہے یعنی ایک کروڑ روپے ہفتے سے بھی زیادہ۔ صدر پاکستان اور وزیراعظم بیرون ملک دوروں پر جب تک ۲۰۰ افراد کا لشکر لے کر نہ جائیں اُن کی شان میں اضافہ نہیں ہوتا۔ قومی اسمبلی کے ہر رکن کی تنخواہ ۶۴ ہزار روپے مقرر کی گئی ہے اور ایک رہائش گاہ بھی مفت ملتی ہے۔ رہائش گاہ استعمال نہ کرنے کی صورت میں ۷۵ ہزار روپے ماہانہ ہاؤس رینٹ ملتا ہے۔

گھر کے لیے پانچ ملازم' ذاتی ڈرائیور' گاڑی' محافظ عملہ' بیرون ملک ہوائی جہاز کا ٹکٹ' ٹیلی فون اور بجلی کا بل مفت'

بیرون ملک علاج معالجہ کی سہولت (پوری فیملی کے لیے) اور ملک بھر میں دورے کے دوران پولیس کا حفاظتی دستہ لازمی فراہم کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف حکومت عام آدمی کی تعلیم پر ۱۴۵ روپے سالانہ خرچ کرتی ہے اور علاج پر ۱۹۴ روپے خرچ کیے جاتے ہیں۔ قومی اسمبلی کے ایک رکن نے گاڑی کے پٹرول کا دو ماہ کا بل چار لاکھ اٹھاون ہزار آٹھ سو تینتیس روپے جمع کروایا تھا جس پر اسمبلی میں کافی بحث بھی کی گئی۔

قرآن مجید میں فضول خرچوں کو ''شیطان کا بھائی'' قرار دیا گیا ہے۔ ان انسانی شیطانوں میں ہر وہ انسان شامل ہے، جس کے پاس ضرورت سے زیادہ دولت ہے مگر وہ اسے فلاح عامہ اور دکھی انسانیت پر خرچ کرنے کے بجائے عیاشیوں اور مصنوعی رکھ رکھاؤ پر خرچ کرتا ہے۔ مسلح گارڈ رکھتا ہے۔ شکاری کتے پالتا ہے۔ جوئے اور شراب نوشی کی محفلیں منعقد اور بلاضرورت مہنگی اشیاء کی خریداری کرتا ہے۔ اگر اُس کے پاس کوئی اچھی سی رہائش گاہ ہو تو اُسے چھوڑ کر مضافات میں دس کنال کا بنگلہ لیتا ہے جس کی اندر باہر سے آرائش کی جاتی ہے۔ ایک آدمی نے تو صرف گھر کی بیرونی آرائش پر ۲۵ لاکھ روپے لگا دیے تھے، جس میں ۱۰ لاکھ روپے کا صرف گیٹ لگایا گیا۔ اُس گیٹ پر ہزاروں روپے ماہانہ تنخواہ پر چار مسلح پہریدار ہر وقت پہرہ دیتے۔

غرض اپنی آسائشوں پر وسائل سے زیادہ خرچ کرنے کا رجحان امیر طبقے ہی میں نہیں متوسط طبقے میں بھی سرایت کر چکا۔ شادی بیاہ کے رسم و رواج 'مہندی' ولیمہ' سالگرہ' عقیقہ پر ہزاروں روپے اُڑا دیے جاتے ہیں۔ نکاح جیسی مقدس رسم فائرنگ' میراثیوں کے ڈھول باجے اور نمائش دولت کی نذر ہو جاتی ہے۔ عام آدمی شادی بیاہ پر بے جا اخراجات کرنا ضروری سمجھنے لگا ہے چاہے اس کے لیے قرض ہی لینا پڑے۔ قیمتی شادی کارڈ' کرسیاں' قناتیں' اسٹیج' کارپٹ' برتن' قمقمے' لائٹنگ' بینڈ باجے' محفل موسیقی وغیرہ ایسے اخراجات ہیں جو ولیمہ کے کھانے کے علاوہ ادا کیے جاتے ہیں۔

ہمارے متوسط طبقے میں پھیلی سگریٹ' نوشی' پان' نسوار خوری اور چائے نوشی جیسی عادات بھی فضول خرچی ہی ہیں۔ اگر آج ہمارے صدر' وزیراعظم' گورنر' وزرائے اعلیٰ' ممبران قومی و صوبائی اسمبلی تعیشات اور فضول خرچی سے اجتناب کریں تو ملک کی معیشت بہتر ہو سکتی ہے۔ بچ جانے والی رقم سے ہم سینکڑوں یونیورسٹیاں' کالج' اسکول اور اسپتال قائم کر سکتے ہیں۔ امیر ملکوں کے سربراہان کو دیکھیے' کتنی سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ سادہ خوراک کھاتے اور عام گھروں میں رہتے ہیں۔ پبلک ٹرانسپورٹ استعمال کرتے ہیں۔ سادگی' انسانی زندگی کو پُرلطف اور آسان بناتی ہے۔ یہ مجبوری نہیں ذوق کا نام ہے۔ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ سادہ زندگی بسر کرتے تھے، اسی لیے انھوں نے دنیا کو بدل ڈالا۔ ہم پُرتعیش زندگی گزار کر ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔

اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ پُرتعیش' آرام پرستی اور ہمیشہ نشینی کی زندگی بیماریاں لے کر آتی ہے۔ آج کل لوگ خوراک اور آرام و آسائش کی زندگی پر لاکھوں روپے خرچ کر ڈالتے ہیں۔ بنگلوں کے بڑے بڑے گیٹ' قیمتی بیڈ رومز (خواب گاہیں) ایئر کنڈیشنڈ گاڑیاں اور پُرتعیش دعوتیں اُڑا کر لوگ بے خوابی اور معدے کے امراض میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ دوسری طرف مخلوق خدا پانی' کھانے کے دو نوالوں اور لباس و جوتوں کے لیے ترس رہی ہے۔

یہ دنیا کے مال و اسباب دراصل آزمائش و امتحان کے پرچے ہیں۔ چند روزہ زندگی کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو وسائل اور آسائشیں دی ہیں' ہمیں چاہیے کہ ضرورت سے زیادہ مال و دولت غریب طلبا و طالبات' بیواؤں' یتیموں اور معذور افراد پر خرچ کریں۔ انھیں عملی زندگی میں کارآمد فرد بنائیں اور اپنے لیے بہشت کی راہیں آسان کریں۔ یہی کامیابی کا راستہ ہے جس سے مخلوق خدا خوش اور مالک کائنات راضی ہوتا ہے۔

انوکھے دعوت نامے

محمد ذاکر علی خان

محمد ذاکر علی خان علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ اور منفرد دلکھاری تھے۔ کراچی واٹر اینڈ سیوریج بورڈ کے سربراہ رہے۔ آپ کی کتب میں دیوان عام، روایات علی گڑھ، برائے نام اور مائی باپ شامل ہیں۔ درج ذیل دلچسپ دعوت نامے مرحوم کی کتاب 'مائی باپ' سے اخذ شدہ ہیں جو کسی محفل میں مہمانوں کو بلانے کے انوکھے طریقے سامنے لائے ہیں۔

☆☆☆

کراچی ۵/اپریل ۱۹۸۴ء

بھائی غلام اشرف جہانگیر ممبر (سسٹم) سینٹرل بورڈ آف ریونیو کے نزول کراچی کے مبارک بہانے پھیلے بکھرے علیک بھائیوں کو اکٹھا کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ تکلفات سے پاک اس صحبت میں شریک ہو کر کچھ حال دل سنائیے' کچھ سنیے اور حسب مقدور آب و دانہ سپرد شکم فرمائیے۔ اگر ذوق و ہمت ہو تو شنیدہ اور بھاری بھرکم فن کاروں سے ہلکے پھلکے گانوں کی بازگشت سماعت فرمائیے۔

مرصع و مسجع اردو میں تحریر کیے گئے پُرلطف بلاوے

تاریخ وقت اور مقام تقریب نوٹ فرما لیجیے: پیر ۹/اپریل ۸ بجے شب کسٹم کلب متصل عزیز بھٹی پارک گلشن اقبال کراچی۔

نوٹ:

☆ پراکسی نہیں چلے گی۔

☆ کارڈ گھر پر بھول آنے والوں کو کارڈ لانے والوں پر ترجیح دی جائے گی۔

☆ تقاریر کرنے اور سننے کا کوئی امکان نہیں۔

☆ دیر سے آنے والوں یا قبل از وقت محفل سے جانے والوں کا نام بدمذاقوں کی فہرست میں درج کیا جا سکتا ہے۔

میزبانان محفل
ظل احمد نظامی
محمد ذاکر علی خان

نوید عید

سکون و مسرت کی غصب شدہ ساعتوں کی بازیابی اور محبت کا سبق دہرانے کے لیے ۱۶/مارچ ۱۹۹۶ء بروز ہفتہ ''عید ملن'' کا اہتمام کیا گیا ہے۔ فضا کو روح پرور اور تقریب بامقصد بنانے کے لیے آپ کی شرکت لازمی ہے۔ اس لیے امید ہے کہ آپ مع احباب تشریف لائیں گے تاکہ یاران علی گڑھ سے مل کر اعصابی دباؤ سے نجات پائیں اور بقدر استعداد خوشیاں حاصل کر سکیں۔

۸ بجے شب سانجھ پڑے ''چمن'' میں آنا
۸ تا ۹ بجے شب ڈالی ڈالی پھول چننا' خوشبو اُڑانا' نکہت پھیلانا' غم بانٹنا' خوشیاں پانا
۹ بجے شب دانہ چگنا' پانی پینا
۱۰ بجے شب تازہ دم ہو کر گھر جانا' اگلی عید پھر یونہی منانا

ملن ٹھکانہ سبزہ زار' علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، ایم۔ آر۔ کیانی روڈ' کراچی

نوٹ: دعوت نامہ اور مزید معلومات دفتر سے حاصل کیجیے۔

امسال حق نعمت ۱۰۰ روپے طے پایا ہے۔
ہر دانے پر آپ کی مہر لگی ہے۔

پُرخلوص تعاون کے طلبگار
آپ کے پرانے چمن زار
ذاکر بھائی۔ بلا دانگار

بتقریب سہرا خوانی خاور (رام پوری)

الحمدللہ بہ التجائے مرشدی و تائید ایزدی تقریب شادی فلیٹ آبادی برادروں میں اصغر ظل رحمن خاور مصطفیٰ آبادی بصد خیر و خوبی انجام پائی۔ مراد یابی کے اس مبارک موقع پر برائے تشکر شاعرانہ یکم نومبر بروز اتوار بوقت عروج آفتاب یعنی ۱۱ بجے دن ایک محفل سہرا خوانی غریب خانہ احقر پر منعقد ہوگی۔ تشریف لائیے اور احباب کے اس بے تکلف جھرمٹ میں خود گو شعراء خوش گلو غزل خوان' خوش گوش سامعین اور خوش پوش دڈیوں کے درمیان خوشنو او خوشنما دلہا میاں کی بے زبانی سے ان کی کہانی سنیے۔

قاصدان وفا شعار سے توقع ہے کہ دعوت نامہ جناب کو مل گیا ہوگا ورنہ گزارش ہے کہ ہماری بے اعتنائی سے صرف نظر کرتے ہوئے اس حقیر یاددہانی کو ہی درخور اعتنا سمجھیے اور ہم سے زیادہ خستہ حال نوشہ پر کرم فرما کر طلائی مشوروں سے نوازیے اور حسب حیثیت حوصلہ افزائی فرمایئے۔

میزبانی کا دیرینہ خواہشمند نیاز کیش و تنومند
محمد ذاکر علی خاں (۴۵۷ گارڈن ایسٹ کراچی)

نکات برائے توجہ مہمانان

(۱) مخلصین جن کا شمار متذکرہ بالا زمروں میں نہیں کسی مہمان کی ضمانت پر بطور اپرنٹس شریک ہو سکتے ہیں۔ (۲) ایک شاعر کے ہمراہ دو سادے جا سکتے ہیں۔ (۳) دلہا فی الحال ہر طرح کی قید و بند سے آزاد رہے گا۔ (۴) سخنوری و سخن فہمی کے تحائف سے محروم حضرات کسی اور قسم کا تحفہ لا سکتے ہیں۔ تحائف میں اوسط پھولوں کے ہار کو سرفہرست رکھا گیا ہے۔ (۵) چائے کا اہتمام شیرینی کا احتمال اور نمک پیشی کا خطرہ ہے۔ شیرینی کا انحصار مقدر پر ہے۔ (۶) چائے و مشروبات کے ساتھ ووٹ کی کوئی پابندی نہیں یعنی ہر مہمان آزاد ہے۔ (۷) انتخابات وغیرہ سے متعلق گفتگو کر کے بزم کو الیکشن کیمپ نہ بنایئے۔ (۸) معمر اور منقش کنواروں کو ناکارہ بننے سے بچانے کے لیے تہ دل سے دعائے خیر کیجیے۔

تقریب سعید

الحمدللہ' رفعت نے سلامت اور سلامت نے رفعت پائی۔

خداوند کریم یہ اوج رفعت اور شان سلامت مبارک کرے اور رشتے کو قبول دوام بخشے۔ آمین۔

تم سلامت رہو ہزار برس
اور خوشیاں ملیں بے حد و شمار

ولیمہ مسنونہ

تقریب سعید کے اس موقع پر انشاء اللہ بروز اتوار ۲۰/دسمبر ۱۹۹۸ء' ۸ بجے شام بمقام لمبارڈ کمیونٹی ہال (شکاگو)۔ آپ سے شرکت کی استدعا ہے۔

میزبانان چاق و چوبند
بیگم و شہامت علی خاں ہوشمند
فون نمبر: ۹۸۰۶۔۵۱۵۔۶۳۰

نوٹ: رفعت دلہن اور سلامت دلہا کا نام ہے۔ دونوں شکاگو امریکا میں مقیم ہیں جن کی خواہشات پر دعوتی رُقعہ اُردو میں مرتب کیا گیا اور چھپوا کر امریکا میں تقسیم کیا گیا۔

دعوت شکرانہ باندازِ شاکرانہ

الحمدللہ کینیڈا سے صبا کے عامر بہ دوش جھونکے آ رہے ہیں یعنی ہمارے نورِ نظر صبا کے پیارے شوہر ڈاکٹر محمد عامر حسین عروس نو کا تحفہ لیے بعد مدت عروس البلاد میں پہلی بار وارد ہونے والے ہیں۔ خوشیوں کی اس رُت میں نوشادوں سے ملاقات کو مسرت انگیز اور پُرزیرائی کو ولولہ خیز بنانے کے لیے عزیزوں اور دوستوں نے دھوم دھڑکا مچانے کی ٹھانی ہے چنانچہ شرکائے محفل کو توانائی اور تازگی فراہم کرنے کے لیے دسترخوانی اجتماع کا اہتمام کیا ہے۔ یہ استقبالیہ رائج الوقت مانع طعام مکروہات سے مبرّا ہے۔ اس لیے آپ کو بلا جھجک و بے خطر شرکت کی دعوت دی جا رہی ہے۔ اس یقین کے ساتھ کہ اس محفل ملاپ میں شرکت فرما کر اس کو کامیاب بنائیں گے۔

پابندیٔ وقت سے گو کہ سرزمین پاک کو بالکل پاک کر دیا گیا ہے تاہم دیر آید درست آید بھی پسندیدہ روایت نہیں، اس لیے بے وقت آمد سے بروقت تشریف آوری نہ صرف شرمندگی سے بچاؤ کرے گی بلکہ دیگر مہمانانِ گرامی کے لیے سہولت معدہ اور میزبانوں کی منونیت کا باعث ہوگی۔

آپ کی رفاقتوں پر نازاں
مہمان نوازی کے لیے بے چین
بیگم و ڈاکٹر شاکر حسین

دعوت نامہ

۴۵۷۔ گارڈن ایسٹ
یکم اگست ۷۳ء

محب مخلص و خوش گفتار بھیا دلاور فگار۔ اللہ کرے نئی سناؤ ہر بار

آپ سید ہیں نہ میں ثواب جو' بس یہ اتفاق ہے کہ کل جمعرات ہے اور میرے ایک سخن فہم دوست غذائے جسمانی سے زیادہ خوراک روحانی کے لیے بے قرار ہیں۔ میرے یہ عزیز کویت یونیورسٹی میں انگلش کے پروفیسر ہیں اور آپ طنز و مزاح کے ماہر سخنور، امید ہے کہ اس اتصال سے خوشگوار ماحول تولد ہوگا اور قورمہ بریانی کی بھرپور سنگت میں ہم جیسوں کو بھی دانشور بننے کی سعادت حاصل ہو جائے گی جو بصورت دیگر ممکن نہیں، اِلّا بہ تعاون ٹی۔ وی جو بقول آپ کے پرائی بیوی ہونے کے سبب جملہ متقین یعنی شائقین فردوس کے لیے حرام ہے۔

ویسے تو بحمداللہ آپ بھی اہل سواری ہیں لیکن انتظاماً آٹھ بجے گاڑی بھیج دوں گا تاکہ راستے میں رکاوٹیں حائل نہ ہوں اور آپ تازہ دم و تازہ نفس زینت محفل بن سکیں۔ یہاں یہ بھی وضاحت کر دوں کہ اس مختصر نشست کی نوعیت بھی سنگل وکٹ چیمپئن شپ کی طرح ہوگی لیکن امپائر جب اپنا ہو تو گھبرانے کی بات نہیں اور آپ تو خود ہی چوکے چھکے سے کم لگاتے ہی نہیں۔

المنتظر
محمد ذاکر علی خان

نوٹ: فردوس سے مراد فلم ایکٹریس نہیں جو تقوے کے بغیر دنیا ہی میں دستیاب ہے۔

شام کباب

مخلصم معدہ پرور شکم نواز خدا کرے سلسلہ آنت دراز۔

بعد سلام مسنونہ عرض ہے کہ کسی کے آنے کی خوشی نہ جانے کا غم بلکہ دوستوں کے اصرار پیہم پر بہم مل بیٹھنے کے لیے شام کباب کا حیلہ تلاش کیا ہے۔ انشاء اللہ ۲۱/جولائی ۸/بجے شب بپا

کی جائے گی۔ بے لوث احباب اور بامسالہ کبابوں کی اس گرما گرم چٹخارہ آفریں محفل میں بے لاگ سیخ سواروں کے دستے شدت انتظار میں آپ کو انگاروں پر لوٹتے ملیں گے۔ آپ ازراہِ کرم آئیں یا باقتضائے شکم، اس کا انحصار نیت پر ہے۔ کباب چونکہ خود ہی خستہ حال ٹھہرے ان کا کلیجہ تو جلنے کے لیے بنا ہی ہے۔ اسی لیے اس موقع پر آمد میں معمولی تاخیر خود اپنی سوخت کا موجب بن سکتی ہے۔

یہاں یہ بیان کر دینا بھی مناسب ہوگا کہ میرِ دسترخوان کو سپردِ شکم کرنے کے بعد کسی پر کہنے سننے یا سنانے کی کوئی پابندی نہیں ہوگی اور نہ ہی اس شرکت تناولی کے لیے کسی قسم کی جعلی یا خالی نوٹ بک لانا لازم قرار دیا گیا ہے۔ تاہم اگر طبیعت موج پر ہو اور بیداد بشکلِ دادسہ لے جائے تو بطور چورن معاون ہضم کلام سنایا جاسکتا ہے۔

آپ تشریف لے آئیں گے تو کتنے ہی سوختہ سامانوں کو قرار آ جائے گا اور دسترخوان ما آباد معدۂ شاشاد ہوگا۔ بصورت دیگر جانانِ محفل اپنی مقبولیت اور مرتبے کے شایانِ شان کہیں اور زینت آرائے شکم ہو جائیں گے۔ اس وقت یہ مقولہ بھی یاد دلانا برمحل معلوم ہوتا ہے کہ اٹھی پینٹھ آٹھویں دن لگتی ہے۔ اس لیے خانساماںہ مشورہ یہی ہے کہ اس لذیذ موقع کو کام و دہن سے بچ کر نہ جانے دیں اور اس مخلصانہ پیشکش کو تہِ شکم سے قبول فرمائیں۔ والسلام

الداعی اِلی الکباب
سیخ بدست محمد ذاکر علی خاں
۲۷ر جولائی ۱۹۷۳ء

سبیل ملاقات

بڑوں کو پیارے، چھوٹوں کے دلدار، اسکول کے ساتھی اور پکّے یار سب کے ہمدرد، سب کے غمخوار بھائی ذکی اللہ خان، بفضل کردگار کراچی آئے ہوئے ہیں، چنانچہ اس وارد مسعود سے ملاقات کے لیے پھیلے بکھرے احباب اور پرستاروں کو اکٹھا کرنے کی ٹھان لی ہے۔ آیئے اور رامپور کی اس من موہنی شخصیت کے ساتھ غریب خانے پر ایک یادگار شام منایئے جہاں اسٹیٹ ہائی اسکول سے لے کر رضا ڈگری کالج تک پڑھے ہوئے اسباق دہرایئے اور اکھاڑہ سہراب خان سے لے کر اسٹیڈیم و بے نظیر تک کی ہوا کھایئے۔

یہی نہیں اگر دعوائے شناوری ہے تو ماضی کے سوئمنگ پول میں چھلانگ لگایئے اور حسین واقعات کی پھوار سے شاور لے کر بھرپور تر و تازگی حاصل کیجیے پھر ان تمام دل پسند مشاغل کے بعد مہر لگا دانہ تناول فرمایئے۔ واضح رہے کہ شہر کراچی ایک ایسی عظیم سپر مارکیٹ ہے جہاں زندگی کی ہر آسائش ہر دم دستیاب ہے لیکن ایسے خاص الخاص چونسوں کی خوشبو و ذائقے کے حامل دوستوں کی محفل بشرط نصیب ہی میسر آتی ہے۔

یوں تو بزم آرائی کے لیے شہر ہند سہراب خان کے اکھاڑے کا یہ مثالی پٹھا اکڑ ہی کافی ہے۔ تاہم اس دنگل میں ہر اکھاڑے کی نمائندگی لازم ہے یعنی آپ کی کمی کوئی اور پٹھا دور نہیں کر سکتا۔ اس لیے مجلس لطیف میں بہ نفس نفیس جمعہ ۲۲ر اپریل ۱۹۹۴ء سر شام ۸ بجے تشریف لایئے۔

یاد رکھیے جغادریوں کے اس تاریخی اجتماع میں آپ کی عدم شرکت کفرانِ نعمت کے مترادف ہو سکتی ہے۔ یہی نہیں آپ کی بے وفائی کے چرچے سرحد پار جاسکتے ہیں، اس لیے اُمید واثق ہے کہ آپ شادی لانوں کی ولیمانہ مصروفیات پر احباب ملن کو ترجیح دے کر حسب استعداد خوراک ملاقات حاصل کریں گے کیونکہ اللہ جانے یاروں کی ایسی منفرد صحبت پھر کب میسر آتی ہے۔

داعی و منصرم تقریب
محمد ذاکر علی خان

نوٹ: کراچی میں مروجہ بے وقتی کے نظام سے بغاوت کرتے ہوئے انشاء اللہ یہ شام بروقت ہی منعقد ہوگی۔

راؤ محمد شاہد اقبال

گھر کا "مفت" سیکورٹی سِسٹم

جدید سافٹ ویئرز کی مدد سے اپنے گِردو پیش کو چور ڈاکوؤں سے محفوظ بنالیجیے

"کیا ہوا پریشان کیوں بیٹھے ہو؟ کوئی سنگین مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ، ہوسکتا ہے کہ میں کوئی مدد کر سکوں"۔

عمران کو پریشان دیکھ کر اُس کے دوست دانش نے کہا۔

"یار پریشانی ایسی ہے کہ مجھے نہیں لگتا، اس کا کوئی حل ہو سکتا ہے۔ پھر بھی تمہیں بتا دیتا ہوں۔ مسئلہ کچھ یوں ہے، جیسا کہ گھر میں بھائی کی شادی کے سلسلے میں تقریبات جاری ہیں۔ ہر وقت گھر پر مہمانوں کا آنا جانا لگا ہوا ہے اور ان پر گھر میں کسی مخصوص جگہ آنے جانے پر پابندی تو لگائی نہیں جاسکتی۔ اب ہوتا یہ ہے کہ روز میرے کمرے سے کوئی نہ کوئی چیز گم ہو جاتی ہے۔ جب گھر والوں سے اس چیز کی بابت دریافت کروں تو وہ کہتے کہ کہیں رکھ کر بھول گئے ہو گے، شادی کے بعد ڈھونڈ لینا۔ گم ہونے والی جو چیز اب نہیں مل رہی تو مہمانوں کے جانے پر کیا ملے گی؟ مصیبت یہ ہے کہ کسی مہمان سے اپنی گمشدہ چیز کی بابت دریافت نہیں کر سکتا۔ میں

نے کسی کو اپنی آنکھوں سے تو چیز اپنے کمرے سے باہر لے جاتے دیکھا نہیں۔ بس اسی پریشانی کا شکار ہوں۔'' عمران نے جواب دیا۔

''تم سیکورٹی سرویلنس سسٹم اپنے کمرے میں کیوں نہیں لگا لیتے؟ اس سے کم از کم تمہیں یہ تو معلوم ہوگا کہ کمرے میں، تمہاری غیر موجودگی میں کون آیا گیا اور کس نے تمہاری چیز کو اُٹھایا۔ اس طرح تم مطلوبہ فرد سے اپنی چیز کے بارے میں سوال کرنے کے تو روادار ہو گے''۔ دانش نے کہا

''یار میں تمہیں اپنی پریشانی بتا رہا ہوں اور تم میرا مذاق بنا رہے ہو۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ گھر میں پہلے ہی شادی کی وجہ سے کافی خرچہ ہو رہا، جبکہ ایک سیکورٹی سرویلنس سسٹم بنانے میں ہزاروں روپے درکار ہوں گے، جو سر دست تو میرے پاس نہیں۔'' عمران نے چڑتے ہوئے جواب دیا

''بھئی میں تمہارا مذاق نہیں بنا رہا بلکہ تمہیں واقعی ایک مخلصانہ مشورہ دیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے پاس کیمرے والے کئی موبائل فون اور ویب کیم موجود ہیں۔ اگر تم چاہو تو ان کی مدد سے آج ہی ایک اچھا خاصا سیکورٹی سرویلنس سسٹم بنا سکتے ہو اور وہ بھی بغیر ایک دھیلا خرچ کیے۔ انٹرنیٹ پر کئی ایسے سافٹ وئیر دستیاب ہیں جو اس حوالے سے تمہاری اچھی خاصی مدد کریں گے''۔ دانش نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

یوں عمران نے دانش کے مشورے پر چند گھنٹوں میں کافی عرصے سے غیر استعمال شدہ پرانے کیمروں کی مدد سے ایک سیکورٹی سرویلنس سسٹم بنا لیا۔ اب عمران کو کوئی پریشانی نہیں کیونکہ اب جو بھی اُس کے کمرے سے کوئی چیز لے کر جائے، اُسے اُس کی خبر رہتی ہے۔

اگر آپ کے پاس بھی ایک پرانا ویب کیم یا آئی پی کیمرا یا پھر کیمرے والا کوئی بھی پرانا موبائل فون موجود ہے تو پھر دیر نہ کریں جلدی سے اُسے اپنی میز کی دراز سے نکال لیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ آپ اس پرانے ویب کیم یا موبائل فون کیمرے کی مدد سے اپنا ذاتی سیکورٹی سسٹم بنا سکتے ہیں اور وہ بھی بنا کسی مہارت یا ایک پیسا خرچ کیے بغیر۔

آپ حیران نہ ہوں۔ یہ بالکل سچ ہے۔ ہم آپ کو چند ایسے سافٹ وئیرز کے بارے میں بتائیں گے جن کی مدد سے آپ انتہائی آسانی کے ساتھ اپنے غیر استعمال شدہ ویب کیم یا کیمرے والے موبائل کو اعلیٰ درجے کے سیکورٹی سسٹم میں بدل سکتے ہیں۔ یہ گھر یا عام استعمال کی جگہ میں آپ کی موجودگی یا غیر موجودگی میں ہر سمت نگرانی کرے گا۔ یوں پھر آپ بھی اس قابل ہو جائیں گے کہ اپنے گھر میں لکھ کر لگا سکیں: ''خبردار ہوشیار رہیں کیمرے کی آنکھ آپ کو دیکھ رہی ہے''۔

آئی ویڈیلون (Ivideon)

یہ ایک کلاؤڈ ویڈیو سیکورٹی سرویلنس سافٹ وئیر ہے۔ آپ یہ سافٹ وئیر اس مختصر لنک http://bit.ly/2gMpjnV سے ڈاؤن لوڈ کر کے اپنے کمپیوٹر میں انسٹال کرنے کے بعد، کسی بھی پرانے ویب کیم یا موبائل فون کو اپنے کمپیوٹر کے ساتھ منسلک کر دیں۔ یہ انتہائی خودکار طریقے سے آپ کے ویب کیم یا موبائل کیمرے کو سیکورٹی سرویلنس سسٹم میں بدل دے گا۔ پھر آپ اپنے کمپیوٹر میں کیمرے کے سامنے ہونے والی تمام حرکات و سکنات کو ملاحظہ فرما سکیں گے۔

اس کے علاوہ یہ تمام ویڈیو فوٹیج کو کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک میں محفوظ بھی کرتا رہے گا جسے آپ بوقت ضرورت نہ صرف دیکھ بلکہ اگر چاہیں تو ڈیلیٹ بھی کر سکتے ہیں۔ اس سافٹ وئیر کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اگر آپ کے پاس ایسا لیپ ٹیپ موجود ہے جس میں پہلے ہی سے ویب کیمرا لگا ہوا ہے تو پھر

آپ نے بس اس سافٹ وئیر کو اپنے لیپ ٹاپ میں انسٹال کرنا ہے۔ آپ کا لیپ ٹاپ بھی ایک خودکار سیکورٹی سسٹم میں تبدیل ہو جائے گا۔

اب آپ نے صرف کرنا یہ ہے کہ لیپ ٹاپ کو آن (On) رکھنا ہے۔ جہاں بھی لیپ ٹاپ موجود ہوگا، اُس میں لگا ہوا ویب کیم اردگرد کی تمام ویڈیوز لیپ ٹاپ میں محفوظ کرتا رہے گا۔ اگر آپ چاہیں تو اپنے اس لیپ ٹاپ کے ساتھ ایک یا دو مزید کیمرے بھی منسلک کر سکتے ہیں۔ یہ سافٹ وئیر تمام منسلک کیمروں کے ساتھ بالکل ویسے ہی کام کرے گا جیسے دنیا کا کوئی بھی سیکورٹی سرویلنس سسٹم کرتا ہے۔

یہ سافٹ وئیر مفت میں بیک وقت دو کیمرے منسلک کرنے کی سہولت فراہم کرتا ہے۔ اگر آپ دو سے زیادہ کیمرے اپنے کمپیوٹر یا لیپ ٹاپ کے ساتھ منسلک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے یہ آپ سے ماہانہ فیس طلب کرے گا۔ بہرحال ایک یا دو کیمروں کے لیے یہ مفت میں انتہائی اعلیٰ معیار کی خدمات و سہولیات آپ کو فراہم کر سکتا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اپنی فوٹیج کو ۲۴ گھنٹوں کے لیے اس سافٹ وئیر کی آفیشل ویب سائیٹ پر محفوظ بھی کر سکتے ہیں۔ ہمارے خیال میں اگر آپ صرف اپنے ایک یا دو پرانے ویب کیم یا موبائل کی مدد سے اپنے ذاتی آن لائن سیکورٹی سسٹم کا خوشگوار تجربہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو یہ سافٹ وئیر آپ کے لیے ایک بہترین انتخاب ثابت ہوگا۔

ایٹ ہوم کیمرا (AtHome Camera)

یہ اس حوالے سے انتہائی منفرد ہے کہ یہ سافٹ وئیر آپ پر ایک یا دو کیمروں کو اپنے سیکورٹی سرویلنس سسٹم سے منسلک کرنے کی قدغن عائد نہیں کرتا۔ اگر آپ کے پاس کئی پرانے ویب کیم، آئی پی کیمرے اور کیمرے والے موبائل فون موجود ہیں تو آپ اس سافٹ وئیر کی مدد سے ان سب کو بآسانی ایک سیکورٹی سسٹم میں بدل سکتے ہیں۔

آپ اس لنک www.ichano.com: سے سافٹ وئیر کو اپنے کمپیوٹر میں مفت ڈاؤن لوڈ کرنے کے بعد انسٹال کر لیں۔ یہ سافٹ وئیر بھی آئی ویڈیون کی طرز پر خودکار طریقے سے آپ کے کیمروں کو ایک مربوط ویڈیو سیکورٹی نظام میں بدل دے گا۔ اس سافٹ وئیر کی اضافی خوبی یہ ہی ہے کہ اس کے ساتھ بیک وقت کئی قسم کے کیمروں کو منسلک کر سکتے ہیں اور وہ بھی بالکل مفت میں۔

ہاں ایک بات ضرور ہے۔ آپ اگر چاہیں کہ آپ کی ویڈیو فوٹیج آن لائن اس ویب سائیٹ کے آفیشل سرور پر محفوظ ہو جائے تو یہ سہولت آپ کو مفت میں نہیں فراہم کی جائے گی، اس کے لیے یہ آپ سے کچھ رقم ماہانہ فیس کی مد میں طلب کرے گا۔ اگر آپ کو آن لائن ویڈیو ریکارڈنگ محفوظ کرنے کی ضرورت نہیں اور آپ کے پاس کئی قسم کے پرانے کیمرے بھی موجود ہیں تو پھر یہ سافٹ وئیر مفت میں سیکورٹی سرویلنس سسٹم بنانے کے لیے اعلیٰ درجے کا سافٹ وئیر ہے۔

کونٹا کیم (ContaCam)

کونٹا کیم دنیا بھر میں ایک انتہائی اعلیٰ درجہ کی سیکورٹی سسٹم سافٹ وئیر فراہم کرنے والی کمپنی ہے۔ اگر آپ سیکورٹی سرویلنس سسٹم اور کمپیوٹر کی مبادیات کی جان کاری کے حوالے سے نو آموز ہیں یا پھر اس حوالے سے محدود معلومات رکھتے ہیں تو پھر اس سافٹ وئیر کو ترجیحی بنیادوں پر استعمال کریں۔

اس مختصر لنک http://bit.ly/2ls4XWq سے ڈاؤن لوڈ کر کے آپ اسے اپنے کمپیوٹر میں انسٹال کر لیں اور جتنے چاہیں کیمرے آپ اس سافٹ وئیر کے ساتھ منسلک

کر سکتے ہیں۔ جیسے ہی یہ سافٹ وئیر آپ کے کمپیوٹر میں انسٹال ہوگا، ویسے ہی ویڈیو فوٹیج آپ کے کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک میں محفوظ کرنا شروع کر دے گا۔ اس وقت انٹرنیٹ پر دستیاب یہ واحد سافٹ وئیر ہے، جو اپنی تمام خدمات اور سہولیات بالکل مفت اپنے صارفین کو فراہم کرتا ہے۔

یہ انتہائی خودکار طریقے سے آپ کے کمپیوٹر میں ایک ویب پیج بھی بنا دیتا ہے جس پر یہ آپ کے تمام کیمروں کو بیک وقت ایک جگہ دکھاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کو یہ سافٹ وئیر خوبصورتی کے لحاظ سے کچھ سادہ لگے لیکن جتنی خدمات اور سہولیات یہ مفت میں اپنے صارفین کو فراہم کرتا ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو ایسا سافٹ وئیر شاید ہی آپ کو انٹرنیٹ پر دستیاب ہو۔

ہماری ذاتی رائے کے مطابق آپ اعلیٰ معیار کے اس سافٹ وئیر کو کم از کم ایک بار ضرور آزمائیں تاکہ آپ بھی، ہماری طرح اس کی طرف سے فراہم کردہ مفت سہولیات کے معترف ہوسکیں۔

یاکیم (YawCam)

یہ بھی سیکورٹی سسٹم مفت بنانے کے لیے اچھی شہرت کا حامل سافٹ وئیر ہے جسے آپ اس لنک: www.yawcam.com سے ڈاؤن لوڈ کر کے اپنے کمپیوٹر میں انسٹال کر سکتے ہیں۔ ویسے تو یہ سافٹ وئیر بھی مفت خدمات فراہم کرنے کے حوالے سے اپنی ذات میں ایک انجمن ہے لیکن اس میں ایک خامی ہے، اس کے ساتھ آپ صرف ویب کیم کو منسلک کر سکتے ہیں۔

اگر آپ کے پاس صرف ویب کیم ہیں اور انھیں آپ اپنے گھر یا دفتر کے لیے ایک اچھے سیکورٹی سسٹم میں بدلنا چاہتے ہیں تو پھر آپ ''یاکیم'' کا انتخاب ضرور کریں۔ یہ آپ کو مایوس نہیں کرے گا۔ آزمائش شرط ہے۔

آئی پی کیمرا ویور (IPCamera Viewer)

جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے کہ یہ سافٹ وئیر آئی پی کیمروں اور ویب کیم کے لیے ہی بطورِ خاص بنایا گیا ہے۔ اسے آپ اس مختصر لنک: http://bit.ly/2iKA6mU سے ڈاؤن لوڈ کر کے اپنے کمپیوٹر میں انسٹال کر سکتے ہیں۔

یہاں ہم اپنے قارئین کی معلومات میں اضافے کے واسطے یہ بھی بتاتے چلیں کہ آئی پی کیمرے سے مراد کیا ہے؟

لفظ آئی پی کیمرا، انٹرنیٹ پروٹوکول کیمرا کا مخفف ہے۔ آپ اپنے اردگرد دفتروں، دکانوں اور بازاروں میں جن کیمروں کو لگا ہوا دیکھتے ہیں، انھیں ہی آئی پی کیمرا یا عرفِ عام میں سی سی ٹی وی (CCTV) کیمرا کہا جاتا ہے۔ اگر آپ کے پاس یہ کیمرے موجود ہیں تو اس سافٹ وئیر کے ذریعے آپ اپنے کمپیوٹر کے ساتھ چار آئی پی کیمرے یا ویب کیم منسلک کر سکتے ہیں۔

یہ سافٹ وئیر کچھ خدمات اور سہولیات مفت فراہم کرتا ہے جبکہ کچھ کی یہ فیس طلب کرے گا۔ اگر آپ کے پاس صرف پرانے آئی پی کیمرے موجود ہیں تو پھر آپ اسے ایک بار ضرور آزما کر دیکھیں کیونکہ آئی پی کیمروں کو سیکورٹی سرویلنس سسٹم میں بدلنے کے لیے یہ بے شمار خدمات اور سہولیات بالکل مفت میں فراہم کرتا ہے۔

آئی اسپائی (iSpy)

یہ ایک اوپن سورس سافٹ وئیر ہے جسے آپ اس لنک: www.ispyconnect.com سے بالکل مفت میں ڈاؤن لوڈ کر کے انسٹال کر سکتے ہیں۔ یہ کافی حد تک آئی وڈیون سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس کی مدد سے آپ گھر ہی نہیں بلکہ دفتر میں بھی ایک اچھا خاصا سیکورٹی سسٹم تخلیق کر سکتے ہیں۔ یہ اپنی زیادہ تر خدمات اور سہولیات بالکل مفت فراہم کرتا ہے سوائے میسج سروس اور آن لائن مانیٹرنگ کے۔

عبدالعظیم سمیع

دنیا میں سب سے

خوش باش قوم کی سرزمین

بحرالکاہل میں واقع خوبصورت جزائر پر مشتمل وانواتو (Vanuatu) کی دلچسپ داستان جہاں غربت کے باوجود چور نہیں ہوتے

گہرا نیلگوں شفاف پانی یوں شانِ بے نیازی سے بہہ رہا تھا جیسے اپنے مملکوتی حسن سے باخبر ہو۔ گویا جانتا ہو کہ وہ دنیا کا حسین ترین جزیرہ ہے۔ شیشے کی مانند صاف، دھنک کے رنگوں جیسا امتزاج اور اپنے اندر رنگا رنگ مخلوق سموئے اس جزیرے کو دیکھ کر یہاں آنے والا ہر سیاح اپنی آنکھیں مل مل کے اُس کے حسن کو برداشت کرنے کی کوشش کرتا اور خود کو یقین دلاتا ہے کہ وہ اسی دنیا میں ہے جنت کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر کیا واقعی موجود ہے؟ یہ گہرے سمندر

کے پانی کو دیکھتے ہوئے انہی سوچوں میں غلطاں ہوں کہ کیا یہ حسن واقعی حقیقت ہے یا پھر میں کسی مصور کے بنائے ہوئے کسی قدرتی شاہکار کے اندر جھانک کر خود کو اس تصویر کا حصہ سمجھے ہوئے ہوں۔

چھپاک کی آواز آئی اور ایک مچھلی اٹکھیلیاں کرتی پانی میں غائب ہونے سے پہلے میری سوچوں کے محور کو توڑ گئی۔ میں وانواتو کے فسوں خیز جادو سے وقتی طور پر خود کو کھینچ کھانچ کر باہر نکال لایا اور اپنے پراجیکٹ کے بارے میں سوچنے لگا جس کی وجہ سے میں اس جنت نظیر میں موجود تھا۔

ٹیلی کمیونیکیشن کے شعبے سے وابستہ ہونے کی وجہ سے مجھے دنیا کے مشہور ممالک کی سیاحت کے مواقع ملتے رہتے ہیں۔ میں نے بہت سے ملکوں اور شہروں میں قیام کے دوران وہاں کے لوگوں کے رہن سہن اور نظام زندگی کا مشاہدہ کیا۔ ہر شہر کو اور لوگوں کا مزاج مختلف پایا۔ ثقافت، مذہب اور قومیت کے حوالے سے لوگوں کے نظریات کو سمجھنے کی مشق کرتا رہا۔

حال ہی میں مجھے وانواتو میں نیٹ ورک کو جدید بنانے کے پراجیکٹ پر جانے کا موقع ملا۔ میں حیرت میں ڈوبا ہوا وہاں جانے کے لیے بہت پُرجوش تھا۔ اب نہ صرف پراجیکٹ بلکہ وانواتو کی سیاحت بھی میری ترجیحات میں شامل ہو چکی تھیں۔

وانواتو اُن چند ممالک میں شامل ہے جو پاکستانی پاسپورٹ پر تیس دن کا ویزا ہوائی اڈے پر ہی جاری کرتا ہے۔ اس کے لیے واپسی کا ہوائی ٹکٹ، ہوٹل بکنگ اور آنے کا مقصد ثابت کرنے کے لیے دعوت نامہ دکھانا ضروری ہوتا ہے لیکن وانواتو پہنچنے کے لیے کئی ممالک سے گزرنا پڑتا ہے جو ٹرانزٹ ویزا بھی مانگتے ہیں۔ فجی میں اگر ٹرانزٹ تین گھنٹے سے کم ہو تو ویزے کی ضرورت نہیں پڑتی لیکن اگر جہاز کی آمد اور اگلے جہاز کی روانگی میں دورانیہ تین گھنٹے سے زائد ہو تو پھر ویزا درکار ہے۔ آسٹریلیا کا ٹرانزٹ ویزا بھی چاہیے ہوتا ہے۔

پرواز اور سفر کا خرچہ اس بات پر انحصار کرتا ہے کہ راستہ کون سا اختیار کیا جاتا ہے؟ وجہ یہ کہ فجی ایئر ویز کی لاس انجیلس سے ناندی آنے والی پرواز اور فجی ایئر ویز ہی کی ناندی ہوائی اڈے سے پورٹ ولا جانے والی پرواز میں وقفہ ڈیڑھ گھنٹے کا ہے۔ اس لیے مجھے فجی کے ویزے کی ضرورت نہیں پڑی۔

وانواتو میں مجھے نیٹ ورک ماڈرنائزیشن کا پراجیکٹ مکمل کرنا تھا اور فورجی سروسز بھی لانچ کرنا تھیں۔ لاہور سے پورٹ ولا جانے کے لیے تقریباً اڑتالیس گھنٹے کا لمبا سفر کرنا تھا۔ میں نے لاہور سے دوہا/قطر/ پھر لاس انجیلس/ امریکا سے ناندی فجی اور پھر ناندی فجی سے پورٹ ولا وانواتو کا روٹ منتخب کیا تھا۔ اس روٹ پر تقریباً چار ہزار امریکی ڈالر خرچہ آتا ہے، لیکن اگر آسٹریلیا کا ویزا ہو تو یہ خرچ پچیس فیصد کم ہو سکتا ہے اور سفر کا دورانیہ بھی۔ اس خرچ میں ایک اور روٹ براستہ سنگاپور، ہانگ کانگ کا بھی ہے لیکن اس سفر کے لیے فجی کا ویزا درکار ہوتا ہے چونکہ پاکستان میں فجی کا سفارت خانہ موجود نہیں لہٰذا فجی کے ویزے کے لیے ابوظہبی جانا پڑتا ہے۔ مختصراً پاکستانی پاسپورٹ پر وانواتو پہنچنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

وانواتو کے دارالحکومت پورٹ ولا پہنچنے کے لیے ناندی فجی انٹرنیشنل ایئر پورٹ سے تین گھنٹے کا سفر طے کر کے اے ٹی آر ۷۲ طیارے نے ہمیں منزلِ مقصود پہنچایا۔ سفر کافی آرام دہ رہا۔ دورانِ سفر مجھے انٹرنیشنل تاریخ بدلتے دیکھنے کا بھی اپنی زندگی میں پہلی بار تجربہ ہوا۔ یہ خطِ استوا جیسی فرضی لکیر ہے۔ جس سے دنیا میں تاریخ مقرر کی جاتی ہے۔ اس کے ایک طرف آج اور دوسری طرف کل ہوتا ہے۔ یہ لائن وسط بحرالکاہل سے گزرتی ہے۔ جب آپ اس کو عبور کرتے ہیں تو اس کے ایک طرف گزرا ہوا کل اور دوسری طرف موجودہ دن ہوگا۔ پورٹ ولا پہنچ کر تسلی ہوئی کہ اب پانچ ہفتوں کے قیام کے دوران کام اور سیاحت دونوں ہی بخوبی نمٹ جائیں گے کہ وقت کی قلت نہ تھی۔ یہاں کا ہوائی اڈہ ننھا منا اور سادہ ہے۔ جہاز سے آمد پیدل ہوتی ہے اور پھر امیگریشن کاؤنٹر کا مرحلہ آتا ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ دیکھنے میں آئی کہ روانگی کے وقت ہوائی اڈے پر امیگریشن کاؤنٹر فلائٹ سے صرف پندرہ منٹ پہلے کھولا جاتا ہے۔ پندرہ منٹ کے اندر اندر ایک ہی آدمی پاسپورٹ اسٹیمپ کرتا، بورڈنگ پاس چیک کرتا اور جہاز میں پیدل جانے کے لیے دروازہ کھولتا ہے۔ ون مین شو، میں کافی مرعوب ہوا۔ اتنی پھرتی اور تیز سروس کے ساتھ ساتھ خوش اخلاقی بھی..... واہ! ورنہ تو اکثر جگہ، دس پندرہ لوگوں کا عملہ ہونے کے باوجود مسافر شکوہ کناں اور اسٹاف عاجز ہی دکھائی دیا۔ پورٹ ولا کے ہاؤئیر فیلڈ انٹرنیشنل ہوائی اڈے کی تاریخ بھی اپنے اندر بڑی دلچسپ تاریخ رکھتی ہے۔ اس کا نام ایک امریکی پائلٹ ہارولڈ ولیم باؤئیر (Harold william bauer) کے نام پر رکھا گیا ہے۔ لیفٹیننٹ کرنل باؤئیر نے ۱۹۴۲ء کی جنگِ عظیم میں جاپانیوں کے پانچ جہاز اس خطے میں تباہ کیے تھے۔ اس لیے ائیر پورٹ کو اُسی سے منسوب کر دیا گیا۔

پورٹ ولا پہنچنے کے بعد پہلا ضروری کام کرنسی تبدیل کروانا تھا، سو وہ کام بھی فوراً نمٹایا۔ وانواتو کی کرنسی ''واتو'' ہے۔ پاکستان اور وانواتو میں یہ چیز مشترک ہے کہ ان دونوں ممالک کی کرنسی ہم پلہ ہے۔ آج کی تاریخ میں ایک امریکی ڈالر یا پاکستانی ایک سو سات روپیہ اور ایک سو سات ہی واتو کے برابر ہے۔

اگلا مرحلہ موبائل سم خریدنے کا تھا تاکہ گھر والوں کو اپنی خیریت کی اطلاع دی جا سکے۔ شدید حیرت ہوئی کہ باقی ملکوں کے قوانین سم کے معاملے میں بہت سخت ہوتے ہیں لیکن یہاں باقی دنیا کے ممالک کی نسبت ابھی تک حالات

پُرسکون ہیں لہٰذا سم لینے یا رجسٹرڈ کروانے کا کوئی جھنجٹ نہیں اُٹھانا پڑتا۔ آپ جیسے ہی ایئر پورٹ سے باہر نکلتے ہیں، ٹیلی کمیونیکیشن کمپنی کی طرف سے سم مفت آفر کی جاتی ہے۔ ڈی جی سیل اور ٹیلی کام وانواتو یہاں کی دو ٹیلی کمیونیکیشن کمپنیاں ہیں۔ کوئی بائیومیٹرک یا شناختی کارڈ کی شرط کے ساتھ سم لینا لازم نہیں۔ بس آپ سم لگائیں اور اسی وقت استعمال کرنا شروع کر دیں۔ آسٹریلین اے۔ این زیڈ بینک اور نیشنل بینک آف وانواتو بینکنگ سروس مہیا کرتے ہیں۔

ہوائی اڈے سے باہر نکلا تو آنکھیں اطراف کی خوبصورتی سے خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔ تیز بارش ہو رہی تھی جس کی وجہ سے ہر جگہ ایک خوبصورت سماں بندھا ہوا تھا۔ روانگی سے پہلے میں موسم کے حوالے سے کئی خدشات کا شکار تھا مگر وانواتو آنے کے بعد مجھے آب و ہوا کے اعتبار سے یہ جزیرہ آئیڈیل محسوس ہوا۔ بنیادی طور پر یہاں موسم مناسب رہتا اور کوئی خاص ردوبدل نہیں ہوتا البتہ بارشیں زیادہ ہوتی ہیں۔ یہاں درجہ حرارت عموماً ۲۷ یا ۲۸ ڈگری سینٹی گریڈ رہتا ہے۔ کبھی کبھی سمندری طوفان یا قدرتی آفات یعنی زلزلے وغیرہ بھی آتے رہتے ہیں۔ ۲۰۱۵ء میں یہاں آنے والے سمندری طوفان (Palm) نے کافی تباہی مچائی تھی۔

جزیرے عام طور پر غیر یقینی صورتحال کی زد میں رہتے ہیں لیکن شکر ہوا کہ میرے قیام کے دوران نہ کوئی غیر معمولی صورتِ حال درپیش ہوئی نہ کوئی طوفان آیا، البتہ تیز بارش وقفے وقفے سے دیکھنے کو ملتی رہی۔ جس کی وجہ سے موسم خاصا دلکش رہا۔

کمپنی کی سواری مجھے لینے کے لیے موجود تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سواری کا کوئی مسئلہ سیاحوں کو درپیش نہیں آتا کیونکہ یہاں بس کا سفر نہ صرف سستا بلکہ آسان بھی ہے۔ آپ کو جگہ جگہ بھٹکنا نہیں پڑتا۔ بس کا کوئی خاص اسٹاپ تو نہیں البتہ کرایہ مقرر ہے۔ صرف ۱۵۰ واتو ادا کر کے آپ پورے شہر میں کہیں بھی اُتر سکتے ہیں۔

وانواتو سے پہلے میں پانچ برِاعظموں یعنی ایشیا، افریقا، یورپ، شمالی امریکا اور جنوبی امریکا جا چکا تھا، لیکن یہاں آنا اور دنیا کا چھٹا برِاعظم دیکھنا میرے لیے بالکل ایک نیا تجربہ تھا۔ ایک خوشی و مسرت کا احساس اجاگر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی بنائی ہوئی دنیا کے لازوال حسن کی ایک ہلکی سی جھلک دکھانے کے لیے چُنا۔

میں اس لحاظ سے بھی خوش قسمت تھا کہ اپنے پراجیکٹ کی ٹیم میں واحد پاکستانی اور مسلمان تھا۔ باقی پوری ٹیم چینی انجینئرز پر مشتمل تھی لہٰذا دل میں اس عزت افزائی کا خوشنما احساس بھی تھا۔ اس تفاخر میں مزید اضافہ تب ہوا جب وارِوک ریزورٹ میں ۲۲ نومبر کو منعقدہ ہماری سروسز لانچ کی افتتاحی تقریب میں وزیرِاعظم شارلٹ سلو یا نے بھی شرکت کی اور ہماری کارکردگی کو خوب سراہا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی مست ہوا کے جھونکے مجھے مبارکباد دینے کے لیے گدگدا اور چھیڑ خانیاں کر رہے تھے۔

وانواتو جنوبی بحرالکاہل میں (Y) وائے کی شکل میں ۸۳ جزائر پہ مشتمل ایک ملک ہے۔ دارالحکومت پورٹ ولا ایفاتے نامی جزیرے پر واقع ہے۔ پورٹ ولا آپ تین گھنٹے میں پورا گھوم سکتے ہیں کیونکہ اس کی لمبائی ۱۰ کلومیٹر اور چوڑائی محض ۵ کلومیٹر ہے۔ اس کے ہمسایہ ممالک میں فجی، آسٹریلیا، سلومن آئی لینڈ اور نیوکیلڈونیا ہیں جو بحرالکاہل کے پانیوں سے متصل ہیں۔ اس برِاعظم میں زمینی سرحدیں نہیں اور ممالک بحرالکاہل کے پانیوں سے ملے ہوئے ہیں۔ اسی لیے ان ممالک کو برِاعظم اوشنیا کا حصہ شمار کیا جاتا ہے۔

وانواتو ڈھائی لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ اس کے صدر مقام پورٹ ولا کی آبادی تقریباً تیس ہزار ہے۔ وانواتو میلینیزین ٹرائی اینگل کا حصہ ہے اور اس کے افراد میلینیزین نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں کے جزائر اپنی مثال آپ

ہیں۔ یہاں پر ایک جزیرہ hide away آئی لینڈ کے نام سے ہے جس میں زیرِ زمین ڈاکخانہ بھی موجود ہے جہاں سے دنیا بھر میں ڈاک پوسٹ کی جا سکتی ہے۔

مقامی لوگ وانواتو کو جنت سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اکثر مقامات پر ویلکم ٹو پیراڈائز اور نو وریز (no worries) لکھا نظر آتا ہے۔ جزیرے کے اطراف کا چکر انتہائی خوبصورت مناظر پیش کرتا ہے جن میں سبز پہاڑ، جنگلات، حسین وادیاں، دریا اور بحرالکاہل کا حسین و جمیل پانی اور اس کے ساحل آنکھوں کو طراوت بخشتے ہیں۔ یہ جزیرہ ایک سو تیس کلومیٹر پر محیط ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس ملک کو انتہائی خوبصورتی سے نوازا ہے۔ جتنی خوبصورتی زمین کے اوپر ہے اس سے کہیں زیادہ زیرِ زمین، نیز نایاب زیرِ سمندر آبی حیات اور نباتات بھی موجود ہیں۔ ان میں کورل ریف، ٹرٹل، جیلی فش اور سٹار فش نمایاں ہیں جو پورے سمندری علاقے کو اپنی جاگیر و متاع سمجھتے ہوئے یوں شانِ بے نیازی سے تیرتی پھرتی ہیں کہ انھیں بس دیکھنے کو ہی من کرتا ہے۔ ہاتھ لگانے یا شکار کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ آبی مخلوق کا حسن تو ایک طرف یہاں سمندر بھی اپنے رنگ بدلتا ہے۔

انتہائی شفاف و صاف پانی سورج کی کرنوں کے ساتھ ساتھ اپنا رنگ بدلتا ہے اور دیکھنے والے کو نیلے، سبز اور نارنجی رنگوں کے بھیس بدل بدل کر مسحور کرتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ سورج غروب ہونے کا منظر سونے پہ سہاگہ ہے۔ یہ بے حد دلکش منظر ہوتا ہے۔

اب وانواتو میں تقریباً چار سے سات سو تک مسلمان آباد ہیں۔ یہ زیادہ تر اب بھی ملے نامی قصبے میں ہی آباد ہیں۔ دس بارہ افراد کے گروہ کے ساتھ مجھے کئی جمعے پڑھنے کی بھی سعادت ملی اور خوب لطف آیا۔ زیادہ تر لوگ عیسائی مذہب کے پیروکار اور ہر اتوار باقاعدگی سے چرچ جاتے ہیں۔ ہجوم کی وجہ سے بعض اوقات چرچ کے باہر تک مجمع ہوتا ہے۔

عموماً یہاں لوگ قبائل کی صورت ہی میں رہتے اور قبائلی سردار کے حکم پر چلتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہاں صرف 'جھنگا لالا ہو' کی ہی آوازیں گھومتی ہیں۔ یہاں باقاعدہ پارلیمانی نظام بھی موجود ہے اور کوئی بھی یہاں کی پارلیمنٹ کا دورہ بآسانی کرسکتا ہے۔ وزیراعظم کے پروٹوکول کے لیے صرف فورڈ جیپ اور ساتھ ایک کار ہوتی ہے۔ ۱۹۸۰ء تک یہ ملک New Hebrides کے نام سے جانا جاتا تھا۔

شہروں میں لوگ ٹی شرٹ، نیکر اور قینچی چپل پہنتے ہیں جبکہ دور دراز کے جزائر میں ابھی تک پتوں اور جھاڑیوں کو ہی بطور لباس استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ قبائلی جنگلی نہیں۔ انسان دوست اور انسانیت سے مالا مال ہیں۔ اس قبیلے کے لوگ شہری زندگی کے طرز رہن سہن اور معاش سے کوسوں الگ تھلگ ہیں مگر جینا یہ بھی بخوبی جانتے ہیں۔

یہ موسیقی کے بھی دلدادہ ہیں۔ اپنا یہ شوق وہ بانس سے بنے ہوئے پیانو، شیشے کی بوتلوں اور ڈرم بجا کر پورا کرتے ہیں۔ ان کی موسیقی میں بہت ردھم ہوتا ہے۔ شام کو نارنجی پانی کے ساحلوں پر آگ جلا کر مدھر موسیقی سننا، جھومنا اور ہنسنا ان کی زندہ دلی و صحت کے ساتھ ساتھ مثبت طرزِ حیات اپنانے میں معاون رہتا ہے۔

قدرت کی صناعی سے مالا مال یہ جزیرہ قدرتی نعمتوں سے بھی بھرا پڑا ہے۔ وانواتو میں پھلوں کی بہتات ہے۔ آپ کو جگہ جگہ پھلوں سے لدے درخت نظر آئیں گے۔ انسان نہ چاہتے ہوئے بھی تازہ پھل توڑ کر کھانے کے لیے للچا جاتا ہے۔ خاص طور پر اگر آپ کو تازہ تازہ سرخ رنگ کے آم پکے ہوئے پیڑوں پر جا بجا نظر آئیں تو کون بدذوق نظر چرا کر نکل سکتا ہے۔ ہم پاکستانی تو ویسے بھی آم کے ذائقے کے شوقین ہوتے ہیں نیز پپیتا، ناریل، اناناس اور کیلوں کے بھی درخت کثرت سے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہاں ہر چیز درآمد شدہ ہونے کے باعث قیمت بھی زیادہ ہے۔ کوئی بھی پھل یا سبزی کلو یا درجن نہیں بلکہ تعداد کے حساب سے الگ قیمت پر ملتی ہے۔ مثلاً ایک آم وہاں ڈیڑھ سو سے لے کر تین سو روپے تک کا ملتا ہے۔

یہ لوگ زیادہ تر جڑوں والی سبزیاں کھاتے ہیں۔ خاص طور پر اروی، آلو اور توروان کی من پسند ہیں۔ اسی وجہ سے

یہاں موٹاپا بھی عام ہے لیکن یہاں کے لوگ بس خوش رہنا جانتے ہیں۔ موٹاپے کی فکر میں "دبلے" نہیں ہوتے۔

وانواتو کی مشہور غذا "لاپ لاپ" ابلی یا بھاپ میں پکی ہوئی سبزیاں ہیں جنہیں کیلے کے بڑے بڑے پتوں میں ڈال کر پیش کیا جاتا ہے۔ چاول بھی وہاں کے باشندوں کی مرغوب غذا ہے اور بیف کری بھی وہاں کی خاص کھائی جانے والی ڈش ہے۔

وانواتو میں حلال چکن کا گوشت فجی سے درآمد ہوتا اور صرف ایک سپر مارکیٹ میں دستیاب ہے۔ اس لیے حلال گوشت کافی مہنگا ہوتا ہے۔ مشروبات میں یہ لوگ قہوہ شوق سے پیتے ہیں جو سبزیوں کی جڑوں سے بنایا جاتا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ کھانے سے پہلے پینے سے ذہنی طور پر انسان بہت سی پریشانیوں سے بچا رہتا ہے اور یہ کہ کسی قسم کے بھی نشے سے مبرّا ہونے کے باوجود سکون آور ہے۔

وانواتو کے لوگوں کا ذریعہ معاش سیاحت سے وابستہ ہے۔ چینی قوم نے یہاں پر بھی اپنے قدم جما لیے ہیں اور کثرت سے کاروبار کرتے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر دکاندار اور کاروباری حضرات چینی ہی ملتے ہیں۔ چینی ریستوران بھی جا بجا ہیں۔ عموماً ایک ہی سٹور میں پھل، سبزیاں، گروسری اور روزمرہ استعمال کی تمام اشیاء مل جاتی ہیں۔ اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کے بعد یہاں کے باشندے شام کا وقت سمندروں اور ساحلوں پر گزارتے ہیں کیونکہ یہاں شامیں انتہائی دلفریب ہوتی ہیں۔ لوگ تقریباً روز شام چار بجے پارکوں کا رُخ کرتے اور مختلف کھیل کھیلتے ہیں۔ کرکٹ کے علاوہ رگبی اور فٹ بال کے دلدادہ ہیں۔

خوشیوں کی اس سرزمین پر دسمبر ۲۰۱۷ء میں pacific منی گیمز منعقد ہونے جارہی تھیں۔ مقامی لوگ اس تقریب کا بے چینی و بے صبری سے انتظار کررہے تھے۔ پہلی بار اتنے بڑے پیمانے پر کھیلوں کے مقابلے کا انعقاد یہاں کے باشندوں کو پرجوش بنائے ہوئے تھا۔

چینی حکومت نے ان گیمز کے لیے ایک نیا اسٹیڈیم ''کرمنز'' کے نام سے تعمیر کیا ہے۔ اپنے محدود وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے اتھلیٹس اور کھلاڑیوں کے قیام کا بندوبست سرکاری اسکولوں کی عمارات میں کیا گیا تھا۔ جس سے صاف ظاہر تھا کہ یہ قوم اپنی چادر دیکھ کر پیر پھیلانے والوں میں سے ہے۔

رہائش کے لیے یہاں کئی ریزورٹس ہیں، پانچ ستارہ بھی ہیں اور دوسرے بھی، لیکن مہنگے ہیں۔ ایک رات کے قیام کے لیے ساحلِ سمندر پر بنے ہوئے ریزورٹس کا کرایہ تقریباً پانچ سو یو ایس ڈالر سے بھی کچھ زیادہ ہے۔

ہوٹل اور ریزورٹس وغیرہ مہنگے ہونے کی شاید وجہ یہ ہے کہ وانواتو کی اکانومی کا دارومدار سیاحت پر ہی ہے۔ سیاحت اور بحری جہاز پر سفر، یہ دونوں ہی اس کی معیشت کے اہم ستون ہیں۔ جی ڈی پی کا تقریباً ۶۵ فیصد سیاحت کے شعبے سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ عموماً بدھ کے روز آسٹریلیا سے ایک مسافر بردار بحری جہاز صبح کے وقت ڈھیروں سیاحوں کو لیے آتا ہے۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب پورٹ ولا میں صبح آٹھ سے شام پانچ بجے تک کافی گہما گہمی نظر آتی ہے۔ زیادہ تر چیزیں درآمد شدہ ہوتی ہیں کیونکہ وانواتو میں کوئی کارخانہ یا صنعت سرے سے موجود ہی نہیں۔ وہاں آلودگی ذرہ برابر نہ ہونے کی شاید بڑی وجہ بھی یہی ہے اور ہوا سے لے کر پانی تک ہر چیز صاف شفاف ہے۔

وانواتو میں نظامِ زندگی انتہائی سادہ ہے۔ اگر کسی نے سادگی و خوبصورتی کا بہترین نمونہ دیکھنا ہو تو وہ وانواتو لازمی جائے۔ یہ ان چند ممالک میں سے ہے جہاں پر ابھی تک کمرشل ازم نے زیادہ پنجے نہیں گاڑے۔ جس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ یہاں میکڈونلڈ اور کے ایف سی وغیرہ نہیں ہیں۔

یہاں کے لوگ خود انحصاری کے بل بوتے پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہر انسان اپنے کام خود کرنے کا عادی ہے اور صرف اتنا ہی کام جس سے وہ ایک درمیانے درجے کی زندگی گزار سکے۔ یعنی یہ کہا جاسکتا ہے کہ صرف روٹی کپڑا مکان جیسی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے یہاں کے مقامی

لوگ کماتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھیں دولت، مراعات یا عیاشی کا کوئی شوق نہیں نیز قناعت اور سادگی نہ صرف ان کی گھریلو زندگیوں میں بلکہ معاشرتی سطح پر بھی نظر آتی ہے۔

مثال کے طور پر پورے ملک میں کہیں بھی ٹریفک لائٹ نہ ہونے کے باوجود کوئی فرد صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا اور تمام گاڑیاں قطار اندر قطار چلتی ہیں حالانکہ وہاں بڑی بڑی کشادہ شاہراہیں اور نہ ہی رنگ روڈ یا انڈر پاس جیسی سہولیات ہیں۔ عام سی سڑک پر سادگی اور نظم و ضبط کا حسین امتزاج دیکھنے کو ملا۔

وانواتو کے بارے میں ایک خوشگوار حقیقت یہ بھی معلوم ہوئی کہ آمد و رفت کے جدید ذرائع نہ ہونے کے باوجود یہ دنیا کی سب سے خوش قوم ہونے کا اعزاز دو دفعہ اپنے نام لکھوا چکی۔ بین الاقوامی سروے کے مطابق ۲۰۱۱ء میں اور ۲۰۱۶ء میں بھی وانواتو کو (Happiest nation of the world) کا خطاب ملا۔ یعنی دنیا کی سب سے خوش و خرم قوم۔ اس سے یہ حقیقت روشن ہے کہ خوشی دنیاوی مال و متاع سے نہیں بلکہ قناعت، صبر اور سادگی سے حاصل ہوتی ہے۔ یہاں کے لوگوں کے لیے خوش باشی اور پُرسکون زندگی کا مطلب دولت کا حصول قطعی نہیں۔

یہاں کے باشندے نہ صرف محنتی بلکہ قدرتی وسائل کو بہترین طریقے سے اپنے مصرف میں لاتے ہیں۔ یہ نہ تو وقت ضائع کرنے کے قائل ہوتے ہیں نہ پیسا۔ یہاں دکانیں علی الصبح سات بجے کھل جاتی ہیں اور شام ساڑھے پانچ تک بند کر دی جاتی ہیں۔ اس طرح یہ لوگ سورج کی روشنی اور دن کا بھرپور فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

ہر دم خوش رہنے کے ساتھ ساتھ یہاں کے باشندے دوسروں کے لیے مددگار، خوش اخلاق اور مہمان نواز ہیں۔ صرف خود کو خوش رکھنا تو ہر کوئی جانتا اور چاہتا ہے مگر اصل انسانیت یہ ہے کہ آپ دوسروں کو بھی اتنا ہی خوش رکھیں جتنا آپ رہنا چاہتے ہیں۔ بڑے بڑے ترقی یافتہ ممالک کی نسبت اس چھوٹے سے جزیرے میں شاید اتنی ڈگریاں یا یونیورسٹیاں نہ ملیں لیکن یہاں کے باشندے انسانیت کی نبض سے واقف ہیں۔

میرا ارادہ شہر کے علاوہ وہاں کی دیہی زندگی سے بھی متعارف ہونے کا تھا اور میں نے دیکھا کہ ہر شخص ایک دوسرے کو خاص مسکراہٹ اور گرمجوشی سے ملتا ہے۔ نہ صرف آپس میں بلکہ ہر سیاح کے ساتھ بھی ان کا رویہ بہت دوستانہ ہوتا ہے۔ خاص طور پر اگر شہر سے گاؤں کی طرف سفر کیا جائے تو جہاں جہاں مقامی باشندہ ملے گا وہ آپ کو خوش آمدید کہے گا اور ہاتھ اُٹھا کر باقاعدہ سیلوٹ کرے گا۔ ان کی خوش اخلاقی اور مدد کرنے کی فطرت نے مجھے ان کا گرویدہ بنا دیا۔

ان کی خوش مزاج طبیعت سے میرا تعارف بہت خوبصورت انداز میں ہوا۔ جو میری یادوں میں محفوظ رہ جانے والا واقعہ ثابت ہوا۔

تقریباً ساڑھے پانچ یا چھ بجے ہی سب دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ جس وجہ سے پورا شہر سناٹے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اس شام مجھے دفتر سے نکلتے ہوئے کچھ دیر ہو گئی تھی اور اندازہ ہی نہ ہوا کہ وقت کافی بیت چکا۔ سب کچھ سمیٹ کر نکلتے نکلتے آٹھ بج ہی گئے۔ اب میں تھا اور خاموش رات کی ہمسفر سنسان سڑکیں۔ میں ایک طرف کھڑا ٹرانسپورٹ کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک ایک مقامی باشندہ دور سے آتا دکھائی دیا۔ میں نے اپنا لیپ ٹاپ والا بیگ مضبوطی سے تھام لیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ تنہائی اور اندھیرے کا فائدہ اُٹھا کر شاید وہ مجھ سے بیگ چھیننے کی کوشش کرے گا۔ اندر ہی اندر میں بہت خوف زدہ تھا مگر ظاہر نہ ہونے دیا۔ اس نے قریب آکر پہلے میرا حال چال پوچھا اور پھر خود بھی میرے ساتھ وہیں کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا مگر دل میں اب بھی کہیں نہ کہیں ڈر موجود تھا۔ اس نے ہلکی پھلکی گفتگو جاری رکھی جب تک میری مطلوبہ

بس نہیں آئی۔

دانواتو ۱۹۸۰ء تک اینگلوفرنچ کالونی رہا جس کی وجہ سے یہاں انگریزی اور فرانسیسی زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ مقامی زبان بسلاما ہے جو انگریزی سے کافی ملتی جلتی ہے۔ مثال کے طور پر واٹر کو ووتا، نمبرون کو نمباون اور پرائیویٹ پراپرٹی کو نو پبلک پراپرٹی کہا جاتا ہے۔ آپ کو انگریزی زبان سے اگر ہلکی سی بھی شد بد ہے تو آپ یہاں کے مقامی باشندوں کے ساتھ بآسانی بات چیت کر سکتے ہیں۔ وہ بھی مجھ کے اخلاق اور مہمان نوازی نے بھی مجھے اپنا گرویدہ بنالیا۔

میں نے تقریباً ۵ ہفتے وہاں قیام کیا۔ اکتوبر کے آخری ہفتے سے لے کر دسمبر کے پہلے ہفتے تک میں نے وہاں نعمتوں کی بہاریں دیکھیں۔ قدرتی مناظر اور پھل سبزیوں کی بہتات دیکھی۔ قناعت، صبر، انسانیت اور غربت تو دیکھی مگر...... کوئی چور نہیں دیکھا نہ سنا۔ جی ہاں! وانواتو میں چور نہیں ہوتے۔ کیا واقعی یہ ملک اسی دنیا کے نقشے پر پایا جاتا ہے؟ کیا ایسے کسی جزیرے کا کوئی وجود بھی ہے؟...... جہاں غربت تو ہو، چوری

سے باتیں کرتا رہا۔ اتنے میں میری مطلوبہ بس آگئی۔ میرے بس میں بیٹھنے کے بعد اس نے ہاتھ ہلا کر الوداع کہا اور جہاں سے آیا تھا وہیں ہولیا۔ یہ میرے لیے انتہائی حیران کن لیکن خوشگوار یاد تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ دنیا کے اکثر سیاحتی مقامات پر کسی غیر ملکی کو تنہا دیکھ کر عام طور پر لوٹنے کی کوشش کی جاتی ہے اور مزاحمت پر نقصان بھی پہنچایا جا سکتا ہے مگر یہاں تو معاملہ ہی برعکس تھا۔ میں ان کی سادگی کا تو پہلے ہی قائل تھا اب ان نہ ہو۔ دنیا کی تباہیوں، بربادیوں اور فکروں سے آزاد ایسا دیس جو جنت کا ٹکڑا معلوم ہو۔ جہاں زمین جائیداد کے جھگڑے ہوں نا نسلی مذہبی فسادات۔ اگر آپ ان سب سوالات کے جوابات چاہتے ہیں، اور وہ بھی 'ہاں' میں۔ تو پاسپورٹ اُٹھائیے اور فوراً پہلی فرصت میں وانواتو کی سیاحت کو نکل جائیے۔

abdulazeem001@gmail.com

وسیم بن اشرف

نجمہ کا پھول

ممتا کے عجب روپ دکھلاتی پاکیزہ جذبات سے مملو ایک طرح دار کتھا

شہر کی رونق سے قدرے دور کچے گھر میں چھوٹے سے آنگن میں بیٹھی وہ غریب عورت ایک پرانے کرتے کو پیوند لگا کر پہننے کے قابل بنا رہی تھی۔ اس کے کھڑے پر ان دیکھے دُکھڑے نمایاں محسوس کیے جا سکتے تھے۔ دو سالہ چھوٹا بیٹا اس کی گود میں کھیل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جوار کی روٹی کا ایک ٹکڑا تھما ہوا تھا۔ کچھ کھا لیتا اور کچھ چورا چورا کر کے زمین پر پھینکتا جا رہا تھا۔ بڑا بیٹا کچھ دور بیٹھا اپنے ہی کھیل میں مست تھا۔ وہ مٹی گیلی کر کے گول گول ٹکیاں بناتا اور پھر ان کو دیوار سے چپکا دیتا۔ نجمہ کی ساری توجہ کُرتے کو پیوند لگانے پر مرکوز تھی۔ تبھی سوئی میں دھاگا ختم ہو گیا۔ اس نے دھاگے کی نلکی اپنے گھٹنے کے پاس رکھی تھی۔ دائیں بائیں دیکھا، نلکی نہ ملی تو غصیلے لہجے میں بیٹے سے پوچھا:

"نذارے..... نذارے..... نکی تم نے اٹھائی ہے؟"

نذر جس کو پیار سے نذارا کہتے تھے، اپنے کھیل میں کھویا ہوا تھا۔ ماں کی بات سنی ان سنی کردی۔ اسی دوران نجمہ کا دھیان چھوٹے بیٹے کی طرف گیا۔ وہ روٹی کے ٹکڑے پر نکی رکھ پانی میں بھگو بھگو کر کچی زمین پر عجیب سے نقش و نگار بنا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر نجمہ غصے سے لال پیلی ہوگئی۔ اس کے شوہر کا کُرتہ کئی دن سے پھٹا ہوا تھا۔ دھاگا نہ ہونے سے وہ سلائی نہیں کرسکی تھی۔ جب کُرتے کے چیتھڑے ہونے کو آئے تو نجمہ نے ہمسائی سے کہا: "وہ اس کے گدوں کی سلائی کردے گی، بدلے میں وہ دھاگے کی نکی دے ڈالے"۔

ہمسائی نے اسے نکی دے دی۔ اب نکی کا یہ حال اس سے دیکھا نہ گیا۔ اس نے محمود کو زور سے کھینچ کر تھپڑ جڑ دیا اور بولی: "تیرا بیڑا غرق، کم بخت یہ کیا کیا تم نے، مرجاتو۔" ایک اور طمانچے نے بچے کا دوسرا گال بھی سرخ کردیا۔ شیر خوار زور زور سے رونے لگا۔

اسی دوران باہر سے آواز آئی: "پکوڑے، کرارے، مسالے والے"۔

نذارا مٹی کی ٹکیاں بنانا بھول گیا۔ گیلی مٹی سے لتھڑے ہاتھ قمیص سے صاف کرتا ماں کے پاس آ گیا اور بولا: "ماں، پیسے دے، جلدی دے، نہیں تو پکوڑے والا چلا جائے گا۔"

نجمہ اور طیش میں آ گئی۔ دھاگے کی نکی دھوتے دھوتے قریب رکھی اور غصیلے لہجے میں بولی: "دفع ہوجا، مرتے ہیں نہ جان چھوڑتے ہیں، پیسے دے، تیرے باپ نے درختوں پر لگا رکھے ہیں جو توڑ کر دے دوں، دور ہوجا میری نظروں سے، نہیں تو چمڑی ادھیڑ کر رکھ دوں گی۔"

بیٹا بگڑ گیا، کندھے ہلاتے، ٹانگیں چلاتے، باہیں پھیلاتے ہوئے ماں کی ایک ٹانگ جکڑ لی اور ضد پر اتر آیا، ٹانگ نہ چھوڑی۔ پکوڑے والے کی آواز جوں جوں دور ہوتی جارہی تھی توں توں بچے کے چلانے، رونے کی آواز میں شدت آتی گئی۔ زور سے جکڑی ٹانگ جھٹک جھٹک کر پیسے مانگنے لگا، بات نہ بنی تو جہاں کیچڑ بنا ہوا تھا، وہاں لوٹنیاں کھانے لگا۔ اس کی ساری قمیص کیچڑ سے لتھڑ گئی۔ اسے کیچڑ میں لت پت دیکھ کر نجمہ کے غصے کی آگ اور بھڑک اٹھی۔ اس نے بیٹے کو ٹھڈے مارے۔ اس کی اشتہا کی انتہا دیکھ کر پیچ و تاب کھاتے ہوئے اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ اسی اثنا میں پاؤں میں ٹوٹی چپل گھسیٹتا، سر سے پاؤں تک مٹی میں اٹا ایک گبھرو جوان اندر آیا۔ پیٹھ پر ایک تھیلا تھا جسے آتے ہی اس نے ایک کونے میں رکھ دیا۔

دونوں بچوں کی چیخ پکار نے گھر سر پر اٹھایا ہوا تھا۔ گرمی سے بے حال، پیاس سے برا حال۔ مولا داد کو اگرچہ گھبراہٹ ہو رہی تھی، لیکن بچوں کی حالت دیکھ کر سب بھول گیا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھا۔ ایک بازو سے چھوٹے بیٹے کو اٹھایا اور دوسرے سے بڑے کو اٹھا کر اس کا منہ اپنے رخسار سے لگا لیا۔ دونوں کو ساتھ لپٹا کر غصے سے بھنوئیں اوپر چڑھاتا ہوا بولا: "ان بیچاروں پر کیوں قیامت ڈھا رکھی ہے، کیا ظلم ہوگیا ان سے؟"

نجمہ سیخ پا ہوتے ہوئے بولی: "بیچارہ نہ کہہ ان فتنوں کو، یہ آفت کے پرکالے ہیں، بڑے ضدی ہیں، ان کی کود پھاند مجھ سے برداشت نہیں ہوتی، جینا دوبھر کردیا ہے میرا، حرام ہے جو ایک پل بھی چین لینے دیتے ہوں۔ اس نے باری باری دونوں کی کارگزاری شوہر کے گوش گزار کردی۔"

دونوں کے رخساروں پر بوسے دیتے ہوئے مولا داد نے کہا: "پھر کیا ہوا، کون سا طوفان آ گیا، دھاگا تھا یا سونے کا کنگن، بچے ہیں، اگر بڑے کو دو روپے دے دیتی تو مرجاتی تُو"۔

نجمہ غصے سے بولی: "تمہارے لاڈ پیار نے ہی ان کو بگاڑ

رکھا ہے۔ سمجھانے کے بجائے سر پر چڑھانا شروع کردیتے ہو۔ ان کی اوٹ پٹانگ حرکتوں نے میری ناک میں دم کر رکھا ہے۔ جی چاہتا ہے دانتوں سے پیس ڈالوں، چبا کر کھا جاؤں۔" وہ آپے سے باہر ہوئے جارہی تھی۔

نذارے کی کیچڑ کیچڑ قمیص اتارتے ہوئے مولا داد غصہ ضبط کرتے ہوئے بولا: "ویسے ہی گلا دبا کر مار دے دونوں کو، بچے ہیں سیانے تو نہیں۔ شرارتیں تو کریں گے۔" نذارے کی پیٹھ پر مار پیٹ کے نشان دیکھ کر مولا داد چیخا: "ایسے مارتے ہیں قصائیوں کی طرح، کون سا گناہ ہوگیا تھا ان بے چاروں سے"۔

شوہر کو پیشانی سے پسینا صاف کرتے اور ہونٹوں پر زبان پھیرتے دیکھ کر اس نے غصہ پی لیا اور پگھل سی گئی، فوراً کمرے میں گئی اور ڈبے میں پانی لا کر بولی: "اچھا منہ ہاتھ دھولو، چھوڑو ان کو، ان کا تو دن رات یہی حال ہے، کھاتے پیتے ہوئے بھی ندیدے بنے رہتے ہیں۔ کبھی ان کو کسی چیز سے محروم رکھا ہے، جو چیز بھی آتی ہے پہلے ان کو دیتی ہوں، اگر کبھی پیسا ٹکہ پاس نہ ہو تو یوں آسمان سر پر اٹھا لینا کیا اچھی بات ہے؟ دیکھنے سننے والے کہتے ہوں گے جیسے انھوں نے زندگی میں کچھ دیکھا ہی نہیں۔"

ہاتھ منہ دھو چادر کے کونے سے صاف کر مولا داد قریب پڑی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ نجمہ اس کے لیے پانی لینے چلی گئی۔ کٹورا بھرنے کے بعد اس نے دیگچے میں ہاتھ ڈالا، یہ کیسا۔ دیگچہ خالی تھا، دوپہر کے وقت اس میں کچھ شکر تھی۔ اب خالی برتن منہ چڑا رہا تھا۔ وہ سمجھ گئی، نذارے نے کام دکھایا ہوگا۔

"خالی پیٹ سادہ پانی پینا ٹھیک نہیں"، یہ سوچتے ہوئے وہ بھاگم بھاگ ہمسائی کے گھر گئی، تھوڑی سی لسی لی اور پانی میں ملا کٹورا بھر کے لے آئی۔ مولا داد نے لسی پی اور دونوں بیٹوں کو چارپائی پر ساتھ ہی لٹا لیا، ایک دائیں دوسرا بائیں۔ نجمہ ہاتھ والے پنکھے سے ان کو ہوا دیتے ہوئے بولی: "یہ بڑا تو کچھ زیادہ ہی خراب ہوتا جارہا ہے۔ میرا تو جی چاہتا ہے اس کے ہاتھ پاؤں توڑ کر کمرے میں پھینک دوں، وہیں پڑا رہے تو اچھا ہے"۔ اس نے شکر غائب ہونے کی بات مولا داد کو بتا دی۔

بچے نے پیٹھ ماں کی طرف کرلی اور باپ کے گلے میں بانہیں ڈال اس کے سینے سے منہ لگا آنکھیں بند کرلیں۔ مولا داد دونوں کی طرف دیکھتا ہوا بولا: "چل اب چھوڑ، ابھی تک غصے سے بھری بیٹھی ہے، ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بچوں کو پیٹا نہ کر۔ یہ تیرا زیور تیرے گہنے ہیں، تیری اس طرح کی حرکتوں سے ان کا حسن گہنا جائے گا۔ وہ سیانے کہتے ہیں نہ کہ "ماں پر پوت، پتا پر گھوڑا، بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا"۔ نہیں سمجھی نا! مطلب یہ کہ اولاد اپنے ماں باپ پر ہی ہوتی ہے، تو جل بھن کر کوئلہ نہ ہوا کر۔ بڑے ہوتے جائیں گے تو سمجھ بھی آتی جائے گی، چھوڑ دے اپنا خون جلانا، شکر کھائی تو کیا ہوا، ان صورتوں سے شکر زیادہ اچھی ہے؟ رب کی عطا پر خطا نہیں کرنی چاہیے"۔

بیٹوں کی طرف پیار بھرے غصے سے دیکھ کر نجمہ بولی: "تم نے اپنے لاڈ پیار سے ان کو خراب نہ کردیا تو میرا نام بدل دینا، سر پر چڑھائے رکھا کرانھیں۔ ہاں، سچ یاد آیا! کیا بنا پھر کام کا؟ آج جلدی آ گئے۔"

مولا داد نے ٹھنڈی سانس بھری، کہنے لگا: "بننا کیا تھا، کام کہیں ملتا ہی نہیں۔ پتا نہیں کیسا منحوس مہینا ہے، ماجد کے ساتھ ایک سیٹھ کی کوٹھی پر گیا تھا۔ امید تھی کہ دو اڑھائی ماہ کے لیے کام مل جائے گا، لیکن اس نے دہاڑی لگوائی اور دو سو روپے ہاتھ میں دے کر چلتا کردیا۔ کوئی بیس دن بعد بمشکل روزی روٹی کی آس بندھی تھی۔"

"کیوں ہٹا دیا اس سیٹھ نے"؟ نجمہ نے دکھی لہجے میں پوچھا۔

مولا داد بولا: "بھلی عورت سن! کتوں کے بھونکنے سے کبھی گداگر کی خیرات بند ہوتی ہے نہ ہی کبھی باطن لوگوں کے

باعث کسی کی روزی کم ہوئی ہے۔ اپنا بھی اللہ ہے' کسی پر اپنا زور تو نہیں، سیٹھ کہنے لگا ہمارے پرانے مزدور آ گئے ہیں، اب تمہاری ضرورت نہیں'۔

اداسی کی ایک لہر نجمہ کے سراپے میں سرایت کر گئی۔ شوہر کو پریشان نہیں دیکھ سکتی تھی۔ حوصلہ جمع کر کے بولی: ''چلو پھر کیا ہوا، ابتلا، آزمائش، امتحان بھی تو زندگی کا حصہ ہیں، یہ نہ ہوں تو خوشیوں کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے؟ میں مایوس ہوں نہ ہی نراش، کام کہیں اور مل جائے گا۔ جب تک نہیں ملتا میں زمینداروں کے گھروں میں جا کر اُپلے تھاپ کر کچھ نہ کچھ بندوبست کر ہی لیا کروں گی! مجھے زیادہ فکر اس چڑیل کی ہے روزانہ دوپہر کو برے وقت کی طرح آ جاتی ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ ایک ہزار روپے کا انتظام ہو جاتا تو اپنی ٹوٹی نتھ بیچ کر باقی پیسے ملا اس کا اُدھار چکا کر یہ قصہ تو تمام کر دیتی''۔

''کتنے پیسے بنتے ہیں اس کے؟''

''لیے تو پندرہ سو تھے لیکن اب سود بھی مانگتی ہے۔''

''اچھا، رب داتا ہے، کبھی نہ کبھی تو دے گا ہی۔''

''تو آٹے کا کیا بنے گا؟ مکئی پیس کر جو آٹا گوندھا تھا اس سے پانچ چھ روز تو گزر بسر ہو گئی' لیکن اب بمشکل رات کی روٹی پکے گی۔''

مولا داد سر سے پاؤں تک کانپا پھر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ آخر بولا: ''امید ہے کہ ایک دوسری جگہ پر کام مل جائے گا۔ مستری نذیر کہہ رہا تھا، آنے والے مہینے کی پہلی تاریخ کو سیٹھ انور کا بھٹہ خشت چالو ہونے والا ہے، وہاں تجھے کام دلوا دوں گا، باقی جو رب کی مرضی''۔

وہ پیار بھری نظروں سے سوئے ہوئے بیٹوں کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا: ''دیکھو مالک کے رنگ، کسی کو دھن دولت سے نوازتا ہے تو کھانے والا کوئی نہیں ہوتا۔ جن کو بیٹے بیٹیاں دیتا ہے انھیں کبھی کبھی کھل کر کھانے کو نہیں ملتا۔ روٹی کے ٹکڑے ٹکڑے کے لیے ترستے ہیں۔ گاڑیوں والے سیٹھوں کے نصیب دیکھو، گاڑیاں ہیں تو ساتھ بیماریاں ایسی کہ ڈاکٹر کہتے ہیں پیدل چلو اور پیدل چلنے والے للچائی ہوئی نظروں سے گاڑیوں کو گھورتے رہتے ہیں۔ یہ سب رب کی تقسیم ہے۔ آج جس سیٹھ کی کوٹھی پر میں کام مانگنے گیا تھا، ماجد نے بتایا تین شادیاں کر چکا، لیکن رب کے کام ہیں کہ اولاد کسی ایک سے بھی نہیں ہوئی۔ ایک بچہ گود لے کر پالا تھا وہ بھی ان کا نہ بنا۔ چھوڑ کے چلا گیا۔ یہ عیش و عشرت، بے فکری سے زندگی کے شب و روز گزارنے والے بھی اندر سے کھوکھلے ہیں۔ راحت، آرام، چین ان کی قسمت میں کہاں؟ کوئی اولاد کو ترستا تو کوئی روٹی کے لیے بلکتا ہے۔ رب کا نظام ہے یہ۔''

نجمہ ممتا بھری نگاہوں سے دونوں بیٹوں کو دیکھتے ہوئے بولی: ''ہم بڑے دھن وان ہیں، ہمارا دھن، دولت، مال، جائیداد ہمارے بیٹے ہیں، اللہ ان کی عمر دراز کرے۔ ہم بہت سے لوگوں سے اچھے ہیں اور خوش قسمت بھی، ہمیں کس بات کی فکر؟ جیتے رہیں، جس نے پیدا کیا وہی رزق دے گا۔ پال کر بڑا بھی کر دے گا۔ اس کے گھر میں کس چیز کی کمی ہے، جب بڑے ہوں گے تو ان کو بھی نواز دے گا۔'' اب اس کے دل میں بچوں کی محبت ٹھاٹھیں مار رہی تھی، ماں جو تھی۔ اولاد کسے پیاری نہیں ہوتی؟ اس نے دونوں بیٹوں کا ماتھا باری باری چوما۔

رات ہو گئی تو جو تھوڑا بہت گھر میں تھا، کھا پی کر صحن میں چارپائیاں بچھائیں اور سبھی لیٹ گئے۔ محمود سو گیا، نذارا ماں کی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ باپ نے پیار سے اسے کہا: ''کاکا تجھے مارا تھا نہ ماں نے؟ اب تو اس سے نہ بولنا۔'' دن والی پٹائی یاد آتے ہی نذارا اُٹھ کر باپ کی چارپائی پر چلا گیا۔

اپنی چھوٹی چھوٹی بانہیں باپ کے گلے میں ڈال کر ماں کو دیکھا اور بولا: ''میں نہیں بولتا اماں سے، اماں مجھے مارتی ہے، بہت مارتی ہے۔''

نجمہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کلیجے میں آگ سی دہک اٹھی۔ آہ! میں نے کیسے قصائیوں کی طرح بچے کو مارا۔ دن کا ڈھایا ستم یاد آتے ہی آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ رہا نہ گیا تو جلدی سے اٹھی، نذارے کو اٹھایا، سینے سے لگایا، پیشانی اور رخساروں پر بے ساختہ بوسے دینے لگی۔

''میں اب اپنے ہیرے کو کبھی نہیں ماروں گی۔ رب کرے میرے ہاتھ جل جائیں۔ میں کیوں چاند کے ٹکڑے کو ماروں گی؟ نہیں ماروں گی چندا، معاف کر دے ماں کو۔''

نذارا روزانہ باپ کے ساتھ سوتا تھا لیکن آج نجمہ اسے خود سے الگ نہ کر سکی۔ نجمہ نے دائیں محمود اور بائیں نذارے کو لٹایا اور خود بھی سونے کی کوشش کرنے لگی۔

نیند آتے آتے بے سروپا باتیں اس کے ذہن میں گردش کر رہی تھیں، خاص کر کوٹھی والے سیٹھ کی باتیں، جو اس کے شوہر نے سہ پہر کو بتائی تھیں۔ اس کے کانوں میں شوہر کی گفتگو گونج رہی تھی۔ انہی خیالات میں کھوئے کھوئے اسے نیند آ گئی۔ ابھی اسے سوئے ہوئے کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ باہر کا دروازہ کھٹکا۔ نجمہ کو جھٹکا لگا، اس نے مولا داد کو اٹھایا۔ مولا داد نے جا کر دروازہ کھولا، موٹی توند والا ایک سیٹھ تھا۔ نجمہ کا ماتھا ٹھنکا، رات کے اس پہر، سحر ہونے سے پہلے کون آ گیا۔ مولا داد نے سیٹھ کو صحن میں بٹھایا اور نجمہ سے مخاطب ہوا: ''جن سیٹھ صاحب کا میں نے تجھ سے ذکر کیا تھا یہ وہی ہیں، بڑے نیک اور خدا ترس آدمی ہیں۔''

سر پر دوپٹا درست کرتے ہوئے نجمہ نے دھیمی آواز میں کہا: ''خوش آمدید جناب، آپ نے ہم غریبوں کے گھر قدم رنجہ فرمائے۔''

مولا داد پھر کہنے لگا: ''میں نے تمہیں ایک بات تو بتائی ہی نہیں تھی۔ میرے ذہن میں تھا کہ سیٹھ صاحب آئیں گے تو ان کے سامنے ہی بتاؤں گا۔''

نجمہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ مولا داد پھر بولا: ''ان کا ہمارے اوپر بڑا احسان ہے۔ ہماری غربت پر ترس کھاتے ہوئے یہ ہمیں کچھ دینا چاہتے ہیں''۔

نجمہ کے چہرے پر پریشانی کے لہراتے سائے تحلیل ہو گئے۔ دل میں خوشی سے گدگدی ہونے لگی۔ اس نے آنکھیں نیچی کر لیں۔ مولا داد نے پھر کہا: ''لیکن اس کے عوض ہمیں بھی ان کا ایک حکم بجا لانا ہو گا''۔

نجمہ کا دل اتھل پتھل ہونے لگا۔ انجانے خوف نے سراسیمہ کر دیا۔ مولا داد نے بات کو اٹکا رکھا تھا، آہستہ آہستہ کوئی انکشاف کرنے والا تھا۔ اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا: ''کیسا حکم؟''

''یہی کہ''۔ وہ کہتے کہتے رکا لیکن سیٹھ نے اس کی بات کو ادھورا نہ رہنے دیا اور بولا: ''آپ اپنا ایک بچہ ہمیں دے دیں، لیکن دل میں یہ خیال بھی نہ لانا کہ وہ پھر کبھی آپ کو نہیں ملے گا، وہ ایک طرح سے آپ کا ہی ہو گا، آپ جب بھی چاہیں اس سے مل لیا کیجیے گا۔ کسی قسم کی روک ٹوک نہ ہو گی۔ ہم اپنا بیٹا بنا کر رکھیں گے۔''

سیٹھ نے الفاظ نہیں بم گرا دیے تھے۔ نجمہ کے پاؤں تلے جیسے کسی نے دہکتے انگارے رکھ دیے۔ اسے لگا سیٹھ نے توپ داغ دی ہے اور گولے اس کے دماغ میں لگے ہیں۔ اس کی ساری آس خوشی پانی میں نمک کی طرح بہہ گئی۔ ان قیامت خیز گھڑیوں میں وہ شوہر کی جانب رحم طلب نگاہوں سے تکنے لگی۔ وہ گم سم اور سن کھڑی تھی۔ تھرتھراتی، کانپتی آواز میں بولی: ''ہائے میں مر گئی، یہ کیا سودا کر لیا تم نے' میں تو دنیا جہان کی دولت کے بدلے اپنے بچوں کا ایک بال تک نہ دوں کسی کو۔''

مولا داد اور سیٹھ نے اسے سمجھانے کے واسطے طرح طرح کے جتن کر لیے۔ لالچ کی چوری ڈالی، سبز باغ

دکھائے۔ سہانے سپنوں میں الجھانے کی ہر ممکن سعی کر ڈالی پر بات نہ بنی، نجمہ کے دل پر رتی بھر اثر نہ ہوا۔

آخر مولا داد چیخا: ''اگر تم نے میری دی ہوئی زبان کا مان نہ رکھا تو میں کچھ کھا کے مر جاؤں گا۔''

وہ آہ بھر کر رہ گئی۔ مولا داد کی بات پر اس نے کلیجہ تھام لیا۔ صبر کر کے چپ ہو گئی۔ چھاتی پر منوں وزنی پتھر رکھ کر بیٹا دینا قبول کر لیا۔ اب سوال یہ تھا کہ سیٹھ کو بیٹا کون سا دیا جائے..... چھوٹا یا بڑا؟ یہ فیصلہ بھی انھوں نے مصیبتوں کی ماری نجمہ پر ہی چھوڑ دیا۔

اُدھر مولا داد جلدی کر رہا تھا اِدھر نجمہ جس بیٹے کو بھی دینے کا خیال دل میں لاتی، سینے میں برچھیاں پیوست ہونے لگتیں۔ مولا داد آپے سے باہر ہونے لگا تو اس کے منہ سے آہ شب نکلی: ''ٹھیک ہے، محمود کو لے جاؤ''۔

جیسے ہی سیٹھ نے شیر خوار کا بازو پکڑا، نجمہ پر قیامت ٹوٹ پڑی: ''ہائے رب کا واسطہ ہے، اس کو نہ لے جاؤ، اس نے تو ابھی دودھ بھی نہیں چھوڑا۔'' وہ چیخنے لگی۔ اس کی آہ و بکا سے ماحول میں افسردگی چھا گئی۔

جب سیٹھ نے نذارے کو پکڑا تو وہ بدنصیب اوندھے منہ اس کے اوپر لیٹ گئی، دہائیاں دیتے، آنسو بہاتے بولی: ''ہائے میں نے اس کو پالا پوسا ہے اس کو نہ لے جاؤ''۔

نناوے کے پھیر نے مولا داد کے دماغ پر قبضہ کر رکھا تھا۔ چیخ و پکار، چھینا جھپٹی، چپقلش، آواز گریہ، ماحول میں سخت تناؤ تھا۔ کوئی نتیجہ نہ نکلا تو ماتھے پر تیوریاں ڈالے مولا داد طیش میں آگے بڑھا اور نجمہ کو اس زور کا دھکا دیا کہ وہ لڑکھڑاتی، ڈگمگاتی کئی قدم دور جا گری۔ اس نے نذارے کا بازو پکڑا اور سیٹھ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا: ''آپ لے جائیں اسے۔ اس سے پہلے کہ گھر میں فساد کی آواز ساز بن کر دوسروں کے کانوں میں رس گھولے، اس کو ماتم کرتی رہنے دیں، آپ جائیں۔''

سیٹھ نے نذارے کا بازو پکڑا اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ نجمہ زمین پر گری بانہیں پھیلائے آہ و فریاد کر رہی تھی۔ وہ چیخی، چلائی، اس کی پکار، صدا، آہ و بکا کا کسی پر اثر نہ ہوا۔ ''اللہ کے واسطے، نذارا ہمارا سہارا ہے، اسے مت چھینو مجھ سے، یہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے، نہ لے کر جاؤ میں جیتے جی مر جاؤں گی۔ یہ تازہ پھول کلیاں توڑ کر کیوں میرا گلشن اجاڑنا چاہتے ہو؟''

اس نے جھولی اٹھا کر شوہر اور سیٹھ سے فریاد کی۔ نذارا بھی خود کو سیٹھ کے طاقتور بازو سے چھڑانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے ماں کی طرف دیکھ کر بلبلا رہا تھا ''اماں، اماں! چھڑا لے مجھے۔ اماں یہ مجھے لے کر جا رہا ہے، اماں میں تجھے کبھی تنگ نہیں کروں گا، مجھے اس کے ساتھ نہ بھیج۔''

نذارے نے زور کا جھٹکا مار سیٹھ سے بازو چھڑا لیا اور بھاگ کر ماں سے لپٹ گیا۔ روتے ہوئے ماں کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا بولا: ''ماں اسے کہو ہمارے گھر سے چلا جائے، نہیں..... میں، میں نہیں..... جاؤں گا اس کے ساتھ.....''۔

وہ بے سدھ سا ہو کر ماں کی گود میں لڑھک گیا۔

نجمہ کی اچانک آنکھ کھل گئی۔ نذارا اس کا ہاتھ اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہہ رہا تھا: ''اماں! اماں! میری طرف منہ کر کے کیوں نہیں سوتی؟''

آنکھیں ملتی نجمہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ اس نے نذارے کو زور سے کلیجے کے ساتھ لگا لیا۔ خوب بھینچا، ماتھا چوما، پھر شوہر کا پاؤں ہلاتے ہوئے بولی: ''ہیں جی، سو گئے ہو؟''

''ہائے ربا! کتنا ڈراؤنا خواب دیکھا میں نے۔''

ایسا بھیانک خواب دیکھنے کے بعد پھر نیند کہاں آنی تھی؟ آنکھوں ہی آنکھوں میں سحر ہو گئی۔ ●●●

سید قاسم محمود

محمد بن قاسم کا حملہ

راجا داہر کی دروغ گوئی جب سرزمین ہند میں نور اسلام پھیلنے کا سبب بن گئی

ایک دلچسپ تاریخی داستان

پچھلی قسط کا خلاصہ

ہندوستان میں مالابار کے ایک راجا نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں ہندوستان میں بھی فوجی مہمات بھجوائی گئیں۔ سندھی راجا داہر کے زمانے میں بحری قزاقوں نے مسلمانوں کا ایک جہاز لوٹ لیا۔ راجا نے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ چنانچہ اموی گورنر، حجاج بن یوسف نے اپنے چچازاد بھائی، محمد بن قاسم کو سندھ بھجوانے کا فیصلہ کر لیا۔

اب آگے پڑھیے۔

محمد بن قاسم اپنی فوج کا جائزہ لے رہے ہیں

سے اسی دن وہ جہاز بھی ساز وسامان لے کر پہنچے جو حجاج نے فوجوں کے لیے روانہ کیے تھے۔ ان جہازوں میں سامان رسد کے علاوہ قلعہ کشائی کے آلات اور منجنیقیں بھی تھیں۔ ان میں ایک منجنیق جس کا نام عروسک تھا، سب سے بڑی تھی، جس کو پانچ سو آدمی کھینچتے تھے۔ اس کو چلانے والا استاد جعونہ نامی ایک شامی برانشانے باز تھا۔

دیبل شہر کی آبادی بہت بڑی تھی۔ شہر میں ایک عالیشان دیول (مندر) تھا، جس کی وجہ سے اس کا نام دیبل پڑا۔ مندر کا گنبد بہت بڑا اور بلند تھا، جو بہت دور سے نظر آتا تھا۔ گنبد کی چوٹی پر بہت لمبے بانس میں ریشم کا سبز پرچم آویزاں تھا۔ اس جھنڈے کے متعلق شہر والوں کا یہ اعتقاد تھا کہ جب تک یہ ہوا میں لہرا رہا ہے، شہر کو کوئی فوج فتح نہیں کر سکتی۔ مندر میں سات سو پجاری تھے اور شہر کے گرد فصیل بنی ہوئی تھی۔

محمد بن قاسم جیسے ہی دیبل پہنچے، سندھی فوجیں ان کی آمد کی خبر سن کر شہر کے دروازے بند کر بیٹھ گئیں۔ محمد بن قاسم نے یہ دیکھ کر اپنی فوج کو حکم دیا کہ جا بجا مورچے قائم، موقع بموقع منجنیقیں نصب اور لشکر کے سامنے خندقیں کھودی جائیں تاکہ دشمن اچانک حملہ نہ کر سکے۔ چنانچہ شہر کے چاروں طرف خندقیں کھود کر اور مورچے قائم کر کے اسلامی فوج نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔

سندھی فوجیں کبھی کبھی شہر پناہ سے نکل کر حملہ کرتیں اور پھر شہر پناہ کے دروازے بند کر لیتیں۔ ابھی تک حجاج کی طرف سے جنگ کی اجازت نہیں ملی تھی، اس لیے اسلامی فوج ان حملوں کو جھیل رہی تھی۔ اسی طرح ایک ہفتہ گزر گیا، یہاں تک کہ آٹھویں روز حجاج کا حکم آن پہنچا کہ جنگ شروع کر دی جائے۔ اس کے بعد جنگ شروع ہو گئی، دونوں جانب کے لوگ بہادری سے لڑتے تھے، شہر پناہ کی دیواریں جا بجا ٹوٹ رہی تھیں مگر شہر پھر بھی فتح نہ ہوتا۔

ایک برہمن کا مشورہ

مسلمان اسی شش و پنج میں تھے کہ شہر کو کس طرح فتح کیا جائے کہ اچانک ایک دن ایک برہمن شہر پناہ سے نکل کر اسلامی لشکر میں آیا۔ اس نے محمد بن قاسم سے جان کی امان

طلب کرتے ہوئے کہا: ''اللہ امیر کی عمر دراز کرے۔ ہمیں نجوم کی کتابوں سے معلوم ہوا کہ آپ سندھ کا ملک فتح کر لیں گے۔ لیکن جب تک یہ بت خانہ برقرار ہے، اس شہر کو فتح کرنا ممکن نہیں۔ آپ کو اس کی کوشش کرنی چاہیے کہ یہ بت خانہ مسمار ہو اور اس پر جو جھنڈا لہرا رہا ہے وہ کسی طرح پارہ پارہ ہو، اسی میں اس شہر کی فتح کا راز ہے''۔

محمد بن قاسم کا حکم

برہمن یہ کہہ کر چلا گیا۔ محمد بن قاسم کو شہر والوں کے اس عقیدے کا حال معلوم ہوا تو اس نے استاد جعونہ کو بلا کر کہا: ''اگر تم اس جھنڈے اور مندر کے گنبد کو منجنیق کے ذریعے پتھروں سے گرا دو تو میں تمہیں دس ہزار درہم انعام دوں گا۔''

جعونہ نے کہا ''عروسک نامی منجنیق لائی جائے، میں تین پتھروں سے جھنڈے اور گنبد کو گرا دوں گا۔'' محمد بن قاسم بولے: ''اگر تم نہ گرا سکے اور منجنیق کو کوئی نقصان پہنچا تو تمہاری کیا سزا ہونی چاہیے؟'' جعونہ نے جواب دیا ''اگر میرا نشانہ خطا ہو جائے تو میرے ہاتھ کاٹ دیے جائیں۔''

محمد بن قاسم نے اس گفتگو کے بعد حجاج بن یوسف کو ایک خط لکھا، جس میں ساری صورت حال سے مطلع کیا۔ حجاج کو اس جنگ سے اس قدر دلچسپی تھی کہ اس نے محمد بن قاسم سے سندھ کی لڑائی کے حالات جاننے کے لیے خط کتابت کا ایسا عمدہ انتظام کیا تھا کہ سندھ کا ہر خط ساتویں دن بصرے میں ان کو مل جاتا تھا۔ پھر ایک ہی ہفتے میں اس کا جواب سندھ پہنچ جاتا۔

حجاج کو جب یہ خط ملا تو اس نے جواب میں لکھا: ''ہمیں وہ شرائط منظور ہیں جو جعونہ سے کی گئی ہیں۔'' اس نے جنگ کے متعلق مزید ہدایات دیتے ہوئے لکھا ''جب تم جنگ شروع کرو تو فوج کو اس طرح ترتیب دو کہ سورج تمہاری پشت پر رہے، تاکہ دشمنوں کی نقل و حرکت اچھی طرح دیکھ سکو۔ دن کے ابتدائی حصے ہی میں جنگ شروع کر دو۔ جنگ شروع کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے نصرت اور مدد طلب کرو۔ اگر سندھ کا کوئی شخص رحم اور پناہ کے لیے درخواست کرے تو اسے امن دو، لیکن دیبل والوں کو بالکل پناہ نہ دو۔'' حجاج نے یہ بھی لکھا کہ عروسک منجنیق مشرق کی سمت میں گاڑ کر اور ایک پایہ کم کر کے مندر کے گنبد کو نشانے پر لے کر سنگ باری کرے، پھر یقیناً فتح تمہاری ہے۔

محمد بن قاسم نے حجاج کی ہدایت کے مطابق دیبل پہنچنے کے نویں روز جب آفتاب طلوع ہو رہا تھا، منجنیق نصب کر کے حکم دیا کہ مندر پر سنگ باری شروع کی جائے۔ سب سے پہلا پتھر جعونہ نے پھینکا اور پتھروں کی بارش شروع کر دی۔ آخر گنبد ٹوٹ گیا اور جھنڈا گر پڑا۔ گنبد ٹوٹتے ہی شہر میں ہلچل مچ گئی اور سندھی فوجیں شہر سے نکل کر مقابلہ کرنے لگیں۔ مسلمان یہی چاہتے تھے کہ روبرو مقابلہ ہو، جیسے ہی سندھی فوجیں شہر سے نکل کر مقابل ہوئیں، مسلمانوں نے ہر طرف سے شدید حملہ شروع کر دیا۔

سندھی فوجیں ان حملوں کی تاب نہ لا کر پھر شہر میں گھسنے لگیں۔ مسلمانوں نے شہر پناہ کی فصیل پر چڑھنا شروع کر دیا۔ پہلا شخص جو شہر پناہ کی فصیل پر چڑھا، وہ کوفے کا ایک بہادر صعدی بن خزیمہ تھا۔ دیبل والوں نے جب یہ دیکھا کہ مسلمان شہر پناہ کی فصیل پر چڑھ گئے ہیں، انھوں نے فوراً دروازے کھول دیے اور امن کے خواہاں ہوئے۔ محمد بن قاسم نے کہا مجھے امن دینے کی اجازت نہیں۔ تین روز تک فتنہ پرداز ہتھیار بند لوگ قتل کیے گئے۔ شہر فتح ہوتے ہی دیبل کا گورنر بھاگ نکلا تھا۔ شہر میں امن قائم ہونے کے بعد محمد بن قاسم نے پیمائش کر کے زمین کے قطعات مسلمانوں میں تقسیم کیے۔

مسلمان قیدیوں کی برآمدگی

دیبل کے سرکاری جیل خانے میں سراندیپ کے وہ مسلمان قید تھے، جن کی آزادی کے متعلق حجاج نے راجا داہر کو خط لکھا تھا۔ راجا داہر نے فریب سے جواب دیا کہ یہ کام بحری

تزاقوں کا ہے، جن پر ہمارا بس نہیں چلتا۔ دیبل کے فتح ہوتے ہی راجا داہر کے اس فریب کا پردہ اس طرح چاک ہوا کہ محمد بن قاسم نے جیل کے داروغہ کو جس کا نام قبلہ تھا، بلوا کر حکم دیا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ قبلہ عقل مند، ہوشیار، ادیب، ماہر انشا پرداز اور صاحب علم شخص تھا۔ اس نے محمد بن قاسم سے کہا: ''قبل اس کے کہ آپ مجھے سزا دیں، مسلمان قیدیوں کو بلا کر پوچھیے کہ میرا سلوک ان کے ساتھ کیسا رہا ہے اور میں نے ان کے آرام اور سزا کے ہلکا کرنے میں کس قدر سعی کی ہے، جب تک آپ یہ معلوم نہ کرلیں۔ اس وقت تک مجھے قتل کرنا مناسب نہیں۔''

محمد بن قاسم نے داروغہ جیل کی یہ بات سن کر حکم دیا کہ جیل خانے سے مسلمان قیدیوں کو لایا جائے۔ مسلمان قیدی لائے گئے۔ محمد بن قاسم نے ان سے پوچھا: ''داروغہ جیل کا تمہارے ساتھ کیسا سلوک رہا ہے؟'' ان سب نے یک زبان ہو کر کہا: ہم داروغہ جیل کے شکر گزار ہیں کہ اس نے ہماری تسلی و تشفی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اس کا برتاؤ ہمارے ساتھ نہایت شریفانہ تھا۔ یہ ہمیں ہمیشہ یقین دلاتا تھا کہ گھبراؤ نہیں، وہ وقت قریب ہے جب اسلامی لشکر یہاں آئے گا اور تم اس مصیبت سے نجات حاصل کرو گے۔''

محمد بن قاسم کو جب یہ حالات معلوم ہوئے تو وہ داروغہ جیل کے ساتھ اچھی طرح پیش آئے، پھر انھوں نے اسلام کی دعوت دی۔ داروغہ جیل نے بخوشی اسلام قبول کرلیا۔ محمد بن قاسم نے اس حاکم کو جسے انھوں نے دیبل کی حکومت پر مقرر کیا تھا، داروغہ جیل کے سپرد کرتے ہوئے کہا کہ تمام معاملات میں داروغہ جیل سے مشورہ لے اور آمد و خرچ کے حسابات کی توثیق اس سے کروائے۔ پھر انھوں نے تمام مسلمان قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ دیبل کا سب سے بڑا افسر حمید بن وداع بحری کو مقرر کیا۔ شہر میں ایک خوبصورت مسجد تعمیر کروائی۔ یہ ہندوستان میں پہلی مسجد تھی جو تعمیر ہوئی۔

ان امور سے فارغ ہو کر محمد بن قاسم نے ان جنگوں میں جو مال غنیمت حاصل ہوا تھا، اس کا پانچواں حصہ خزانے میں داخل کیا اور حجاج کی طرف روانہ کر دیا۔ ارمن بیلہ کی فتح میں جو مالِ غنیمت ملا تھا، وہ فوجیوں کے درمیان ان کی قابلیت اور عہدے کے مطابق تقسیم کیا۔ گھڑ سوار کو شتر سوار اور پیادوں سے دگنا حصہ ملا۔

داہر کا خط

دیبل فتح ہونے کی خبر داہر کو پہنچ چکی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ دیبل کا حاکم شمنی فرار ہو کر نیرون کوٹ (موجودہ حیدر آباد) پہنچا ہے۔ اسے اسلامی فوجوں کی بہادری کی بھی اطلاع مل چکی تھی۔ اس نے اپنے بیٹے، جے سینہ کو ایک خط لکھا جو نیرون کا حاکم تھا۔ اسے حکم دیا کہ خط ملتے ہی وہ دریائے سندھ عبور کر برہمن آباد چلا جائے اور نیرون کی حکومت شمنی کے سپرد کر دے۔ اسے ہدایت دے کہ وہ قلعے کی حفاظت کرے اور اسے دشمن کے حملے سے بچائے۔ پھر اس نے ایک خط محمد بن قاسم کے نام لکھا:

''یہ خط داہر، چچ کے بیٹے کی طرف سے، جو سندھ کا بادشاہ اور ہندوستان کا راجا ہے۔ جس کا حکم دریا اور جنگل پر چلتا ہے، محمد بن قاسم کے نام ہے، جو انسانوں کے قتل کرنے میں حریص اور بے رحم ہے، جس نے بیوقوفی سے اپنے لشکر کو تباہی اور ہلاکت میں ڈال دیا ہے۔ تم سے پہلے بھی کچھ لوگوں کے دماغ میں یہ خبط سمایا تھا کہ وہ سندھ اور ہند کو فتح کریں، لیکن اسی شہر دیبل میں ہم نے ان کو بری طرح شکست دی۔ اب یہ سودا تمہارے دماغ میں سمایا ہے۔

دیبل کی فتح پر غرور نہیں کرنا چاہیے کیونکہ وہ ایک معمولی قصبہ ہے جہاں بیوپاری اور کاروباری لوگ آباد ہیں، جنہیں بیوپار اور کاروبار کے سوا جنگ سے کوئی واسطہ نہیں۔ نہ دیبل میں کوئی مضبوط قلعہ ہے اور نہ وہ ہماری فوجوں کا مرکز ہے۔ ان حالات میں شکست دینا کوئی بڑی بات نہیں۔ اگر وہاں

ہمارا ایک بھی بہادر سپہ سالار ہوتا تو تمہیں ناکوں چنے چبوا دیتا اور تمہارے لشکر میں سے ایک بھی زندہ نہ بچتا۔ اب تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ ایک قدم آگے نہ بڑھو۔

ابھی تمہارا میرے لڑکے جے سینہ سے واسطہ ہی نہیں پڑا کہ جس کے قہر سے بڑے بڑے بادشاہ پناہ مانگتے ہیں۔ ہندوستان کے بڑے بڑے راجا اس کے سامنے پیشانی رگڑتے ہیں جو کہ سندھ، مکران اور توران کے علاقوں پر حکومت کرتا ہے، جس کے پاس ایک سو مست ہاتھی ہیں اور خود سفید ہاتھی پر سوار ہوتا ہے، جس کا مقابلہ نہ گھوڑے کر سکتے ہیں اور نہ کوئی بڑے سے بڑا بہادر۔ غرور میں مست ہو کر تمہارا بھی وہی انجام ہوگا جو اس سے پہلے بدیل کا ہوا تھا۔''

محمد بن قاسم کا جواب

داہر کا یہ خط جب محمد بن قاسم کو ملا انھوں نے مترجم کو بلا کر کہا کہ وہ اس خط کا ترجمہ ان کو سنائے۔ مضمون سن کر محمد بن قاسم نے اس کا حسب ذیل جواب لکھوایا:

''یہ خط محمد بن قاسم ثقفی کی طرف سے ہے جو سرکشوں اور مغروروں سے مسلمانوں کا انتقام لینے والا ہے۔ کافر، جاہل، منکر اور ضدی داہر بن چچ برہمن غدار کے نام جو بے وفا زمانے کے ردوبدل اور ظالم وقت کے گھمنڈ پر مغرور ہے۔

اسے معلوم ہو کہ تم نے اپنی جہالت اور بیوقوفی سے جو کچھ لکھا ہے اور تم اپنی رکیک رائے پر جس طرح مغرور ہو، وہ پہنچا۔ تم نے جو کچھ لکھا ہے اس کے مضمون سے واقفیت حاصل ہوئی۔ طاقت، حشمت، ہتھیار، سامان، ہاتھیوں، سوار اور لشکر کے متعلق تم نے جو کچھ بھی لکھا ہے، مجھے وہ ہر ایک بات معلوم ہوئی اور میں نے اسے سمجھا۔ ہماری ساری قوت اور مدد کا مدار اللہ تعالیٰ کے کرم اور فضل پر ہے، (ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العظیم۔ فیکیدو انک کیدا ثم لا ینظرون انی توکلت علی اللہ ربی و ربکم و مکروا و مکر اللہ واللہ خیر الماکرین ولا یحیق المکر ایسی الا باھلہ۔ کم من فیئۃ قلیلۃ غلبۃ فئہ کثیرہ باذن اللہ واللہ مع الصابرین)۔ اے عاجز! سوار، ہاتھیوں اور لشکر پر کیا ناز کیا ہے؟ ہاتھی تو ایک ذلیل اور عاجز ترین چیز ہے، جو کہ مچھر جیسے ایک ضعیف جانور کو بھی اپنے جسم سے نہیں ہٹا سکتا اور تم جن گھوڑوں اور سواروں کو دیکھ کر حیران ہو گئے، وہ اللہ کے سپاہی ہیں (قولہ تعالیٰ) الا ان حزب اللہ ھم الغالبون و خیل اللہ و فرسانھا ھم المنصورون۔

تمہاری بداعمالیوں، بری عادتوں اور تکبر کی وجہ سے ہمیں تم پر لشکر کشی کا خیال پیدا ہوا، کیونکہ تم نے سراندیپ کی کشتیاں روک کر مسلمانوں کو قید کیا، حالانکہ دنیا کے تمام ممالک خلیفہ کی برتری اور حکومت تسلیم کرتے ہیں جو نبوت کا نائب ہے۔ صرف تم ہی سرکشی اور عناد اختیار کیے ہوئے ہو اور بیت المال کے خزانے کا وہ مال (خراج) جو کہ تم سے پہلے کے بادشاہ اور حاکم خود پر لازم اور واجب سمجھ کر ادا کرتے رہے ہیں، وہ بھی تم نے روک لیا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ میرا اور تمہارا مقابلہ جہاں کہیں بھی ہوگا، میں اللہ تعالیٰ کی مدد سے جو ظالموں کو مغلوب کرنے والا ہے، میں تمہیں مغلوب اور ذلیل کروں گا اور تمہارا سر کاٹ کر عراق بھجوا دوں گا یا اپنی جان اللہ کی راہ میں قربان کروں گا۔ یہ جہاد اللہ تعالیٰ کے حکم سے جاھد الکفار و المنافقین کے مطابق میں نے خود پر واجب کیا ہے اور اس کے احسان کا امیدوار ہوں کہ ہمیں فتح اور کامیابی عطا فرمائے، ۹۳ھ''۔

نیرون کی طرف روانگی

دیبل کی فتح اور انتظام سے فارغ ہو کر محمد بن قاسم نیرون (موجودہ حیدر آباد) کی طرف روانہ ہوئے۔ منجنیقیں اور دوسرا فوجی سامان کشتیوں میں ڈال کر ساکرہ نالے کے راستے سے نیرون روانہ کیا گیا اور خود اپنی فوج کے ساتھ خشکی کے راستے روانہ ہوئے۔ جب سیسم کے مقام پہ پہنچے تو انھیں حجاج بن یوسف کا ایک خط ملا، جس میں لکھا تھا:

''حجاج بن یوسف کی طرف سے محمد بن قاسم کی جانب:

جاننا چاہیے کہ ہمارے دلی ارادوں اور ہمت کا تقاضا یہ ہے کہ تمھیں ہر حال میں کامیابی حاصل ہو اور ان شاء اللہ تم کامیاب اور فتح مند ہو گے اور اللہ عزوجل کے احسان سے دشمن دنیا کی سزا اور عاقبت کے عذاب میں ہمیشہ گرفتار اور مغلوب رہے گا۔

تمھیں ہرگز یہ خیال بھول کر بھی دل میں نہ لانا چاہیے کہ تمام ہاتھی، گھوڑے، دولت اور دشمنوں کا تمام مال و اسباب تمہاری ملکیت ہو جائے گا۔ بلکہ تم اپنے رفیقوں کے ساتھ ایک پُرمسرت زندگی بسر کرو اور ہر ایک کے ساتھ احترام اور حسن سلوک کے ساتھ پیش آؤ اور انھیں یقین دلاؤ کہ یہ ملک تمہارا ملک ہوگا۔

جب تم کوئی قلعہ فتح کرو اور اس میں سے لشکر کی ضروریات کی جو چیز بھی تمہارے ہاتھ آئے، وہ لشکر پر خرچ کرو اور فوجی تیاری میں صرف کرو، کھانے پینے کی چیزوں میں کسی کو روک ٹوک نہ کرو۔ اشیاء کی قیمتوں کی شرح مقرر کرو، تاکہ تمہارے کیمپ میں غلہ سستا ملے۔ جو کچھ دیبل میں رہ گیا ہے، وہ فوجوں کی رسد کی فراہمی پر خرچ کرو، بجائے اس کے کہ وہ دیبل میں ذخیرے کی صورت پڑا رہے۔ جب تم ملک فتح کر چکو اور قلعوں کو مضبوط کرا لو تو اس کی کوشش کرو کہ وہاں کے لوگ مطمئن زندگی بسر کریں۔ مفتوحہ علاقے کے لوگوں کی دل جوئی کرو، تاکہ کسان، پیشہ ور، تاجر مرفہ الحال اور آسودہ ہوں اور ملک سرسبز و شاداب رہے۔ ۲۰ رجب ۹۳ھ"۔

نماز استسقا

سیسم سے محمد بن قاسم نیرون کوٹ کی طرف بڑھے، جو دیبل سے پچیس فرلانگ پر ہے۔ ساتویں دن نیرون کوٹ کے بارہ بروری کے میدان میں ایک سبزہ زار ہے جسے بلہار کہتے ہیں، وہاں منزل انداز ہوئے۔ گرمی کا موسم تھا اور پانی کا میلوں پتا نہ تھا۔ لشکر کو پانی کی سخت تکلیف تھی۔ پانی کی تکلیف دیکھ کر محمد بن قاسم نے حکم دیا کہ نماز استسقا ادا کی جائے۔

سب نے مل کر نماز استسقا ادا کی اور نہایت ہی گڑگڑا کر دعائیں مانگیں۔ محمد بن قاسم نے نماز استسقا کی نماز کے بعد جن الفاظ میں دعا مانگی تھی وہ یہ تھے:

"اے گمراہوں اور پریشانوں کے رہبر، اے فریاد کرنے والوں کی فریاد سننے والے، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے وسیلے سے میری دعا کو سن"۔

اللہ نے مجاہدین کی دعاؤں کو قبول فرمایا۔ چند دن بعد خوب بارش ہوئی اور ہر طرف جل تھل ہو گیا۔

نیرون کی فتح

بلہار سے روانہ ہو کر محمد بن قاسم نیرون پہنچے۔ وہاں کا حاکم بدھ مذہب پر عمل پیرا تھا۔ تب وہ راجا داہر کے پاس گیا ہوا تھا۔ شہر والوں نے جب محمد بن قاسم کی آمد کی خبر سنی، شہر کے دروازے بند کر کے بیٹھ گئے۔ پانچ چھ روز بعد شمنی حاکم نیرون واپس آیا۔ اس نے فوراً شہر کے دروازے کھلوائے اور نہایت شاندار طریقے پر محمد بن قاسم کا استقبال کر کے ان کو شہر میں لایا۔ بیش قیمت تحائف پیش کیے، فوج کی مہمان داری کا پورا پورا انتظام کیا اور محمد بن قاسم کو یقین دلایا کہ اہل نیرون مسلمانوں کے سچے وفادار ہیں۔ محمد بن قاسم نے بھی نیرون کے حاکم کو انعام و اکرام سے نوازا۔ غرض نیرون بغیر کسی جنگ کے فتح ہو گیا۔

نیرون میں محمد بن قاسم نے ایک مسجد تعمیر کروائی اور مسجد کے لیے امام و موذن مقرر کر کے حکم دیا کہ پانچوں وقت اذان اور باجماعت نماز ادا کی جائے۔ اس کے بعد محمد بن قاسم نے ذہلی بصری کو نیرون کا کوتوال مقرر کیا۔ ان انتظامات سے فارغ ہو کر محمد بن قاسم نے سیوستان کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ نیرون کے حاکم کو ساتھ لے کر وہ سیوستان روانہ ہوئے (سیوستان کو آج کل سہون شریف کہتے ہیں)۔

سیوستان کی فتح

نیرون سے روانہ ہو کر محمد بن قاسم موج پہنچے۔ یہ مقام

نیرون سے نوے میل کے فاصلے پر تھا۔ یہاں کے لوگ بدھ مذہب کے پیرو تھے۔ اس وقت یہ مقام سیوستان کے پایہ تخت تھا۔ سیوستان کا حاکم بجھرائے (بجے رائے) نامی راجا داہر کا بھتیجا تھا۔ جیسے ہی محمد بن قاسم موج پہنچے۔ موج کے حاکم نے شہر کے لوگوں کو بلا کر مشورہ کیا کہ اب کیا صورت اختیار کرنی چاہیے؟ سب نے مل کر طے کیا کہ ہمیں سیوستان کے حاکم کے پاس لکھ کر بھیجنا چاہیے "آپ کو معلوم ہے کہ ہم بدھ مذہب کے ماننے والے ہیں۔ ہمارے مذہب میں خون کا بہانا حرام ہے اور یوں بھی آپ تو ایک محفوظ مقام پر اور ہم غیر محفوظ جگہ پر ہیں۔ ہمیں خوف ہے کہ اگر مسلمانوں سے ہماری لڑائی شروع ہو گئی تو ہمیں سخت نقصان پہنچے گا۔ ہم نے مسلمانوں کے متعلق یہ سنا ہے کہ جو ان سے امن چاہتا ہے وہ اس کو نہیں لوٹتے اور اپنے وعدے کے نہایت پابند ہیں۔ اپنے مفتوحہ شہروں کی حفاظت کرتے ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں اور ہمارا مشورہ قبول کریں تو آپ کے اور اپنے لیے ان سے امن کے طالب ہوں؟" موج کے شہریوں کا یہ محضر حاکم موج نے حاکم سیوستان کے پاس بھجوایا مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ آخرکار موج کے باشندوں نے صلح کر لی اور اسلامی فوج سے نبرد آزما نہیں ہوئے۔

محمد بن قاسم موج سے روانہ ہو کر سیوستان پہنچے سہون کے لوگوں نے جیسے ہی محمد بن قاسم کی آمد کی خبر سنی، فوراً قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ اس لیے کہ اس آبادی کا کثیر حصہ بدھ مذہب کا پیرو تھا جو جنگ کو ناپسند کرتا تھا۔ محمد بن قاسم نے حالات معلوم کرنے کے لیے اپنے جاسوس روانہ کیے، جنہوں نے واپس آ کر اطلاع دی کہ شہر کے لوگ تو لڑنے کے لیے تیار نہیں، البتہ فوجی آمادہ جنگ ہیں۔ محمد بن قاسم نے قلعہ کا محاصرہ کر کے منجنیقوں سے سنگ باری شروع کی۔ سنگ باری سے قلعے کے اندر کے لوگ گھبرا اٹھے اور بجھرائے حاکم سیوستان سے کہا ہم مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے، اس لیے جنگ موقوف کی جائے، لیکن وہ نہ مانا۔ آخر شہریوں نے محمد بن قاسم سے کہلا بھیجا: "ہم لوگ غریب کسان، بیوپاری، کاریگر اور دوسرے پیشہ ور ہیں۔ ہمیں لڑائی سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم لوگ حاکم شہر بجھرائے سے متنفر ہیں۔ اس کے علاوہ آپ یقین کر لیجیے کہ اس کے پاس اتنی فوج نہیں جو آپ کا مقابلہ کر سکے۔ مسلمانوں کو جب یہ معلوم ہوا تو انھوں نے جنگ کو اور تیز کر دیا۔ محمد بن قاسم نے ایک ہفتے تک مسلسل شب و روز جنگ جاری رکھی یہاں تک کہ سہون کی فوج ہمت ہار بیٹھی اور لڑائی سے جان چرانے لگی۔ رائے بجھرائے نے جب یہ رنگ دیکھا تو سمجھ گیا کہ اب جنگ فضول ہے۔ وہ رات کے اندھیرے میں قلعے کے شمالی دروازے سے نکل کر فرار ہو گیا اور دریائے سندھ کو عبور کر کے علاقہ بدھیہ میں پہنچا۔ اس زمانے میں علاقہ بدھیہ کا حاکم کاکا بن کوتل بھی بدھ مذہب کا پیرو تھا۔

رائے بجھرائے کے بھاگ جانے پر سہون کے شہریوں نے اطاعت قبول کر لی اور مسلمانوں نے قلعہ فتح کر لیا۔ محمد بن قاسم نے کچھ دن سہون میں قیام کر کے آرام کیا اور ساتھ ہی ساتھ وہاں کے نظم و نسق کو درست کیا اور جا بجا نئے حاکم مقرر کیے اور سیوستان کی فتح کی اطلاع حجاج کو بھیجی۔ سیسم کے متعلق وثوق کے ساتھ صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ منچھر جھیل کے کنارے پر واقع تھا۔ منچھر جھیل اس زمانے میں کنبھ کہلاتی تھی، اس لیے اسے کنبھ نہر (جھیل والی نہر) کہا جاتا ہے۔

نماز کا اثر

اس زمانے میں جب کہ محمد بن قاسم سہون میں تھے، چنہ قوم نے، جو سہون (سیوستان) کے قرب و جوار میں آباد تھی، اپنا ایک جاسوس حالات معلوم کرنے کے لیے اسلامی لشکر میں بھیجا۔ اتفاق سے جب یہ جاسوس محمد بن قاسم کے فوجی کیمپ میں پہنچا، نماز کا وقت تھا۔ اس نے دیکھا کہ اذان ہوئی اور ساتھ ہی سارا لشکر نماز کے لیے جمع ہو گیا۔ سب نے وضو کیا۔ تھوڑی دیر بعد جماعت کھڑی ہوئی۔ محمد بن قاسم نے امامت

کی۔ سب نے مل کر ان کے پیچھے نماز پڑھی۔ پھر اس نے یہ بھی دیکھا کہ نماز کے ارکان ادا کرنے میں سب اپنے امام کی پیروی کرتے ہیں اور اس کے اتباع میں ذرا بھی فرق نہیں ہونے دیتے۔ جاسوس یہ نظم و ضبط دیکھ کر بے حد متاثر ہوا۔ اس نے واپس جا کر اپنی قوم سے ساری کیفیت بیان کی اور کہا: ''میں نے ان لوگوں میں جو اتفاق و اتحاد دیکھا ہے، مجھے یقین ہے کہ ان پر کوئی فتح نہیں پا سکتا۔'' چنہ قوم کے لوگوں نے جب یہ سنا تو وہ بیش قیمت تحائف لے کر محمد بن قاسم کے پاس حاضر ہوئے۔ جب یہ لوگ پہنچے، کھانے کا وقت تھا۔ دسترخوان بچھایا جا رہا تھا۔ ان لوگوں نے نہایت عقیدت و محبت سے اپنے تحائف محمد بن قاسم کے سامنے پیش کیے اور بخوشی اسلام قبول کر لیا۔ محمد بن قاسم نے ان کو دیکھ کر کہا: ''یہ قوم تو مرزوق ہے، یعنی اللہ ان کے رزق میں برکت عطا فرمائے گا۔'' اسی وقت چنہ قوم کا نام مرزوق بھی مشہور ہو گیا۔

سیسم کی فتح

سیوستان فتح کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے رائے بجھرائے کا تعاقب کرنے کے لیے سیسم کا رخ کیا۔ اوپر گزر چکا ہے کہ حاکم سیوستان بجھرائے نے اسی شہر میں پناہ لی تھی۔ وہ سب سے پہلے علاقہ بندھان پہنچے۔ وہاں کے لوگوں نے جو سب کفار تھے، متفق ہو کر ارادہ کیا وہ لشکر اسلام پر شب خون ماریں۔ چنانچہ آپس میں مشورے کے بعد انھوں نے اپنے سمجھدار لوگوں کو کاکا بن کوتل کے پاس بھیجا اور اطلاع دی کہ ہمارا ارادہ ہے کہ مسلمانوں پر شب خون ماریں۔ کاکا بن کوتل عقل مند اور حالات زمانہ سے واقف تھا۔ اس نے پہلے تو ان کی اس تدبیر کی تعریف کی اور انھیں ہمت دلائی۔ پھر کہا: ''لیکن میرا خیال ہے کہ سندھی مسلمانوں کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ پھر بھی میں تمہارے ساتھ ایک مسلح فوجی دستہ کر دیتا ہوں۔ چنانچہ اس نے ایک ہزار نو جوانوں کا فوجی دستہ جو چنہ قوم کے لوگوں پر مشتمل تھا اور جو ہر طرح کے ہتھیاروں سے مسلح تھا، بہمن نامی ایک مکھیا کے ساتھ روانہ کیا۔

جب یہ لوگ کاکا سے رخصت ہو کر شب خون کے لیے روانہ ہوئے تو مسلمانوں کے لشکر کے قریب پہنچ کر راستہ بھٹک گئے اور صبح تک حیران و سرگرداں پھرتے رہے۔ جب صبح ہوئی تو انھوں نے خود کو قلعہ سیسم کے قریب کھڑا پایا۔ کاکا کے پاس پہنچ کر اپنی داستان سنائی۔ کاکا نے سمجھ لیا کہ تقدیر اس کا ساتھ نہیں دے رہی، وہ فوراً اپنے سرداروں اور عمائدین حکومت کو لے کر اسلامی لشکر میں آیا۔ ادھر محمد بن قاسم نے بھی نباتہ بن حنظلہ نامی ایک شخص کو دریافت حالات کے لیے سیسم روانہ کیا۔ کاکا، نباتہ بن حنظلہ کو راستے میں ملا، کاکا نے شب خون کے تمام حالات بیان کیے جن کی بنا پر اس نے سمجھ لیا کہ تقدیر الٰہی یہی ہے کہ مسلمان اس ملک کو فتح کریں، اس لیے وہ اطاعت قبول کرنے کے لیے محمد بن قاسم کے پاس جا رہا تھا۔ نباتہ بن حنظلہ، کاکا کو اپنے ساتھ لے کر محمد بن قاسم کے پاس حاضر ہوا۔ کاکا نے محمد بن قاسم کو اپنی اطاعت و وفاداری کا یقین دلایا۔ محمد بن قاسم بھی اس کے ساتھ نہایت عزت و احترام سے پیش آئے، جس سے دونوں میں یگانگت و خلوص کا ربط پیدا ہوا اور محمد بن قاسم کو کاکا کے مشوروں سے دیگر شہر فتح کرنے میں بڑی مدد ملی۔

کاکا کی سرفرازی

محمد بن قاسم نے کاکا سے پوچھا: ''جب تمہارے ملک میں کسی کی عزت افزائی کی جاتی ہے تو کیا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے؟'' کاکا نے کہا ''ہمارا امتیازی نشان کرسی اور خلعت ریشمی کپڑا ہے، جو ہم سر پر پگڑی کی طرح لپیٹ لیتے ہیں، یہی ہمارے سرداروں کا شاندار لباس ہے۔'' محمد بن قاسم نے کاکا کو اس ملک کے دستور کے مطابق خلعت اور کرسی سے نوازا۔ خلعت سے سرفرازی کے بعد اس کے ساتھی بہت خوش ہوئے اور ان کے دلوں میں مسلمانوں سے خیر سگالی کا جذبہ پیدا ہوا۔ کاکا نے ان کے جذبہ خیر سگالی کو محسوس کر کے انھیں امان

دلائی۔ جو لوگ اس کے بعد بھی مخالف رہے۔ کاکا نے ان کے متعلق مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ انھیں سزا دی جائے۔ محمد بن قاسم نے عبدالملک بن قیس دسی کو اپنا نمائندہ مقرر کیا تاکہ وہ کاکا کے ساتھ مل کر سرکشوں کو اپنا مطیع کرے اور باغیوں کو سزا دے۔ کاکا نے بھی دل سے مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ اس نے مسلمانوں کے دشمنوں پر یلغار کر کے سونا، چاندی، کپڑے، جانور، غلہ اور بہت سا مال غنیمت حاصل کیا، جس سے اسلامی لشکر میں ہر چیز کی افراط ہو گئی۔ محمد بن قاسم وہاں سے روانہ ہو کر سیسم کے قلعے پر پہنچے۔ قلعہ سیسم پر دو روز تک سخت خون ریز جنگ ہوئی، جس میں رائے بجھرائے (بن چندر) حاکم سیوستان اور اس کے سردار مارے گئے اور اس کے بعض ساتھی بھلطور کی طرف جان بچا کر بھاگ گئے جو سالوج اور قندابیل کے درمیان تھا۔ ان لوگوں نے وہاں سے ایک معافی کی درخواست محمد بن قاسم کی خدمت میں روانہ کی۔ یہ لوگ راجا داہر کے مخالف تھے، کیونکہ اس نے ان کے بعض آدمیوں کو قتل کر دیا تھا اس لیے یہ راجا داہر کے پاس جانا نہ چاہتے تھے۔ محمد بن قاسم نے ان کو معافی دی۔ ان لوگوں نے ایک ہزار روپے درہم سالانہ بطور خراج دینا قبول کیا۔

سیسم کی فتح کے بعد مغربی سندھ کے سارے علاقے پر محمد بن قاسم کا قبضہ ہو گیا، مغربی سندھ کے تمام سردار محمد بن قاسم کے حسن اخلاق اور بلندیٔ کردار سے بے حد متاثر تھے، محمد بن قاسم کے حسن سلوک کی وجہ سے یہ بات ان کے قلب میں نقش ہو گئی کہ مسلمانوں کی حکومت ان کے لیے اللہ کی رحمت ہے۔

حجاج بن یوسف کا خط

محمد بن قاسم ابھی سیسم ہی میں تھے کہ انھیں حجاج بن یوسف کا خط ملا، جس میں اس نے لکھا تھا ''اب تم آگے بڑھنے کا خیال چھوڑ کر نیرون لوٹ جاؤ اور دریائے سندھ عبور کر کے داہر سے مقابلہ کرو۔ ساتھ ہی ساتھ ہر وقت اللہ سے دعا کرتے رہو کہ اللہ تعالیٰ تم کو نصرت و کامیابی عطا فرمائے۔ میرا خیال ہے کہ جب تم داہر کے مقابلے میں فتح حاصل کر لو گے تو پھر بقیہ ملک کے فتح کرنے میں کوئی جھگڑا باقی نہ رہے گا۔''

محمد بن قاسم کا جواب

محمد بن قاسم اس خط کے ملنے کے بعد نیرون واپس لوٹ گئے۔ وہ نیرون کی ایک پہاڑی پر ٹھہرے جس کے ارد گرد سبزہ تھا اور پانی وافر تھا۔ وہیں سے انھوں نے ایک خط حجاج بن یوسف کو لکھا جس کا مضمون یہ تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''خادم محمد بن قاسم کی طرف سے بعد سلام کے عرض ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے آپ کا یہ مخلص تمام امیروں، خادموں، غلاموں، مسلمان فوجوں اور لشکر کے ساتھ بخیریت ہے اور ہر بات بہتر طریقے پر انجام پا رہی ہے۔ سب لوگ خوش ہیں۔

جناب والا کو معلوم ہو کہ ہم جنگلوں اور خطرناک راستوں کو طے کر کے سندھ کے علاقے میں پہنچے۔ اب ہم دریائے سندھ کے کنارے پر ہیں، جس کو مہران کہتے ہیں، لیکن یہ داہر کا قلعہ مملکت اروڑ کی حدود میں ہے۔ وہ ابھی تک راجا داہر کے قبضے میں ہے۔ جو لوگ سرکش ثابت ہوئے ان کو قابو میں لایا گیا ہے اور باقی ڈر کر بھاگ گئے۔ نیرون کا قلعہ بھی جو راجا داہر کی راجدھانی الور کے تحت تھا، وہ بھی ہمارے قبضے میں آ چکا ہے۔ سیسم اور سیوستان کا قلعہ بھی اللہ کے فضل و کرم سے ہمارے قبضے میں ہے۔ یہاں سے داہر کے چچا زاد بھائی کو مع چند بہادروں کے نکال دیا گیا ہے۔ امید ہے اسی طرح کافروں کے تمام قلعے ہمارے قبضے میں آ جائیں گے۔ ہر جگہ مسجدیں بنا دی گئی ہیں، تاکہ پانچوں وقت نماز اور عبادت ہوتی رہے، چنانچہ ان مسجدوں میں اذان، نماز اور خطبے اپنے وقت پر ہوتے ہیں۔

جناب والا کے ارشاد کے مطابق ہم نیرون لوٹ آئے ہیں، فی الحال ہم نے ایک قلعے کے قریب ڈیرے ڈال دیے ہیں۔ یہ قلعہ سکندر کی مضبوط دیوار سے بھی زیادہ اونچا ہے۔ ہم طاقت اور پناہ کے لیے ہر وقت اللہ پر بھروسا رکھتے ہیں۔"

راجا داہر کی تیاریاں

محمد بن قاسم دریائے سندھ عبور کرنے کی فکر میں تھے کہ داہر کو معلوم ہوا، اس کے حاکم بغاوت کر کے مسلمانوں کے ساتھ ملتے جا رہے ہیں۔ داہر کو نہایت غصہ آیا اور اس نے ایک لشکر جرار مسلمانوں کے مقابلے کے لیے بھیج دیا جو دریائے سندھ عبور کر کے مسلمانوں کے مقابل ہوا۔ مسلمانوں نے بھی اس لشکر کا نہایت بہادری سے مقابلہ کیا اور داہر کے لشکر کے دانت کھٹے کر دیے، یہاں تک کہ داہر کا لشکر شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔

مولانا اسلامی کی سفارت

محمد بن قاسم نے مناسب سمجھا کہ اس سے قبل کہ لڑائی شروع کی جائے، ایک سفارت راجا داہر کے پاس روانہ کی جائے تاکہ وہ اس سے بات چیت کرے، ممکن ہے کہ اس گفتگو سے کوئی بہتر نتیجہ نکل سکے۔ اس بات چیت کے لیے انھوں نے شام کے ملک کے ایک صاحب کو جو شامی کہلاتے تھے اور مولانا اسلامی کو جو دیبل کے رہنے والے تھے، جنہوں نے محمد بن قاسم کے ہاتھ پر اسلام قبول کر کے مولانا اسلامی کا خطاب پایا تھا، راجا داہر کے دربار میں بھیجا۔ جب مولانا اسلامی اور شامی دونوں راجا داہر کے دربار میں پہنچے تو داہر کے دربار کے رواج کے مطابق ان دونوں نے اس کے سامنے سر جھکایا اور نہ سجدہ کیا۔ راجا داہر کو اس پر بہت غصہ آیا، اس نے مولانا اسلامی سے کہا: "جنہیں وہ پہلے سے بھی اچھی طرح سے جانتا تھا کہ تم شاہی آداب کیوں نہیں بجالائے، کیا تم کو اس سے روک دیا گیا ہے؟" مولانا اسلامی نے جواب دیا "اللہ کے فضل سے میں مسلمان ہو چکا ہوں۔ جب تک میں آپ کے طریقے پر تھا اور آپ کی رعایا میں تھا، میں آپ کے دربار کے آداب بجالانا ضروری سمجھتا تھا۔ اب میں مسلمان ہوں۔ ہم مسلمان سوائے اللہ کے کسی کے سامنے سر جھکانا جائز نہیں سمجھتے۔" داہر کو یہ سن کر اور بھی غصہ آیا۔ اس نے کہا: "اگر تم ایلچی بن کر نہ آئے ہوتے تو میں تم کو ضرور قتل کروا دیتا۔" مولانا اسلامی نے کہا میرے قتل سے عربوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا لیکن خوب اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ میرے خون کا بدلہ مسلمان اس طرح لیں گے کہ جس کا اندازہ آپ نہیں کر سکتے۔ داہر نے کہا: "کہو تم کیا پیغام لے کر آئے ہو؟ قاصد کا کام یہی ہوتا ہے کہ وہ اس پیغام کو پہنچا دے، جس کو وہ لے کر آیا ہے۔"

شامی نے کہا: "تمہیں دو باتوں میں سے ایک بات اختیار کرنی چاہیے یا تو تم دریا عبور کر کے ہمارے پاس آؤ۔ اس صورت میں تمہارے لیے راستہ چھوڑ دیا جائے گا اور تمہیں روکا نہیں جائے گا، یا پھر ہمارے لیے راستہ چھوڑ دو تاکہ مسلمان فوج دریا کو عبور کر کے تمہارا مقابلہ کرے۔"

داہر کا مشورہ

داہر نے یہ سن کر اپنے وزیر سیاکر سے مشورہ کیا اور پوچھا "ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" وزیر نے کہا "حضور میری رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کو دریا کے اس پار آنے دیا جائے، کیونکہ دریا کے اس طرف تمام علاقہ ہمارا ہے۔ جب وہ ہمارے علاقے میں آ جائیں گے تو دریائے سندھ ان کے پیچھے ہوگا۔ جب ہماری فوجوں سے ان کا مقابلہ ہوگا تو غلہ اور ہتھیار سب ہمارے پاس موجود ہیں اور دریا کے اس طرف سے مسلمانوں کو کوئی مدد نہیں مل سکتی، اس طرح ہماری فتح یقینی ہے۔"

علافی سردار سے مشورہ

راجا داہر نے اپنے وزیر سیاکر سے مشورے کے بعد

خاندان علافی کے سردار کو بلایا جو اسلامی حکومت کا باغی تھا اور راجا داہر کے یہاں پناہ لیے ہوئے تھا۔ داہر نے علافی سردار کو ساری بات بتاتے ہوئے اپنے وزیر کی رائے بھی بتائی، پھر پوچھا کہ اب تم مجھے بتاؤ کہ کیا کرنا چاہیے۔ علافی سردار نے کہا "حضور میرے خیال میں آپ کے وزیر کی رائے صحیح نہیں، کیونکہ وہ مسلمانوں کی عادات و طبائع سے واقف نہیں۔ اول تو محمد بن قاسم بڑی فوج لے کر آیا ہے، جس میں بڑے بڑے بہادر اور جواں مرد ہیں۔ دوسرے یہ کہ مسلمان جب لڑائی کے لیے نکلتے ہیں تو وہ سر ہتھیلی پر رکھ کر نکلتے ہیں۔ ان کا بھروسا صرف اللہ پر ہوتا ہے اور وہ ہر وقت خدا سے دعا کرتے ہیں کہ الٰہی! ہم تیرے بندے ہیں، تیرے دین کے پھیلانے کی خاطر لڑائی کے میدان میں آئے ہیں۔ الٰہی ہمیں اس لڑائی میں شہادت اس وقت عطا فرما جب کہ ہم اپنے سے دوگنوں کو مار لیں۔ جب یہ لوگ دشمن کے مقابلے میں آتے ہیں تو اس قدر بہادر ہوتے ہیں کہ لڑائی سے منہ پھیرنا نہیں جانتے۔ تاوقتیکہ وہ اپنے دشمن کو پسپا نہ کر دیں۔ میری رائے میں انھیں دریا کے اس پار ہی رہنے دیجیے اور کشتی کے ملاحوں، جتوں اور علاقے کے دوسرے لوگوں کو حکم دیجیے کہ وہ غلہ، لکڑی اور دوسری کھانے پینے کی چیزیں ان کے لشکر میں نہ پہنچائیں اور ان پر معیشت کو تنگ کریں۔ شاید اس تدبیر سے کوئی بہتر صورت نکل آئے۔"

داہر کا جواب

داہر نے اپنے عمایدین سے مشورہ کرنے کے بعد محمد بن قاسم کے قاصدوں کو جواب دیا کہ تم جا کر محمد بن قاسم سے کہہ دو "مجھے تمہاری کوئی بات منظور نہیں۔ میرا اور تمہارا فیصلہ تلوار ہی سے ہوگا۔ دریا کے پار کرنے میں تم کو اختیار ہے۔ اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا خواہ تم آؤ یا ہم۔ ہم ہر وقت لڑائی کے لیے تیار ہیں۔"

اراکین وفد یہ جواب لے کر واپس پلٹ گئے اور سارا واقعہ محمد بن قاسم سے بیان کیا۔ ادھر داہر نے بھی فوجی تیاری شروع کر دی اور اس نے دریائے سندھ کے قریب اپنی فوجیں جمع کیں۔ ادھر محمد بن قاسم کوچ کر کے دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر راوڑ کے قلعے کے مقابل خیمہ زن ہوئے اور حجاج کے حکم کا انتظار کرنے لگے۔ ●●●

(جاری ہے)

جھوٹ جو سچ سمجھ لیے گئے

دنیا بھر میں سینہ بہ سینہ پھیلے توہمات کا پوسٹ مارٹم

محمد خلیل چودھری

دنیا میں بہت سی باتوں کو بالاتفاق سب نے صحیح تسلیم کرلیا ہے حالانکہ حقیقت میں ان کی کوئی اصلیت نہیں۔ لطف یہ کہ اگر آپ ان کو غلط بتائیں تو دُنیا والے آپ کو جاہل سمجھنے لگتے ہیں۔ بعض مثالیں ملاحظہ فرمائیے جن کی رُو سے مشہور عام سچ دراصل جھوٹ ہیں۔

① عام طور پر ہر شخص سمجھتا اور پورے یقین کے ساتھ سمجھتا ہے کہ ''چھونے اور سننے'' کا احساس اندھے میں بہت قوی ہو جاتا ہے۔ اس کی بینائی کی قوت دوسری طرف صرف ہونے لگتی ہے لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ سرفرانسیس گالٹن نے جو علم وراثت کے ماہر ہیں، اندھوں کے مدرسے میں طویل تجربے اور تحقیقات کے بعد اس خیال کو غلط ثابت کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ اندھوں میں چھونے یا سننے کی حس آنکھ والوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔

علاوہ سرفرانسیس کے دوسرے ماہرین نے بھی اس کی تحقیق کی ہے۔ وہ سب متفقہ طور پر اس خیال کی تردید کرتے ہیں۔ بلکہ ان کا کہنا تو یہ ہے کہ اندھوں کے دوسرے احساسات بھی کم ہو جاتے ہیں کیوں کہ اندھے پن سے جو اضطراب اعصاب میں پیدا ہوتا ہے، اس کا اثر دوسرے حواس پر بھی پڑتا ہے۔

② یہ بات بھی مشہور ہے کہ بجلی کی روشنی آنکھوں کے لیے نقصان دہ ہے لیکن اس کی کوئی دلیل موجود نہیں۔ بجلی کی روشنی یقیناً آفتاب کی روشنی کی طرح تیز نہیں۔ اس لیے اگر آفتاب کی روشنی آنکھوں کے لیے مضر نہیں تو بجلی کی روشنی

یقیناً نقصان دہ نہیں ہوسکتی البتہ روشنی کی طرف مسلسل دیکھتے رہنا بے شک نقصان کی بات ہے۔ سو اس معاملے میں بجلی اور آفتاب دونوں یکساں ہیں۔

③ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ جس کو کتا کاٹ لے وہ پانی سے ڈرنے لگتا ہے۔ اسی لیے وہ تالاب یا دریا کے پاس نہیں جاتا حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ ایسے مریض پر اکثر اعصابی تشنج کے دورے پڑتے ہیں۔ اسی تشنج کی وجہ سے پانی پیتے ہوئے ڈرتا ہے۔ ورنہ پانی سے اس کو ڈر نہیں لگتا۔

④ درندوں کو سدھانے والوں کے متعلق خیال ہے کہ یہ ان کی کسی مقناطیسی قوت کا نتیجہ ہے جو سدھانے والوں کی نگاہ میں پائی جاتی ہے اور جس وقت یہ قوت کم ہو جاتی ہے تو ان کے واسطے حیوان کی اطاعت بھی ختم ہو جاتی ہے لیکن یہ خیال بھی غلط ہے۔

دراصل جانور ڈرتا ہے مارسے اور شروع سے اس کو مار مار کر اتنا ڈرا دیا جاتا ہے کہ وہ سدھانے والے کے ہر اشارے پر چلنے لگتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر اس کے خلاف گیا تو سخت سزا برداشت کرنا پڑے گی۔ اس میں سدھانے والے کی مقناطیسی قوت کا کوئی دخل نہیں۔

⑤ لوگوں کو یقین ہے کہ جب کوئی شخص کسی بلند جگہ سے گرے، تو زمین تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کا دم نکل جاتا ہے کیونکہ گرنے کی تیزی اس کو سانس لینے کا موقع نہیں دیتی لیکن اس بات کی بھی کوئی اصلیت نہیں۔ واقعات اور تجربات بتاتے ہیں کہ لوگ بڑے بڑے بلند مقامات سے گرنے کے بعد بھی زندہ رہے ایک شخص غبارے سے گرا جو ۲۰۰۰ فٹ کی بلندی پر اڑ رہا تھا لیکن زمین پر آنے سے پہلے ہی اس نے چھتری کھول لی اور آہستگی سے اترنے لگا۔ اب ہوائی جہازوں سے عام طور پر لوگ نیچے کودتے اور نہایت تیزی کے ساتھ نیچے آتے ہیں لیکن کسی کو ضرر نہیں پہنچتا۔

گرنے کی تیزی کی وجہ سے سانس نہ لے سکنے کا خیال بھی غلط ہے۔ انسان بلندی سے جب گرتا ہے تو اس کی رفتار سو فٹ فی سیکنڈ ہوتی ہے۔ یہ ثابت ہے کہ انسان ایک منٹ تک آسانی سے اپنا سانس روک سکتا ہے۔ چہ جائیکہ دس بارہ سیکنڈ! بہرحال گرنے کی حالت میں سانس رکنے یا نہ لے سکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

⑥ مشہور ہے کہ سانپ جب کاٹتا ہے تو اس کی دم کا ایک حصہ جھڑ جاتا ہے چنانچہ اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ بُدا (دم جھڑا ہوا) سانپ بڑا ظالم ہوتا ہے کیونکہ یہ علامت ہے، اس بات کی کہ وہ بہت سے آدمیوں کو کاٹ چکا۔

یہ عقیدہ بھی بالکل بے بنیاد ہے کہ بعض سانپوں کی ایسی اقسام ہیں جن کی دم جھڑتی اور پھر نئی نکلتی ہے۔ البتہ جب وہ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو نشوونما کی قوت ضعیف ہونے کی وجہ سے دم جھڑنے کے بعد مشکل سے نکلتی ہے یا نکلتی ہی نہیں۔ اس کا تعلق کاٹنے یا نہ کاٹنے سے بالکل نہیں ہے۔

⑦ مشہور ہے کہ اگر سانپ کو مارو تو سورج ڈوبنے تک اس کی روح نہیں نکلتی۔ اس بات کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ سانپ کے جسم میں اور دیگر جانوروں کی طرح مرنے کے بعد بھی حرارت عرصہ تک باقی رہتی ہے اور اس کا جسم پھڑکتا رہتا ہے، چنانچہ ہوسکتا ہے کہ سہ پہر کے وقت سانپ کو مارا جائے اور شام تک اس کا جسم ٹھنڈا نہ ہو لیکن ایسے کرشمے میں سانپ کی کوئی خصوصیت نہیں۔

⑧ شتر مرغ کے متعلق دو باتیں مشہور ہیں۔ ایک یہ

کہ وہ لوہے کا ٹکڑا نگل کر ہضم کر لیتا ہے اور دوسرے یہ کہ وہ خطرے کے وقت اپنا سر ریت کے اندر چھپا لیتا اور سمجھتا ہے کہ اب میں محفوظ ہو گیا۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ وہ پتھر کا ٹکڑا تو بے شک ہضم کر سکتا ہے لیکن لوہا ہضم نہیں کر سکتا۔ لوہے کے ٹکڑے کو پتھر سمجھ کر کھا جانا ممکن ہے لیکن پھر اس کو اگلنا پڑتا ہے۔

ریت کے اندر سر چھپا لینے کی تصدیق بھی ان شکاریوں سے نہیں ہوتی جنہوں نے برسوں افریقا کے جنگلوں میں صرف کیے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہوتا تو آج شتر مرغ کی نسل مفقود ہو گئی ہوتی کیونکہ شکاری اور درندے ہمیشہ ایسے ہی موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں اور ریت میں سر چھپانے کے بعد اس کا شکار اور زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔

⑨ مشہور ہے کہ صحرائے اعظم کی ریت لہریں لیتی ہے حالانکہ اس کی کوئی اصلیت نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہوا کی وجہ سے صحرا کی ریت پر موجوں کے سے نشان نظر آنے لگتے ہیں لیکن خود ریت میں کوئی موج پیدا نہیں ہوتی۔

یہ بھی مشہور ہے کہ چور بالو (کوئک سینڈ) انسان کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ اس ریت میں کافی تری ہوتی ہے۔ اس پر چلنے کے بعد انسان اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکتا اور اندر دھنستا چلا جاتا ہے۔ خود بالو میں کوئی کشش نہیں ہے۔

⑩ لوگوں کو یقین ہے کہ بحر اوقیانوس کے جنوب میں سمندر کا ایک حصہ ہے جسے ''بحر مارگاسو'' کہتے ہیں۔ جب کشتیاں اس کے قریب پہنچتی ہیں تو وہ اپنے اندر کھینچ کر انھیں ڈبو دیتا ہے لیکن یہ صرف خیال ہی ہے۔ آج تک کوئی واقعہ ایسا نہیں پیش آیا حالانکہ اٹلانٹک کا کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں جہاز نہ گئے ہوں۔

⑪ اب ایک تاریخی جھوٹ بھی ملاحظہ فرمائیں..... مشہور ہے کہ امریکا کو سب سے پہلے کولمبس نے دریافت کیا حالانکہ وہاں کے قدیم باشندوں کے آباء واجداد نے کولمبس کے وہاں پہنچنے سے بہت پہلے اسے دریافت کر لیا تھا۔

⑫ دوسرا تاریخی جھوٹ جس پر افسانے لکھے جا چکے، یہ ہے کہ جس وقت شہر روم آگ میں جل رہا تھا تو بادشاہ نیرو بربط (بانسری) بجا رہا تھا۔

روم میں آگ کا پھیل جانا درست ہے لیکن ایسے وقت میں نیرو کا ساز چھیڑ دینے والی بات صحیح نہیں چونکہ وہ عیسائیوں کا سخت دشمن تھا۔ اس لیے انھوں نے اپنے لٹریچر اور تصویروں کے ذریعے یہ پروپیگنڈا اس کے خلاف کیا جو مشہور ہوتا چلا گیا۔

⑬ کہتے ہیں کہ انسان کے دانت میں جانوروں کے دانتوں سے زیادہ زہر پایا جاتا ہے۔ اس میں کوئی سچائی نہیں۔ بات یہ ہے کہ دانت کے زخم سے جراثیم پیدا ہو جانے کا اندیشہ ضرور ہے۔ خواہ وہ دانت انسان کے ہوں یا حیوان کے لیکن یہ کہنا کہ انسان کے دانت میں جانوروں کے دانت سے زیادہ زہر ہے، بالکل بے بنیاد ہے۔

⑭ ایک عقیدہ یہ ہے کہ جب عورت حاملہ ہوتی اور کسی چیز سے ڈرتی ہے تو بچے کے جسم پر اس کا نشان بن جاتا ہے۔ اس طرح یہ بھی غلط طور پر مشہور ہے کہ اموات زیادہ تر نصف شب کے بعد ہوتی ہیں۔

⑮ کانچ کے متعلق مشہور ہے کہ اگر نگل لیا جائے تو وہ زہر ہو جاتا ہے۔ بجلی کی بابت کہا جاتا ہے کہ ایک مکان پر دو مرتبہ نہیں گرتی۔ یہ تمام باتیں غلط اور صرف واہمے کی پیداوار ہیں۔ ◆◆◆

ابن صفی تلخیص: انجم (بھارت)

پُراسرار کنواں

دماغ چکرا کر رکھ دینے والے ایک عجیب معمّے کو نامور جاسوس کی ذہانت و فطانت نے حل کر دیا

جاسوسی ادب پسند کرنے والوں کے لیے تحفہ خاص

موسم گرما کی ایک خوشگوار رات تھی۔ تقریباً گیارہ بجے تھے۔ نواب رشید الزماں نے اپنے نوآمدہ مہمان کے ساتھ ہی باغ میں کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد سے اب تک بیٹھے اس کے سفر کی داستانیں سن رہے تھے۔ ان کا مہمان، طارق ادھیڑ عمر کا تندرست آدمی تھا۔ وہ ایک سیاح تھا اور سیاحی کی وجہ ہمیشہ پردۂ راز میں ہی رہی تھی۔

اس وقت وہ ان کے پائیں باغ میں بیٹھا انھیں اپنے سفر کی داستانیں سنا رہا تھا۔ اس کی گود

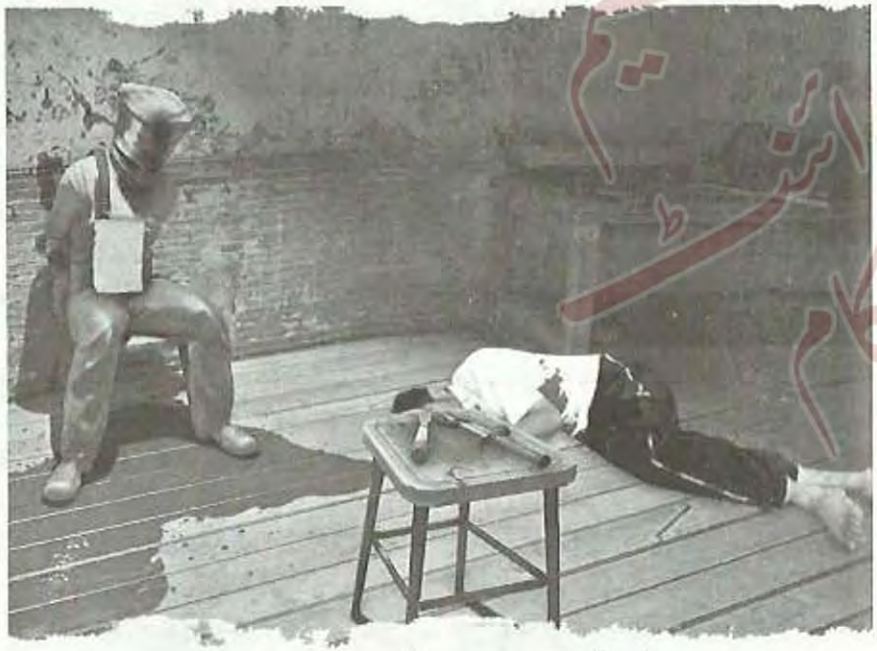

میں ایک نیولا بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ ایسا عجیب وغریب نیولا کم از کم نواب صاحب کی نظروں سے آج تک نہ گزرا تھا۔ وہ قد اور لمبائی میں ہندوستانی بلی سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ رنگ سیاہ تھا اور پیٹھ پر تین چار لمبی لمبی دھاریاں تھیں۔ بڑی سی گنجان دم کرسی سے لٹک رہی تھی۔

وہ لوگ گفتگو کر ہی رہے تھے کہ باغ میں روشنی سی ہوگئی۔ غزالہ نے پلٹ کر دیکھا تو چیخ مار کر اچھل پڑی۔ پرانے اندھے کنوئیں سے انگاروں کا فوارہ سا چھوٹ پڑا تھا۔ شعلے کافی بلندی تک اٹھ رہے تھے۔ ایک عجیب قسم کی زناٹے دار آواز سے بھی سارا باغ گونج رہا تھا۔

''یہ کیا تھا؟'' طارق جلدی سے بولا۔ اس کے نیولے نے بھی اتنی بھیانک چیخ ماری کہ سب کے جسموں پر لرزہ طاری ہوگیا۔ آہستہ آہستہ انگاروں کی بوچھاڑ کم ہوتی گئی اور تھوڑی دیر بعد باغ کی فضا پر پہلا سا سکوت طاری ہوگیا۔

''یہ کیا تماشا تھا؟'' طارق نے سکوت توڑا۔

''میں نے والد مرحوم کی زبانی سنا تھا کہ ایک بار دادا مرحوم کے زمانے میں بھی اس کنوئیں سے انگارے نکلے تھے اور پھر خاندان میں پے در پے اموات کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔'' نواب صاحب نے بتایا۔

''عجیب بات ہے!'' طارق اٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں جا کر دیکھتا ہوں۔''

''نہیں نہیں۔'' نواب صاحب نے اٹھ کر اسے روکتے ہوئے کہا۔ ''ادھر مت جاؤ۔''

طارق ہنس کر آگے بڑھ گیا۔ اس کا نیولا پالتو کتے کی طرح پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ ''ذرا ایک ٹارچ تو منگواؤ۔'' اس نے کنوئیں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

نواب صاحب نے ایک نوکر سے ٹارچ منگوائی۔

''رشید الزماں! یہاں آؤ۔'' طارق ٹارچ کی روشنی کنوئیں میں ڈالتے ہوئے بولا۔

''وہ دیکھو، کیا ہے؟'' طارق نے انھیں کنوئیں میں جھانکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

جب رشید الزماں نے وہ منظر دیکھا، تو چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئے۔ ان کے جسم سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینا چھوٹ رہا تھا۔

دفعتاً کوٹھی کے اندر ایک عجیب وغریب قسم کے شور کی آواز سنائی دی۔ ''ارے! یہ کیا ہے؟'' طارق چونک کر بولا۔

نواب صاحب بھی متحیر ہو کر کوٹھی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شور لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے بے شمار گیدڑ، کتے، الو اور نہ جانے کون کون سے جانور بیک وقت چیخ رہے ہیں۔ ساتھ ہی آدمیوں کا شور بھی سنائی دے رہا تھا۔ دونوں بے تحاشا کوٹھی کی طرف لپکے۔

''یہ اتنے جانور یہاں کیسے گھس آئے؟'' طارق نے کہا۔

''نہ..... نہ..... جج..... جانے..... کک..... کیا بات ہے؟'' نواب صاحب ہکلاتے ہوئے بولے۔

طارق ایک ایک کونا تلاش کرتا پھر رہا تھا لیکن چیخنے والے جانوروں کا کہیں پتا نہیں چل سکا۔ دفعتاً نواب صاحب کا عجیب الخلقت سوتیلا بھائی اچھلتا کودتا ہوا آگیا۔ وہ آوازیں سن کر وحشت ناک قہقہے لگا رہا تھا۔

اس کی عمر چالیس برس ہوگی لیکن اس نے اپنی وضع قطع بالکل شیر خوار بچوں کی سی بنا رکھی تھی۔ ہاتھ میں دودھ پینے والی بوتل تھی۔ جب وہ اچھل کود کر تھک جاتا تو بوتل سے دودھ پینے لگتا۔ گلے میں ایک پیڈ بندھا ہوا تھا۔

''بھائی صاحب! تماشا ہو لیا ہے؟'' وہ تالیاں بجاتا ہوا تتلا تتلا کر بولا۔

''چپ رہو۔'' نواب صاحب چیخ کر بولے: ''بھاگ جاؤ یہاں سے۔''

وہ شیر خوار بچے کی طرح سہم کر گھٹنوں کے بل چلتا ہوا ایک کمرے میں گھس گیا۔

آہستہ آہستہ شور کم ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بالکل سکوت

چھا گیا۔ طارق اور نواب صاحب حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ شور ختم ہو چکا تھا مگر کمروں میں چھپے لوگوں میں اب بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ باہر نکل آتے۔

''کیوں بھائی طارق! تمہی کچھ بتاؤ، یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' نواب صاحب بولے۔

طارق بولا: ''مجھے تو یہ آسیبی خلل معلوم ہوتا ہے۔''

''مگر وہ کنواں؟'' نواب صاحب نے دبی زبان سے کہا۔

''ایسے معاملات میں سب کچھ ممکن ہے۔''

''تو پھر پولیس کو اطلاع کرنی چاہیے۔'' نواب صاحب ہاتھ ملتے ہوئے بولے اور چلے گئے۔

طارق پھر پائیں باغ میں آگیا۔ وہ تھوڑی دیر تک کھڑا کچھ سوچتا رہا، پھر آہستہ آہستہ چلتا کنوئیں کے قریب آگیا۔ ہاتھ میں دبی ہوئی ٹارچ کی روشنی کنوئیں میں پڑ رہی تھی۔ دفعتاً اس کے ہونٹوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ پھر کوٹھی کی طرف روانہ ہوگیا۔

☆☆

آدھے گھنٹے بعد نواب صاحب ایک سب انسپکٹر اور دو کانسٹیبلوں کے ساتھ واپس لوٹے۔ کنوئیں میں کئی ٹارچوں کی روشنی بیک وقت پڑی اور نواب صاحب کے منہ سے حیرت سے چیخ نکل گئی۔ سب انسپکٹر نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

''ذرا طارق صاحب کو بلاؤ۔'' نواب صاحب نے ایک نوکر کی طرف دیکھ کر کہا۔

جب طارق وہاں پہنچا، تو نواب صاحب کو اپنا منتظر پایا۔ وہ بولے:

''آپ نے بھی عورت کی لاش دیکھی تھی نہ۔''

''اور اب میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ کو کیا بیان دوں۔'' طارق نے سب انسپکٹر سے کہا۔

''کیوں؟''

''اس لیے کہ میں نے نواب صاحب کے جانے کے بعد پھر اس کنوئیں میں جھانکا تھا۔ اس بار میں نے عورت کے بجائے مرد کی لاش دیکھی۔''

''اور اب وہاں کچھ بھی نہیں۔'' نواب صاحب نے بے تابی سے کنوئیں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا!''

طارق نے کہا اور کنوئیں کی طرف بڑھا۔ دوسرے ہی لمحے میں اس کی ٹارچ کی روشنی کنوئیں میں پڑ رہی تھی۔

طارق نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور سب لوگ حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔

''کیا اسی کنوئیں سے چنگاریاں بھی نکلی تھیں؟'' سب انسپکٹر نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''تب تو یہ کھلا ہوا معاملہ ہے۔ ہم لوگ بھلا اس میں کیا کر سکیں گے! اور کچھ آواز کا بھی تو آپ نے تذکرہ کیا تھا؟''

''جی ہاں، وہ کوٹھی کے اندر سے سنائی دی تھی۔'' طارق بولا۔

سب انسپکٹر نے کہا: ''اچھا تو نواب صاحب! اب اجازت چاہوں گا۔''

پولیس والے نواب صاحب کی کار پر رخصت کر دیے گئے۔

اس رات کے بعد سے نواب صاحب کی کوٹھی میں روزانہ نت نئی وارداتیں ہونے لگیں۔ نواب صاحب کے سوتیلے بھائی پرویز کی حالت اس وقت قابل دید ہوتی۔ جیسے ہی جانوروں کی آوازیں سنائی دیتیں، وہ اچھل کود مچا دیتا۔ اس کے لیے تین پہلوان ملازم رکھے گئے تھے جو اسے گود میں اٹھائے پھرا کرتے تھے۔ وہ شروع سے ایسا نہ تھا بلکہ آٹھ سال قبل اس کی یہ حالت ہوگئی تھی۔

شروع میں نواب صاحب کی بیٹی، غزالہ کا بھی یہی خیال تھا کہ یہ کوئی آسیبی معاملہ ہے لیکن عاملوں اور سادھوؤں کے تھک ہار جانے کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ یہ انسانی سازش ہے۔ اس نے نواب صاحب سے بھی اس کا تذکرہ کیا۔

''میں سوچ رہی ہوں، کیوں نہ اس معاملے میں فریدی صاحب کی مدد حاصل کی جائے؟''

''مگر وہ آئے ہی کیوں لگا؟''

''آئیں گے کیوں نہیں! میں نے سنا ہے کہ آج کل وہ اور ان کا اسسٹنٹ تین ماہ کی چھٹی پر ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں ان سے استدعا کروں تو وہ انکار نہیں کریں گے۔''

☆☆

غزالہ نے سونے کی کوشش کی لیکن نیند نہ آسکی۔ غزالہ جس کھڑکی کے قریب بیٹھی تھی، اس کا رخ باغ کی طرف تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے دفعتاً چونک پڑی۔ ایک تاریک سایہ آہستہ آہستہ کنوئیں کی طرف رینگ رہا تھا۔ غزالہ کا دل دھڑکنے لگا۔ سایہ کنوئیں کے قریب جا کر رک گیا۔ اس نے اپنے کاندھے سے کوئی چیز اتاری اور کنوئیں کی جگت کے قریب جا کر رک گیا۔

یہ طارق کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ غزالہ بری طرح کانپ رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا حلق بند ہو گیا ہو اور اب وہ کبھی نہیں بول سکتی۔ طارق کنوئیں میں اتر گیا۔ غزالہ محسوس کر رہی تھی جیسے اس پر آہستہ آہستہ غشی طاری ہو رہی ہے۔ وہ وہیں کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر گہری نیند سو گئی۔

دفعتاً شور کی آواز سن کر جاگ اٹھی۔ اس نے کھڑکی سے دیکھا، کنوئیں کے گرد لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ غزالہ جھپٹ کر باہر نکلی۔ ابھی وہ چند ہی قدم گئی ہوگی کہ اس نے دیکھا، دو نوکر پرویز کو اٹھائے کوٹھی کی طرف لا رہے ہیں۔ ان کے پیچھے نواب صاحب اور طارق تھے۔

دفعتاً غزالہ کو رات کی باتیں یاد آ گئیں۔ اس نے طارق کی طرف دیکھا۔ آنکھیں ملتے ہی ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اس کی زبان پکڑ لی ہو۔

پرویز کو ایک صوفے پر لٹا دیا گیا۔ وہ گہرے سانس لے رہا تھا۔ فوراً ہی ایک ڈاکٹر کو بلایا گیا جس نے اطمینان دلایا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ چند معمولی تدابیر اختیار کرنے پر وہ بولنے کے قابل ہو گیا۔

''میلی دودھ پینے کی چھی چھی۔'' پرویز اچانک اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''ابھی منگوائے دیتا ہوں۔'' نواب صاحب بولے۔

پرویز کی دودھ پینے کی بوتل کنوئیں کی جگت کے قریب ٹوٹی پڑی تھی۔

اسی دن شام کو غزالہ کچھ ایسے انتظامات میں مشغول نظر آئی جیسے اسے سفر کرنا ہے۔ نواب صاحب کے استفسار پر اس نے بتایا کہ وہ اپنے ماموں کے یہاں شہر جا رہی ہے۔ نواب صاحب نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ پہلے ہی سے چاہتے تھے کہ وہ کچھ دن کے لیے کسی عزیز کے یہاں چلی جائے۔

غزالہ سات بجے شام کی گاڑی سے شہر روانہ ہو گئی۔

☆☆

غزالہ اسٹیشن سے ٹیکسی کر کے فریدی کے گھر پہنچی۔ وہ گھر پر موجود نہیں تھا۔ سارجنٹ حمید ریڈیو پر گانے سن رہا تھا۔

''کیا فریدی صاحب تشریف نہیں رکھتے؟'' غزالہ نے پوچھا۔

''کہیں گئے ہیں۔''

''خیر، میں ان کا انتظار کروں گی۔''

تھوڑی دیر بعد چائے آ گئی۔ تبھی برآمدے میں قدموں کی آہٹ سنائی دی اور فریدی انگریزی سروں میں سیٹی بجاتا کمرے میں داخل ہوا۔

''ارے غزالہ خانم! خیریت؟'' فریدی نے دروازے میں رک کر کہا۔

دونوں کھڑے ہو گئے۔

''کب آئیں؟'' فریدی نے غزالہ سے پوچھا۔

''تقریباً ایک گھنٹے سے آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔ اسٹیشن سے اتر کر سیدھی ادھر ہی آئی ہوں۔''

''اور حمید صاحب آپ کو محض چائے پر ٹال رہے ہیں۔ بیٹھیے بیٹھیے۔''

پھر حمید کی طرف مڑ کر بولا: ''ارے بھئی کھانے کے لیے کہو۔''

کھانا ختم ہوا، تو تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں، پھر غزالہ اٹھتی ہوئی بولی:

''اچھا تو میں چلتی ہوں۔ اسٹیشن پر تین بجے آپ لوگوں کا انتظار کروں گی۔''

''بہت اچھا۔'' فریدی اسے الوداع کہتے ہوئے بولا۔

☆☆

غزالہ دونوں کا اسٹیشن پر انتظار کر رہی تھی۔ فریدی اور حمید وقت پر پہنچ گئے۔ ان کا سامان ایک فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں رکھ دیا گیا۔ تقریباً چھ بجے وہ لوگ داراب نگر پہنچ گئے۔ کوٹھی میں داخل ہوتے ہی غزالہ کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ پورٹیکو میں دو تین کانسٹیبل کھڑے تھے۔ کچھ اس قسم کی پریشان کن آوازیں سنائی دے رہی تھیں جیسے کوئی حادثہ ہو گیا ہو۔

غزالہ فریدی اور حمید کو پیچھے چھوڑ کر بے تحاشا بھاگی۔ وہ دونوں ٹیکسی پر سے سامان اتروا ہی رہے تھے کہ غزالہ تیز تیز چلتی واپس آئی۔

''لاش، لائبریری میں لاش۔'' وہ ہانپتی ہوئی بولی۔

''کس کی لاش؟'' فریدی نے پرسکون لہجے میں پوچھا۔

''ابا جان کے پرائیویٹ سیکرٹری کی۔''

لائبریری میں دو سب انسپکٹر، ایک کانسٹیبل، طارق اور نواب صاحب کھڑے تھے۔ کھڑکی کے قریب رکھی کرسی کے پاس ایک آدمی اس طرح پڑا تھا جیسے بیٹھے بیٹھے زمین پر لڑھک گیا ہو۔ اس کا ایک ہاتھ ابھی تک کرسی ہی پر تھا۔

''ارے فریدی میاں!''

نواب صاحب بے ساختہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولے: ''بھئی ٹھیک وقت پر آئے۔''

''آپ کی تعریف؟'' ایک سب انسپکٹر نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

''ارے! آپ انھیں نہیں جانتے؟''

نواب صاحب نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ''یہ محکمۂ سراغ رسانی کے انسپکٹر فریدی ہیں۔''

''کیا یہ رات میں باہر بیٹھا کرتا تھا؟'' فریدی نے نواب صاحب سے پوچھا۔

''نہیں، کل ہی میں نے اسے ایک کتاب تلاش کرنے کے لیے یہاں بھیجا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کتاب تلاش کر کے اپنے کمرے میں آ گیا ہوگا۔''

اتنے میں ڈاکٹر آ گیا۔ ''موت واقع ہوئے تقریباً چار پانچ گھنٹے ہو چکے۔'' ڈاکٹر نے سر اٹھا کر کہا۔

''موت کی وجہ؟'' فریدی نے پوچھا۔

''اچانک قلب کی حرکت بند ہو گئی۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔

''نواب صاحب! کیا یہاں روز رات کو کوئی بیٹھا کرتا ہے؟'' فریدی نے پوچھا۔

''میں خود بلا ناغہ دو تین گھنٹے یہاں بیٹھ کر پڑھتا ہوں۔''

''ٹھیک۔''

فریدی نے میز پر پڑی ہوئی کشتی نما ٹوپی اٹھاتے ہوئے کہا: ''یہ غالباً اسی کی ٹوپی ہے۔''

''نہیں، میری ہے۔''

''آپ کون سا تیل استعمال کرتے ہیں؟'' فریدی نے اچانک پوچھا۔

''کوئی نہیں۔'' نواب صاحب اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیر کر جھینپتے ہوئے بولے۔

فریدی کھڑکی کے قریب کھڑا ہوا کچھ دیر سوچتا رہا، پھر نواب صاحب کی طرف مڑ کر بولا:

''آپ اس کرسی پر بیٹھ کر پڑھتے ہیں؟''

''ہاں۔''

اس نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر اِدھر اُدھر دیکھا اور نواب صاحب کے پاس لوٹ آیا۔

''ذرا دو منٹ کے لیے اس کرسی پر بیٹھ جایئے۔'' فریدی نے لاش کے قریب والی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ نواب صاحب کرسی پر بیٹھ گئے۔

''اور اب یہ ٹوپی پہن لیجیے۔'' فریدی نے میز پر پڑی ہوئی ٹوپی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ نواب صاحب نے ٹوپی پہن لی۔

فریدی تھوڑی دیر انھیں دیکھتا رہا۔ پھر پوچھا:

''کیا آپ پڑھتے ہوئے پانی پیتے ہیں؟''

نواب صاحب بولے: ''جی ہاں۔ قریبی میز پر صراحی رکھی رہتی ہے۔ اسی سے پانی پیتا ہوں۔ ہائیں..... وہ صراحی کہاں گئی؟''

''میں ایک منٹ آیا۔'' فریدی نے حمید کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر لے جاتے ہوئے کہا۔

دونوں لائبریری کی پشت پر آ کر کھڑے ہو گئے۔

''دیکھ رہے ہو حمید!'' فریدی نے کہا۔

''کھڑکی سے صرف نواب صاحب کی ٹوپی دکھائی دے رہی ہے۔ ان کی پیٹھ ہماری طرف ہے اور اس کھڑکی کی اونچائی بھی تم دیکھ رہے ہو۔''

''تو کیا؟'' حمید کی آنکھوں سے حیرت کی جھلکیاں دکھائی دیں۔

''تم یہیں ٹھہرو اور ان کا خیال رکھنا۔'' فریدی نے کھڑکی کے نیچے پڑے ٹوٹی صراحی کے ٹھیکروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

حمید اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

''ان پر کڑی نظر رکھنا۔ کوئی انھیں چھونے نہ پائے۔'' فریدی نے کہا اور لائبریری میں چلا گیا۔ نواب صاحب اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''اب اگر آپ لوگ دلچسپ تماشا دیکھنا چاہیں تو میرے ساتھ آیئے۔'' فریدی ہیڈ کانسٹیبل کی طرف مڑ کر بولا:

''دیوان جی! آپ یہیں لاش کے پاس ٹھہریے۔''

ہیڈ کانسٹیبل کے علاوہ باقی لوگ فریدی کے ساتھ لائبریری کی پشت پر آ گئے۔ ایک کمرے کی کھڑکی میں لٹکے پیتل کے بڑے سے حلقے میں ایک سفید رنگ کا بھاری بھرکم توتا بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

''کیا آپ اسے یہاں منگوا سکتے ہیں؟'' فریدی نے نواب صاحب سے کہا۔

نواب صاحب کے اشارے پر ایک نوکر توتے کو کھڑکی سے اتار لایا۔ فریدی کھڑکی کے نیچے پڑے ٹھیکروں کی طرف بڑھا۔ ایک بڑا سا ٹھیکرا جس میں تھوڑا سا پانی تھا، اٹھا کر توتے کے قریب لایا اور اس کی چونچ سے لگا دیا۔ توتا پانی پینے لگا۔

''ذرا ایک خالی بوتل تو منگوایئے۔'' فریدی نے نواب صاحب سے کہا۔

فریدی نے توتے کا حلقہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اس کی تیز نگاہیں توتے کا گہرا جائزہ لے رہی تھیں۔

''حمید! بقیہ ٹھیکروں کا پانی احتیاط سے اس بوتل میں ڈال لو۔'' فریدی نے بوتل نوکر کے ہاتھ سے لے کر حمید کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

ہر چند کہ معاملات بہتوں کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے لیکن ہر ایک کی نظر توتے کی طرف لگی ہوئی تھی۔ یک بیک توتے نے پر پھڑ پھڑانے شروع کیے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ حلقے سے لڑھک کر زنجیر میں جھول گیا۔

''ارے! یہ تو مر گیا۔''

نواب صاحب کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔

فریدی ان کی بات سنی ان سنی کر کے سب انسپکٹر پولیس کی طرف مڑا۔

''داروغہ جی! آپ سیکرٹری کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا سکتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ مردہ توتا بھی۔''

''تو کیا..... تو کیا.....'' سب انسپکٹر اس سے آگے نہ کہہ سکا۔

''جی ہاں، جس زہر نے توتے کی جان لی، وہی سیکرٹری کی موت کا بھی باعث بنا ہے۔'' فریدی نے پرسکون لہجے میں کہا۔

''زہر؟''

نواب صاحب کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''جناب والا!'' فریدی نے قدرے جھکتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ بھی واضح رہے کہ زہر دینے والے کا نشانہ خود آپ تھے۔ وہ تو یہ کہیے سیکرٹری کی قضا آئی تھی۔''

سب لوگ پھر لائبریری میں چلے آئے۔ فریدی کی گفتگو سن کر غزالہ کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

''سیکرٹری کی موت کا باعث غالباً آپ کی ٹوپی ہے۔'' فریدی نے کہا۔

نواب صاحب نے ٹوپی کو لے کر سونگھا اور سر ہلانے لگے۔

''ایسی ہی خوشبو اس کے سر میں بھی موجود ہے۔'' فریدی نے لاش کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''رات پڑھتے وقت شاید اس نے آپ کی ٹوپی پہن لی تھی۔ میں نے آپ کو یہ ٹوپی پہن کر کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا تھا۔ باہر جا کر دیکھا تو اُدھر سے صرف آپ کا سر نظر آ رہا تھا اور پشت میری طرف تھی۔ زہر دینے والا سمجھا، شاید آپ ہی لائبریری میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے آپ سے پانی پینے کے متعلق پوچھا تھا۔ قاتل آپ کی اس عادت سے واقف تھا۔''

''اس نے پیچھے ہی سے ہاتھ بڑھا کر میز پر رکھی صراحی میں زہر ڈال دیا۔ آپ کا سیکرٹری بھی غالباً کثرت سے سگریٹ پیتا تھا اور گرمیوں میں سگریٹ پینے کے بعد پیاس ضرور معلوم ہوتی ہے۔ مرحوم نے صراحی کا پانی پیا اور پھر تو آپ جانتے ہی ہیں۔ قاتل بعد میں اپنی اس حرکت کا نتیجہ دیکھنے آیا اور جلدی میں صراحی کو ہاتھ مار کر نیچے گرا دیا۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ صراحی ٹوٹنے کی آواز سن کر قریب کے لوگ جاگ بھی سکتے ہیں''۔

''بہرحال نواب صاحب، آپ کو احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ ایک سیکرٹری کی جان لینے کے لیے اتنا اودھم مچانے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟''

''اودھم سے مطلب؟'' نواب صاحب بولے۔

''جانوروں کی موتیں، وحشی درندوں کی آوازیں اور آگ اگلتا ہوا کنواں۔'' فریدی نے کہا اور سامنے کی دیوار پر نظریں گاڑ دیں۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

سب انسپکٹر لاش اٹھوانے کا انتظام کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ناشتے کا سامان آ گیا۔ سب لوگ ایک بڑی میز کے گرد بیٹھ گئے۔

''آپ نے کون سی کتاب ڈھونڈنے کے لیے اسے بھیجا تھا؟''

''ایک قلمی نسخہ جو اسی عمارت کے متعلق تھا۔''

فریدی یک بیک اچھل پڑا۔ پوچھا: ''کوئی خاص بات تھی اس میں؟''

''ظاہر ہے، اگر کوئی خاص بات ہوتی تو وہی ایک صفحے پڑھ کر کیوں رہ جاتا۔''

''وہ کتنی پرانی ہے؟'' فریدی نے کہا۔

''ٹھہرو، میں ابھی دکھاتا ہوں۔'' نواب صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''بے کار ہے۔'' فریدی نے انھیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے

ہوئے کہا۔ ''وہ اب یہاں موجود نہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''آپ کہہ رہے تھے کہ وہ کتاب اسی عمارت کے متعلق تھی۔'' فریدی نے نواب صاحب کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ اندازاً بھی اس کی تاریخ مجھے نہیں بتا سکتے؟''

''وہ کتاب تین سو سال سے کسی طرح کم پرانی نہ ہوگی۔'' نواب صاحب بولے۔

''تین سو سال؟''

فریدی نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''مگر یہ عمارت تو جدید طرز کی ہے؟''

''جس حصے میں آپ بیٹھے ہوئے ہیں، اسے بنے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ پرانی عمارت تو کبھی کی ختم ہو چکی۔ اس کے کچھ کھنڈرات ابھی تک پچھلے حصے میں باقی ہیں۔''

''اوہ! تب تو میں سو فی صد یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ سیکریٹری کی موت کتاب ہی کی وجہ سے واقع ہوئی۔''

''مگر کیسے؟''

نواب صاحب بے چینی سے بولے۔

''اس کتاب میں عمارت کے متعلق کوئی گہرا راز تحریر تھا۔'' فریدی نے کہا۔

''مگر وہ راز کیا ہو سکتا ہے؟''

''وہ راز؟'' فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا: ''اگر وہ راز آپ کو معلوم ہو جاتا تو آپ کے گھر میں ہونے والے واقعات آپ کی نظر میں کھیل کود سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے؟''

نواب صاحب خاموش ہو گئے لیکن ان کی بے چینی آنکھوں سے ظاہر ہو رہی تھی۔

☆☆☆

فریدی اور حمید اپنے اپنے کمروں کی طرف چلے آئے۔ فریدی کمرے کے دروازے پر رک کر سگار سلگانے لگا۔ حمید اندر داخل ہو چکا تھا۔ دفعتاً فریدی کو حمید کی چیخ سنائی دی اور سگار اس کی انگلیوں سے پھسل گیا۔ وہ جھپٹ کر کمرے میں داخل ہوا۔ حمید دیوار کا سہارا لیے حیران آنکھوں سے کمرے میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ سر سے پیر تک خون میں نہایا ہوا تھا۔

حمید خاموش تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔ دفعتاً وہ چیخ کر کمرے سے باہر بھاگا۔ فریدی بھی اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ کوٹھی کے سارے لوگ حمید اور فریدی کو اس حال میں دیکھ کر چیخنے لگے۔ فریدی نے حمید کو پھاٹک کے قریب جا پکڑا۔ اس نے پوچھا:

''تمہارے چوٹ تو نہیں آئی؟''

حمید نے جس کی سانس پھول رہی تھی، نفی میں سر ہلا دیا۔

''پھر..... کیا ہوا؟''

''میں جیسے..... ہی کمرے میں..... داخل ہوا..... میرے سر پر خون کی تیز بوچھاڑ ہو گئی۔''

''احمق ہوا چھے خاصے۔'' فریدی نے کوٹھی کی طرف بھاگتے ہوئے کہا۔

راستے میں غزالہ ملی۔ وہ بھاگ دوڑ کی وجہ پوچھنے لگی۔

''اوپر جانے کا راستہ؟ جلدی کیجیے۔'' فریدی تیزی سے بولا۔

غزالہ بھی اس کے ساتھ دوڑنے لگی۔ اس نے زینے کی طرف اشارہ کیا اور فریدی دوڑتا ہوا زینے طے کرنے لگا۔

''ذرا جلدی کیجیے۔ میرے کمرے کی چھت کہاں ہے؟''

''ادھر آیئے۔'' غزالہ ہانپتی ہوئی بولی۔ ''وہ ادھر..... اس دیوار کے قریب سے شروع ہوتی ہے۔''

فریدی گھٹنوں کے بل بیٹھ کر چھت کا جائزہ لینے لگا۔ کچھ دور ہٹ کر شیشے کے روشن دان کے قریب اسے خون کی چھینٹیں دکھائی دیں۔ فریدی بے تابی سے کھڑا ہاتھ مل رہا تھا۔

دونوں نیچے اتر آئے۔

☆☆☆

اسی رات کی بات ہے۔ فریدی، حمید، غزالہ، طارق اور نواب صاحب برآمدے میں بیٹھے کنوئیں سے چنگاریاں نکلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ غزالہ کی آنکھیں فریدی کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔

''گیارہ تو بج گئے۔'' نواب صاحب نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

''مجرم آج تیسری حماقت نہ کرے گا۔'' فریدی نے مسکرا کر کہا۔

''تو کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ یہ کسی آدمی کی حرکت ہے؟'' نواب صاحب نے کہا۔

''سو فی صد۔'' فریدی نے کہا اور سگار سلگانے لگا۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دفعتاً ایک تیز قسم کی سرسراہٹ کی آواز سنائی دی۔

''یہ لو، آوازیں شروع ہو گئیں۔''

''اوہ!'' فریدی کے منہ سے بے اختیار نکلا اور وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ساتھ ہی اس نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالی۔

جانوروں کی آوازوں سے کوٹھی گونج رہی تھی۔ فریدی اٹھ کر اندر چلا گیا۔ آوازوں کا سارا سلسلہ ختم ہوتے ہی اس نے پھر اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔

''ایک سیڑھی منگوایئے۔'' فریدی نے کہا اور بجھے سگار کو سلگا کر بے تابی سے برآمدے میں ٹہلنے لگا۔

دو نوکر سیڑھی لے کر آئے۔ اس کی ہدایت کے مطابق چھت والی دیوار سے سیڑھی لگا دی گئی۔

اوپر پہنچ کر وہ تھوڑی دیر تک ادھر ادھر دیوار کو انگلیوں سے کھٹ کھٹاتا رہا، پھر یک بیک اس کا قہقہہ سن کر لوگ چونک پڑے۔

''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ دیوار کس چیز کی بنی ہوئی ہے؟'' فریدی نے کہا۔

''ارے بھائی! پتھر کی ہے، اور کس چیز کی ہوتی۔''

''کیا یہاں بھی پتھر ہی ہے؟''

''ہاں بھئی۔'' نواب صاحب نے کہا لیکن ان کے لہجے سے معلوم ہو رہا تھا جیسے انھوں نے طوعاً و کرہاً جواب دیا ہو۔

''ذرا دیکھیے، یہ پتھر کتنا لچک دار ہے۔'' فریدی نے اس حصے کو ہاتھ سے دباتے ہوئے کہا۔

''ارے! یہ کیا؟'' نواب صاحب حیرت سے چیخے۔

فریدی ہنسنے لگا۔

''بھئی بتاؤ، یہ کیا معاملہ ہے؟ مجھے اختلاج ہو رہا ہے۔''

''تو سنیے جناب! ابھی تک آپ ایک بہت ہی دلچسپ ریکارڈ سنتے رہے ہیں۔ یہاں اس جگہ لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا ہے۔''

''ارے!'' نواب صاحب اچھل پڑے۔

''کوئی بات نہیں۔ میرا کام ختم۔ چلو بھئی حمید! سامان وغیرہ باندھ لو۔ ہم اسی وقت چلیں گے۔ ایک بجے والی گاڑی مل ہی جائے گی۔''

''مگر..... مگر.....'' نواب صاحب رک رک کر بولے۔ ''کام..... ختم..... کہاں ہوا ہے؟ ہم لوگوں کی زندگی خطرے میں معلوم ہوتی ہے۔''

''بھلا میں اس کے لیے کیا کر سکتا ہوں! کم از کم یہ معاملہ میرے بس کا نہیں۔ اس کا پتا تو آپ لوگوں کو بھی تھا۔''

''تم جانے کیسی باتیں کر رہے ہو۔ کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں؟'' نواب صاحب بولے۔

''طارق صاحب! بھلا آپ خود فیصلہ کیجیے۔'' فریدی بولا۔ ''اس بات پر کسے یقین آئے گا؟ اس طرح دیواروں میں لاؤڈ اسپیکر فٹ کر دینا کوئی گھڑی دو گھڑی کا کام تو ہے نہیں۔ ظاہر ہے اس میں عرصہ لگا ہوگا۔ پھر میں یہ کیسے سمجھ لوں کہ گھر کے رہنے والوں کو اس کی اطلاع نہ ہوئی۔''

''فرض کیجیے کہ یہ حرکت گھر ہی کے کسی آدمی کی ہے تو ایسی حالت میں اس کا علم کسی اور کو بھی ہونا چاہیے۔ کیا خیال ہے؟''

''صاحب! اس کے متعلق میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' طارق نے جواب دیا۔

''جالی..... لاؤڈ اسپیکر۔'' نواب صاحب خود بخود بڑبڑائے۔

''شاید آپ کو یقین نہیں آیا۔'' فریدی نے پتلون کی جیب سے بڑا سا چاقو نکال کر حمید کو دیتے ہوئے کہا: ''جاؤ بھئی، ذرا چڑھ کر اس معاملے کو صاف ہی کر دو۔''

حمید چاقو لے کر سیڑھی پر چڑھ گیا۔ تھوڑی دیر محنت سے اتنی جالی کٹ گئی کہ لاؤڈ اسپیکر کا ہارن صاف دکھائی دینے لگا۔

''اس عمارت کے کمروں میں سفیدی کب سے نہیں ہوئی؟'' فریدی نے پوچھا۔

''پچھلے سال ہوئی تھی۔'' نواب صاحب بولے۔

''تو یہ سب کام اس کے بعد ہی ہوا ہے، ورنہ سفیدی کرنے والوں میں ضرور سراسیمگی پھیلتی۔''

''اف میرے اللہ!'' نواب صاحب اپنا چہرہ رومال سے صاف کرتے ہوئے بولے: ''تو یہ سب کام اس وقت ہوا جب میں اور غزالہ چھ ماہ کے لیے باہر چلے گئے تھے۔''

''اس وقت غالباً لاؤڈ اسپیکر کے ہارن فٹ کیے گئے تھے کیونکہ یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔ ایک رات میں بھی ہو سکتا ہے لیکن ان دیواروں میں تار دوڑانے کا انتظام اسی وقت کر لیا گیا ہوگا جب یہ عمارت زیر تعمیر رہی ہوگی۔''

نواب صاحب حیرت سے فریدی کو دیکھ رہے تھے۔

''یہ عمارت کس کی نگرانی میں تیار ہوئی تھی؟'' دفعتاً فریدی نے پوچھا۔

''میرے مرحوم پرائیویٹ سیکرٹری کی نگرانی میں۔''

نواب صاحب بولے: ''میں اس زمانے میں مستقل طور پر لکھنؤ میں مقیم تھا۔''

''تو یہ وجہ ہے ان حضرت کی موت کی۔'' فریدی بے اختیار بولا۔

''کیا مطلب؟''

''یقیناً وہ حضرت اس نامعلوم آدمی سے ملے ہوئے تھے جو آپ کو تنگ کر رہا ہے اور آخر اس نے اسے بھی اپنے راستے سے ہٹا دیا۔''

''کچھ بھی سہی لیکن آپ یہاں سے نہیں جا سکتے۔'' غزالہ بولی۔ ''چلیے، اب آرام کر لیجیے۔''

☆☆☆

رات حد درجہ تاریک تھی۔ فریدی نے اپنا پلنگ برآمدے میں نکلوا لیا تھا۔ خنکی بڑھ جانے کی وجہ سے اس نے چادر اوڑھ لی تھی۔ ساری کوٹھی پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دفعتاً ایک طرف ایک تاریک سایہ متحرک نظر آیا۔ وہ آہستہ آہستہ فریدی کے پلنگ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ پلنگ کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ اس کا ایک ہاتھ بلند ہوا اور بڑا سا خنجر سونے والے کے جسم میں پیوست ہو گیا، ساتھ ہی کسی طرف سے ایک دوسرا سایہ جھپٹ کر پہلے سائے پر آ رہا۔ دونوں گتھ گئے۔

دفعتاً ایک سایہ دوسرے کی گرفت سے نکل کر بھاگا۔ دوسرا سایہ اس کا پیچھا کرنے لگا اور پھیلی ہوئی تاریکی نے دونوں کو اپنے دامن میں چھپا لیا۔ اچانک عمارت چیخوں سے گونج اٹھی۔

شور و غل سن کر لوگ جاگ اٹھے۔ حمید بھی بیدار ہو گیا۔ وہ بھاگ کر فریدی کے کمرے کی طرف آیا۔ جیسے ہی اس نے ٹارچ جلائی، اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ فریدی نے ماتھے تک چادر اوڑھ رکھی تھی اور اس کے سیاہ بال تکیے پر بکھرے ہوئے تھے اور سینے پر ایک خنجر پیوست تھا جس کا صرف دستہ

نظر آ رہا تھا۔

حمید بے تحاشا چیخنے لگا: ''دوڑو..... دوڑو..... قتل..... قتل۔''

اس دوران بارش بھی ہونے لگی تھی اور اتنی تیز کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

دفعتاً کسی نے قہقہہ لگایا۔ سب لوگ چونک پڑے۔ فریدی پانی میں شرابور لڑکھڑاتا ہوا برآمدے میں داخل ہوا۔

''ارے! آپ؟'' سب کی زبان سے بیک وقت نکلا۔

''پہلے یہ بتائیے کہ یہ کون ہے؟'' حمید نے لاش کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''چادر الٹ کر دیکھو۔''

جیسے ہی حمید نے چادر الٹی، اس کے منہ سے حیرت کی چیخ نکل گئی۔

چادر کے نیچے تین چار تکیے رکھے ہوئے تھے اور سرہانے کے تکیے پر موم کا بنا ایک سر رکھا ہوا تھا جس پر سیاہ رنگ کے بڑے بڑے بال چپکے ہوئے تھے۔

''حضور! بڑے سرکار کمرے میں نہیں ہیں۔'' اس نوکر نے لوٹ کر کہا جو نواب صاحب کو بلانے گیا تھا۔

''اوہ!'' فریدی تیزی سے نواب صاحب کے کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ بقیہ لوگ بھی اس کے پیچھے تھے۔

نواب صاحب کا کمرا خالی تھا۔ بستر بچھا ہوا تھا۔ بستر کی شکنیں کہہ رہی تھیں کہ کوئی اس پر سویا ضرور ہے۔ کوٹھی کا کونا کونا چھان ڈالا گیا۔ نواب صاحب کا کہیں پتا نہیں چلا۔

☆☆☆

دوسرے دن نواب صاحب کی کوٹھی میں کہرام مچا ہوا تھا۔ نواب صاحب ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔ سب سے زیادہ غزالہ پریشان تھی اور سب سے زیادہ خاموش فریدی تھا۔ گہرے تفکر کی وجہ سے اس کی پیشانی پر سلوٹیں ابھری ہوئی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنے کمرے سے نکل کر حمید کے کمرے کی طرف گیا۔

''سنو۔'' فریدی آہستہ سے بولا: ''آج رات کو میں اس کنوئیں میں اتروں گا۔''

''میں آپ کو ہرگز نہ اترنے دوں گا۔''

''نہیں بھئی، اب اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔''

حمید خاموش ہو گیا۔

''میرا خیال ہے کہ رات کو اس کنوئیں کی نگرانی ضرور کی جاتی ہوگی۔ تم شام ہی سے باغ پر نظر رکھنا۔''

☆☆☆

رات کو حمید دوڑا ہوا فریدی کے پاس آیا۔

''آپ کا خیال صحیح تھا۔'' وہ ہانپتا ہوا بولا: ''میں نے ابھی ابھی ایک آدمی کو کنوئیں کی پیچھے والی جھاڑی میں چھپتے ہوئے دیکھا ہے۔''

فریدی پہلے ہی سے تیار بیٹھا تھا۔ اس نے ضروری سامان ساتھ لیا اور حمید کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ پھاٹک کے باہر نکل کر دونوں چہار دیواروں کے نیچے چلنے لگے۔ ایک جگہ فریدی رک گیا۔

''وہ دیکھیے، کنوئیں کی جگت کے پاس جھاڑیوں میں۔'' حمید نے آہستہ سے کہا۔

فریدی نے سر ہلایا۔ وہاں کوئی چھپا ہوا تھا۔ فریدی اپنے پستول کی نال پکڑ کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ جھاڑیوں کے قریب پہنچ کر اس کا پستول والا ہاتھ اوپر اٹھا اور ساتھ ہی کسی کے گرنے کی آواز آئی۔

''حمید..... حمید..... جلدی کرو..... رسی۔'' فریدی نے کہا۔

وہ ایک قوی ہیکل آدمی کو دبوچے بیٹھا تھا۔ آدمی سر میں چوٹ لگنے کی وجہ سے بے ہوش ہو چکا تھا۔ دونوں نے مل کر اسے ایک درخت کے تنے سے جکڑ دیا۔

"دیکھو، اس کی اچھی طرح نگرانی کرتے رہنا۔ اگر کوئی بات ہو تو بے دریغ پستول استعمال کر لینا۔"

یہ کہہ کر فریدی جھاڑیوں میں گھس گیا۔ چند لمحوں کے بعد جب وہ وہاں سے نکلا تو اس کے ہاتھ میں ایک پنجرہ تھا۔

"یہ کیا؟" حمید نے آہستہ سے پوچھا۔

"طارق کا نیولا۔"

فریدی نے پنجرہ زمین پر رکھ دیا پھر ریشم کی مضبوط ڈوری کے سرے میں ایک پتھر باندھ کر اسے کنوئیں میں پھینک دیا اور ڈور کا دوسرا سرا قریب کے ایک تنے سے باندھ کر پیشانی سے پسینا پونچھنے لگا۔

"اچھا بھئی حمید! اللہ حافظ۔ میں چلا۔ بہت ہوشیاری سے رہنا۔ اگر کوئی خطرہ درپیش ہو تو بے تکلف گولی چلا دینا۔" فریدی نے کہا اور نیولے کا پنجرہ اپنے گرد لپٹی چمڑے کی پیٹی میں لٹکا لیا۔ پھر ٹارچ کی روشنی میں دیر تک کنوئیں کے اندر دیکھتا رہا۔ اچھی طرح اطمینان کر لینے کے بعد اس نے ٹارچ پتلون کی جیب میں ڈالی اور ریشم کی ڈور کے سہارے کنوئیں میں اترنے لگا۔ اس طرح اترنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ تھوڑی دور جا کر ڈور پسینے کی وجہ سے ہاتھ سے پھسلنے لگی۔

☆☆☆

اچانک فریدی کی کمر سے لٹکے پنجرے سے بھی عجیب قسم کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ شاید نیولا سانپوں کی پھنکاریں سن کر اپنے غصے کا اظہار کر رہا تھا۔ ابھی اس نے صرف آدھی مسافت طے کی تھی۔ گرمی کی وجہ سے اس کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ اس نے منہ اوپر کر کے دو تین گہرے گہرے سانس لیے اور پھر نیچے اترنے لگا۔

بہر حال بہ ہزار دقت وہ کنوئیں کی تہ تک پہنچا۔ ٹارچ کی روشنی میں وہ کنوئیں کا جائزہ لینے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی محنت بے کار گئی ہو۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ تھک ہار کر اس نے اوپر چڑھنے کا ارادہ کیا۔ رسی پکڑ کر جیسے ہی سر اٹھایا، دوسرا پیر کنوئیں کی دیوار سے ٹکرا گیا اور ایک عجیب قسم کی آواز پیدا ہوئی۔ فریدی چونک کر پھر نیچے اتر گیا۔ جہاں پیر لگا تھا، اس جگہ کو بغور دیکھنے لگا۔ پھر اسے انگلیوں سے آہستہ آہستہ کھٹ کھٹایا۔

"اوہ میرے اللہ!" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

دیوار کا یہ حصہ ٹین کا بنا ہوا تھا لیکن اسے اس طرح بنایا گیا تھا کہ دیکھنے میں اینٹوں کی جڑائی معلوم ہو رہی تھی۔ فریدی نے جیب سے چاقو نکال لیا۔

تھوڑی دیر میں اس نے ٹین کا وہ ڈھکنا وہاں سے نکال پھینکا۔ سامنے دیوار کا اتنا بڑا حصہ کھل گیا تھا جس سے آدمی بیٹھ کر بآسانی گزر سکتا تھا۔ فریدی ٹارچ کی روشنی میں رینگتا ہوا آگے بڑھا۔ اب وہ ایک اچھے خاصے کمرے میں چل رہا تھا۔ گویا یہ کنواں ایک زیرِ زمین تہ خانے سے منسلک تھا۔

دفعتاً وہ ٹھٹک گیا۔ سامنے ایک عورت اور مرد کھڑے ہوئے تھے۔

اس نے قریب جا کر دونوں کو ٹٹولا، وہ ربڑ کے بنے ہوئے تھے۔ فوراً فریدی کو خیال آیا کہ یہ وہی مورتیاں ہیں جنہیں پہلے دن نواب صاحب وغیرہ نے لاش سمجھا تھا۔ فریدی آگے بڑھا۔ سامنے ایک دروازہ تھا جس کی درزوں سے روشنی چھن چھن کر کمرے میں آ رہی تھی۔

دوسرے کمرے میں کسی کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ فریدی نے کواڑوں کی درز سے آنکھیں لگا دیں۔ دوسرے کمرے میں ایک آدمی کی لاش پڑی ہوئی تھی جس کے سینے سے تازہ تازہ خون ابل رہا تھا۔ ایک کرسی پر نواب رشید الزماں بیٹھے ہوئے تھے لیکن وہ رسیوں سے جکڑے ہوئے تھے۔

اچانک ایک آدمی دروازے کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔

یہ پرویز تھا..... پرویز جو پاگل تھا۔ وہی پرویز جو بچوں

کی طرح تتلا تتلا کر بولتا تھا، جو گھٹنوں کے بل چلتا تھا۔ وہ پرویز اس وقت سیدھا کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دودھ کی بوتل کے بجائے پستول تھا اور آنکھوں میں معصومیت کی بجائے سفاکی، درندگی اور وحشیانہ پن رقص کر رہا تھا۔

"دیکھا آپ نے، اس نمک حرام کا انجام؟" پرویز نے لاش کی طرف اشارہ کر کے کہا: "یہ مجھے دھمکی دے رہا تھا کہ جاسوسوں کو میرے متعلق بتا دے گا۔ ہونہہ!"

فریدی کے سارے جسم میں سنسناہٹ پھیل گئی کیونکہ پرویز اس وقت تتلا کر نہیں بول رہا تھا۔

"ہاں تو بھائی صاحب! اب..... آپ بھی مرنے کے لیے تیار ہو جائیے۔" پرویز بولا۔

"میں نے تمہیں ہمیشہ سگے بھائی کی طرح عزیز رکھا۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟" نواب صاحب گڑگڑا کر بولے۔

"کچھ بھی ہو لیکن میں یہ کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا کہ اپنے باپ کے ترکے سے صرف اس لیے محروم کر دیا جاؤں کہ اس نے میری ماں کے ساتھ نکاح نہیں کیا تھا۔"

"کیا میں نے تمہیں کبھی کسی چیز کی کمی محسوس ہونے دی؟" نواب صاحب بولے۔

"میں ان فضولیات میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میں تمہیں ضرور قتل کروں گا۔ جاسوسوں کو پہلے ہی سے تم پر شبہ تھا۔ تمہارا غائب ہو جانا اس شبے کو یقین میں تبدیل کر دے گا۔ تمہاری روپوشی کے بعد تمام جائیداد کا میں پورا پورا مالک ہوں گا۔ غزالہ کے علاوہ اور تمہارا ہے ہی کون جو مجھ سے نمٹنے آئے گا؟"

فریدی نے دروازے کو زور سے دھکا دیا۔ کواڑوں کی جھپٹ میں آ کر پرویز اوندھے منہ گر پڑا۔

فریدی اچھل کر اس پر آ رہا۔ دونوں آپس میں گتھ گئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں پستول دبے ہوئے تھے۔ دفعتاً پرویز فریدی کی گرفت سے نکل کر پھرتی سے ایک صوفے کی آڑ میں ہو گیا۔ فریدی اس کا مطلب سمجھتا تھا۔ اس نے جھپٹ کر ایک میز گرائی اور اس کی اوٹ لے لی۔

دفعتاً فریدی نے چیخ ماری اور گر پڑا۔ پرویز کھڑا ہو گیا۔ وہ آہستہ آہستہ میز کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اچانک ایک فائر ہوا اور پرویز چیخ مار کر گر پڑا۔ فریدی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دشمن کو نیچہ دینے میں کامیاب رہا اور اب اسے تڑپتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ گولی ٹھیک اس کے ماتھے پر لگی تھی۔

"فریدی بیٹا!" نواب صاحب چیخ مار کر بے ہوش ہو گئے۔

☆☆☆

دوسرے دن شام کو نواب صاحب، غزالہ، طارق، فریدی، حمید اور دو سب انسپکٹر ایک ساتھ چائے پی رہے تھے۔

"ایسی تاریک رات میں اس کنوئیں میں اترنا فریدی جیسے دلیر ہی کا کام تھا۔" نواب صاحب بولے۔

"مجھ سے دراصل ذرا سی غلطی ہو گئی، ورنہ اتنی پریشانی نہ اٹھانی پڑتی۔ کھنڈروں والا راستہ زیادہ سیدھا اور آسان تھا جس سے پرویز تہ خانے میں آتا جاتا تھا۔ صرف ذرا سا دماغ پر زور ڈالنا پڑتا۔ اب سوچتا ہوں کہ میں نے اپنا زیادہ وقت کھنڈروں پر ہی کیوں نہ صرف کیا۔" فریدی نے کہا۔

"خیر، جو کچھ بھی ہوا، اچھا ہی ہوا۔" طارق بولا۔

"اس میں تو شبہ نہیں۔" فریدی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

حمید فریدی کے پیچھے آ کر بولا: "آپ نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ کنوئیں سے آگ کس طرح نکلتی تھی؟"

"تم بھی رہے اُلو کے اُلو۔" فریدی مسکرا کر بولا: "ارے میاں! آتش بازی تھی۔ کیا تم نے مٹی کے وہ بڑے بڑے انار نہیں دیکھے جو تہ خانے سے برآمد ہوئے ہیں؟"

"اوہ! واقعی اچھا خاصا بچوں کا کھیل تھا مگر خطرناک۔" حمید نے کہا اور سیٹی بجاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

رانا محمد شاہد

جنہوں نے مشکلات اور رکاوٹوں کا مقابلہ پامردی سے کیا اور ایک مثال قائم کردی

بہادر کرکٹر

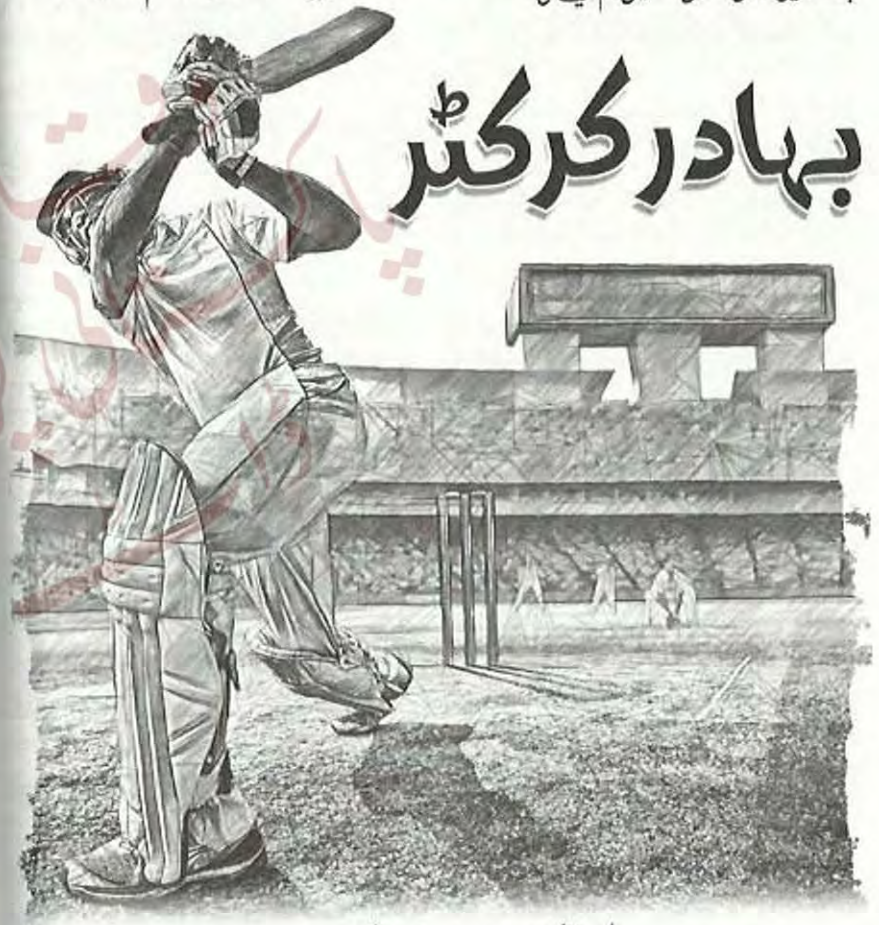

ایک ملک کی قومی ٹیم کا حصہ بننا معمولی بات نہیں چنانچہ ہر کھلاڑی کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ بھرپور صحت وتوانائی کے ساتھ اپنے ملک کے لیے بہترین کھیل پیش کرے۔ اس لیے وہ اپنی بیماری وفٹنس مسائل پر کامل توجہ دیتے ہیں پھر بھی کسی نہ کسی بیماری کا شکار ہو ہی جاتے ہیں۔ اس مضمون میں ہم ایسے ہی

باہمت و بہادر کرکٹرز کا تذکرہ کریں گے جنہوں نے بہادری سے اپنی بیماریوں کا مقابلہ کیا۔ انھیں شکست دی اور اپنے ملک کے لیے بہترین کھیل پیش کیا۔ یوں انھوں نے اپنے بلند حوصلے کی بدولت ایک نئی داستان رقم کی، یقیناً کرکٹ کے اصل ہیرو یہی ہیں۔

منصور علی خان پٹودی

ان کا شمار بھارت کے نامور کرکٹروں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک نواب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے بھارت کی طرف سے ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۵ء تک ۴۶ ٹیسٹ میچ کھیلے جن میں سے ۴۰ میں ٹیم کی قیادت کی۔ اپنے ابتدائی دور میں کار حادثے میں ان کی ایک آنکھ ضائع ہوگئی لیکن ہمت و جذبے کی ایسی مثال قائم کی کہ ایک ماہ بعد وہ نیٹ پر پریکٹس کر رہے تھے۔ ۱۹۶۲ء میں ٹیڈ ڈیکسیر کی ٹیم کے خلاف ایک آنکھ سے سنچری بنا کر انھوں نے منفرد مثال قائم کی۔

سر لین ہٹن

ان کا شمار انگلینڈ کے عظیم بلّے بازوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے ۱۹۳۷ء سے ۱۹۵۵ء تک انگلینڈ کی طرف سے ۷۹ ٹیسٹ میچ کھیلے۔ انھیں وکٹ پر ٹھہرنے کا ہنر آتا تھا۔ اسی وجہ سے بولر انھیں آؤٹ کرنے کے لیے خاصی تگ ودو کرتے تھے۔ لین ہٹن کا ایک بازو نسبتاً کمزور اور دوسرے بازو سے ۲ انچ چھوٹا تھا۔ دراصل ایک بار کمانڈو تربیت لیتے ہوئے ان کا ایک بازو شدید زخمی ہوگیا تھا جس کی وجہ سے وہ ۸ ماہ اسپتال بھی رہے۔ اس کے باوجود سر لین ہٹن نے انگلینڈ کے لیے ایک بلّے باز کے طور پر بہترین کارکردگی دکھائی اور اپنی ایک اننگز میں ۳۶۴ رنز کا مجموعہ بھی بنایا۔ اسے بعد میں سر گیری سوبرز نے ۳۶۵ رنز بنا کر توڑا۔

ڈاکٹر جہانگیر خان

یہ بھارت کی طرف سے چار ٹیسٹ کھیلنے والے مسلمان کھلاڑی تھے۔ انھوں نے ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۶ء تک بھارت کی نمائندگی کی۔ ایک مرتبہ لندن میں کیمبرج میں کھیلتے ہوئے فیلڈنگ کے دوران ڈاکٹر جہانگیر خان کا ہاتھ شدید زخمی ہوگیا۔ زخم کی شدت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ سلپ میں فیلڈنگ کے دوران ان کا سارا جسم بائیں ہاتھ پر آگیا اور پھر اس انگلی کا درد ساری زندگی ان کے ساتھ رہا۔

ٹونی گریگ

معروف برطانوی آل راؤنڈر ٹونی گریگ نے ۱۹۷۲ء سے ۱۹۸۷ء تک انگلینڈ کی طرف سے ۵۸ ٹیسٹ میچ کھیلے۔ ۱۴ سال کی عمر میں وہ ٹینس کورٹ میں گر پڑے۔ تشخیص کے بعد معلوم ہوا کہ وہ مرگی کے مریض ہیں۔ مرگی اعصابی نظام کو کمزور کردیتی ہے۔ اس سے پڑنے والے دوروں سے انسان زمین پر گر جاتا ہے۔

ٹونی دولت مند ہونے کے باوجود اپنے اس مرض سے چھٹکارا نہ پاسکے۔ مگر یہ مرض انھیں بین الاقوامی شہرت کا حامل کھلاڑی بننے سے نہ روک سکا۔ ۱۹۷۵ء میں جب وہ ہیتھرو ائیرپورٹ پر اس مرض کی وجہ سے گرے تو دُنیا کو ان کی بیماری کا علم ہوا۔ بیماری کے باوجود وہ کرکٹ میں نمایاں رہے۔ انھیں کرکٹ کا جنگجو سپاہی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

لارنس روئے

ویسٹ انڈیز سے تعلق رکھنے والے اس بلّے باز نے اپنے پہلے ہی ٹیسٹ میچ میں ڈبل سنچری اسکور کی۔ ان کی اس کارکردگی پر ناقدین کہتے تھے کہ یہ دراز قد کھلاڑی ویسٹ انڈیز کا نام لمبے عرصے تک روشن کرے گا۔ لارنس کو کھیل کے دوران اکثر سر درد اور بخار کی شکایت رہتی۔ لارنس روئے نے ۱۹۷۲ء سے ۱۹۸۰ء تک ویسٹ انڈیز کے لیے ۳۰ ٹیسٹ میچ کھیلے۔

۱۹۷۴ء میں انھوں نے ڈربی شائر کاؤنٹی کی طرف سے

کھیلتے ہوئے رنز کے ڈھیر لگائے مگر سر درد اور بخار کی شکایت مستقل رہنے لگی۔ پھر اس کے ساتھ جلن اور سوزش میں اضافہ ہوگیا۔ لارنس اس کے باوجود کھیلتے رہے۔ دو برس مزید بیت گئے۔ جب یہ مرض شدت اختیار کر گیا اور تشخیص ہوئی تو یہ بات سامنے آئی کہ لارنس کو گھاس سے الرجی ہے جو سیدھی آنکھوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کے باوجود وہ اٹھارہ سال ٹیسٹ کرکٹ کھیلتے رہے۔

وسیم اکرم

اس پاکستانی کا شمار دنیائے کرکٹ کے عظیم آل راؤنڈرز میں ہوتا ہے۔ انھوں نے ۱۹۸۵ء سے ۲۰۰۲ء تک پاکستان کی طرف سے ۱۰۴ ٹیسٹ میچ کھیلے۔ ۱۹۹۷ء میں جب وسیم اکرم کا کیریئر اپنے عروج پر تھا، ویسٹ انڈیز کے خلاف ایک سیریز کے دوران ان کا وزن تیزی سے کم ہونا شروع ہوا۔ وہ اکثر نقاہت کا شکار رہتے۔ ٹیم انتظامیہ کو ان کی ایسی حالت پر تشویش ہوئی۔ مکمل ڈاکٹری معائنے کے بعد شوگر کی تشخیص ہوئی۔

یہ خبر یقیناً خود وسیم اکرم، پاکستانی کرکٹ اور اُن کے پرستاروں کے لیے مایوس کن تھی لیکن وسیم اکرم نے جواں مردی سے لڑنے کا فیصلہ کیا۔ اس میں ان کی بیوی ڈاکٹر ہما اکرم نے بھی کلیدی کردار ادا کیا کیونکہ وہ ماہر نفسیات تھیں۔ وسیم اکرم نے باقاعدگی سے ورزش شروع کی۔ روزانہ انسولین کے تین انجکشن لینا شروع کیے اور خود کو مکمل ڈسپلن میں رکھا۔ اپنی جدوجہد سے وسیم اکرم اس بیماری کے بعد بھی چھ برس تک کرکٹ کے میدان میں راج کرتے رہے۔

چندر شیکھر

بھارت کے معروف اور باصلاحیت اسپنر چندر شیکھر نے ۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۹ء تک ۵۸ ٹیسٹ میچ کھیلے اور ۲۴۲ وکٹیں حاصل کیں۔ یہ وکٹیں اس حوالے سے یقیناً اہمیت کی حامل ہیں کہ جس بازو سے وہ اسپن بولنگ کرواتے تھے، وہ پولیو سے متاثر تھا۔ اس مرض کے باوجود غیر معمولی کارکردگی اُن کی جدوجہد کو ثابت کرتی ہے کہ وہ بھی کرکٹ کے سپاہیوں میں سے تھے۔

جیف بائیکاٹ

کرکٹ اور اپنی کنٹری کے حوالے سے یہ ایک معروف نام ہے۔ ۱۴ سال کی عمر تک ان کی بینائی کمزور ہوتی گئی۔ وہ اکثر اپنی بینائی کی وجہ سے اسپتال جاتے تھے، چنانچہ ڈاکٹروں نے اس عمر میں انھیں عینک تجویز کردی۔ اپنی کاؤنٹی یارک شائر سے کھیلتے ہوئے وہ عینک استعمال کرتے رہے۔ پھر جب قومی ٹیم میں آئے تو لینز استعمال کرنا شروع کیا۔ دلچسپ بات یہ کہ اپنی کمزور بینائی کے باوجود انھوں نے ۱۹۸۶ء میں فرسٹ کلاس سنچری بنائی۔ تب ان کی عمر ۴۶ برس تھی۔

گراہم مینو

اس کھلاڑی کو ۲۰۰۹ء میں آسٹریلوی ٹیم میں شامل کیا گیا۔ اس سے پہلے وہ گزشتہ دس برس سے فرسٹ کلاس کرکٹ کھیل رہے تھے۔ گراہم مینو جب گیارہ سال کے تھے تو ڈاکٹروں نے انھیں بتایا کہ ان کے دل میں سوراخ ہے لیکن اس بڑی بیماری کے باوجود نہ صرف وہ قومی ٹیم کا حصہ بنے بلکہ ۲۰۰۷ء اور ۲۰۰۸ء میں اپنے ملک کی نیشنل بائیک ریس میں بھی حصہ لیا اور ۹۶۰ میل کا فاصلہ طے کر کے چندہ اکٹھا کیا۔ بعد ازاں یہ رقم ایک ایسے ادارے کو دے دی جو دل کے امراض کی تحقیقات کر رہا تھا۔

یووراج سنگھ

بھارت کے معروف اور جارح مزاج بلّے باز یووراج سنگھ نے ۴۰ ٹیسٹ میچز میں بھارت کی نمائندگی کی۔ چند سال قبل تک وہ پھیپھڑوں کے سرطان کی تکلیف کا شکار تھے لیکن اس کے باوجود انھوں نے بھارت کے لیے بھرپور کرکٹ کھیلی اور عمدہ کارکردگی دکھائی۔ ◆◆◆

مزاح

عابد معز

بیوی کی سوتن

جو زندگی کے غموں سے نجات دِلا کر شوہر نامدار کو سیر و تفریح کرانے لے جاتی ہے

صبح آنکھ کھلنے پر ہر شریف شوہر کی آنکھ بیوی کی آنکھ سے ملتی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ لڑتی ہے۔ ازدواجی زندگی میں ہر صبح کوئی نہ کوئی ایسا مسئلہ درپیش رہتا ہے جس پر شوہر اور بیوی کی آنکھیں 'لڑ پڑتی' ہیں۔ ان کے درمیان ایک نئی صبح کا آغاز اس قدیم لڑائی سے ہوتا ہے جو آدم اور حوا کے جانشینوں کے درمیان روزِ اول سے چلی آرہی ہے۔

قمیص کا بٹن نہ ٹانکنے پر بہتان..... ''کتنے دن سے ٹوٹے بٹن والی شرٹ پہن کر دفتر جا رہا ہوں۔ لوگ سوچتے ہوں گے کہ میں نے کس پھوہڑ سے شادی کی ہے۔''

راشن ختم ہونے پر سوال..... ''چاول ختم ہو چکے، اب کیا میں خود چولہے پر چڑھ جاؤں؟''

''ہمارا تعلق آدم خور خاندان سے نہیں ہے۔ اس لیے آپ کی قربانی کی ضرورت نہیں۔'' جواباً لڑائی کا آغاز ہوگیا۔

اسکول کی فیس نہ دینے پر شکایت۔

''آج اگر منے کے اسکول کی فیس نہیں دی

گئی تو اسے اودھم مچانے کے لیے گھر بھیج دیا جائے گا، پھر گھر کا کام کاج کیسے ہوگا؟''

ٹفن ساتھ نہ لے جانے پر طنز...... ''گھر کا کھانا پسند نہیں آرہا۔ ہوٹل میں مزے ہو رہے ہوں گے۔''

''جی نہیں، بات یہ نہیں۔ وقت پر ٹفن دیا ہوتا تو یوں فضول پیسے خرچ نہ ہوتے!'' جوابی وار ہوتا ہے۔

''کل رات آپ میری بات سنتے ہوئے سو گئے تھے۔ میں سنیے...... سنیے...... کرتی رہ گئی۔ کیا دفتر میں سونے کا موقع نہیں ملا؟''

آج صبح بھی ہماری آنکھیں کھلتے ہی بیوی کی آنکھوں سے لڑ پڑیں۔ انھوں نے ہر دن کی طرح غمِ روزگار کا رونا رونے کے بجائے ایک عجیب و غریب شکایت کی۔ ''پچھلے چند دن سے میں محسوس کر رہی ہوں کہ گھر میں آپ کی پہلے جیسی دلچسپی نہیں رہی۔ شام میں دوستوں کے ساتھ وقت گزار کر تھکے تھکائے گھر آتے ہیں۔ دو چار نوالے زہر مار کرتے ہیں۔ کچھ دیر منہ پھلائے بیٹھے رہتے ہیں کہ وہ آتی ہے اور آپ اس کے پیچھے ہو لیے۔ گھر والوں سے کچھ پوچھا اور نہ ہی ان سے کچھ سنا۔ پپو کا ہوم ورک دھرے کا دھرا رہ گیا۔ منی کی رپورٹ بھی نہیں دیکھی۔ صرف ایک مضمون میں پاس ہوئی ہے''۔

''ہم ہیں کہ آپ کو صبح دفتر روانہ کرنے کے بعد سے ارمان لیے بیٹھے ہیں کہ کب صاحب بہادر آئیں گے۔ انھیں پیٹ بھر کھلا کر جی بھر کر باتیں کریں گے۔ دن تمام کی تھکن اتاریں گے۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی کا ماتم کریں گے لیکن وہ آئی کہ آپ غائب! ہمارے ارمان دھرے کے دھرے رہ گئے۔ میں ایک بات کہنے کے لیے پندرہ دن سے سوچ رہی ہوں لیکن وہ موقع دے تب ناں......'' بیوی کی شکایتی داستان جاری رہتی اگر ہم نے ٹوکا نہ ہوتا۔ ''اچھا بابا کہو۔ پندرہ دن سے نہ کہی ہوئی بات پندرہ مرتبہ کہو۔''

بیوی ہمیں زیر کرنے کے بعد قریب کھسکتے ہوئے خوشامدی لہجے میں بولی: ''پچھلی جمعرات کو میں اور چھوٹی بھابی ان کی بڑی بھابی کے چچازاد بھائی کے سالے کی لڑکی کی شادی میں گئے تھے۔ آپ کو یاد ہے نا؟''

ہم نے ناگواری سے جواب دیا: ''ہاں اکثر بیگانوں کی شادی میں آپ لوگ فیشن کی روش دیکھنے جاتی ہیں۔ کس نے کیسی ساڑی پہنی ہے؟ کس کا زیور کیسا ہے؟ کس نے کیسا میک اپ کیا ہے؟ پچھلی ملاقات کے بعد سے کس نے کتنے نئے زیور خریدے اور کپڑے بنوائے ہیں اور پھر گھر آکر شوہر سے مطالبہ کرنا کہ مجھے ایسی ساڑی چاہیے، ویسا زیور چاہیے۔''

ہمارا تیر نشانے پر لگا۔ بیوی ناراض ہو کر کہنے لگیں: ''ہم نے بے چارے شوہروں کی ناک میں دم کر رکھا ہے؟'' ہمارا منہ تو صرف فرمائشوں کے لیے کھلتا ہے؟ کیا آپ نے کبھی سوچا ہے، ہم ہوٹلنگ نہیں کرتے، سہیلیوں کے ساتھ فلمیں نہیں دیکھتے، بلامقصد ادھر ادھر نہیں گھومتے! کبھی کبھار کپڑے اور زیور کی فرمائش کرتے ہیں سو وہ بھی ناگوار گزرتا ہے۔ شاید اسی لیے آپ ہم سے پیچھا چھڑانے اس کے آتے ہی غائب ہو جاتے ہیں۔''

ہم نے بیوی کو منانے کے لیے کہا: ''ہم کب کہتے ہیں کہ بیویاں بے جا فرمائشیں کرتی ہیں۔ آپ کی فرمائشیں حق بجانب ہوتی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ آپ کے اکثر مطالبات ہم شوہروں کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں۔ شوہر بے چارہ کیا کرے؟ تمام دن کولھو کے بیل کی طرح کام کر کے شام کو گھر آیا نہیں کہ بیوی کے مطالبات کی فہرست پیش ہوگئی۔ خوش کرنے کے لیے دو ایک پیار بھری باتیں کیں، چائے پلائی اور اپنا مدعا پیش کیا کہ عید کے لیے کپڑے چاہئیں، آپا کے لڑکے کی شادی میں شرکت کے لیے نیا زیور چاہیے، وغیرہ وغیرہ۔''

''اس کے برخلاف وہ آتی ہے تو راحت ملتی ہے۔ پچھلے ہفتے کی بات ہے۔ ہم گرمی سے پریشان، پسینے میں شرابور تھے۔ ہمارے ہونٹ اور منہ خشک تھے۔ ہم نڈھال پڑ گئے تھے کہ وہ آئی اور ہمیں کشمیر کی وادیوں کی سیر کو لے گئی۔ برف سے ڈھکے پہاڑ، نیلے آسمان پر کہیں کہیں سفید بادل کے

ٹکڑے۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ ہم گرم کوٹ پہنے، ایک ہاتھ میں بلیک کافی کا مگ اور دوسرے ہاتھ میں بھنے کاجو اور سر پر کن ٹوپ، اس کیٹنگ کے لیے تیار......''

بیوی نے ہمیں کشمیر کی وادیوں کا لطف اٹھانے نہ دیا اور ہمیں بیچ میں روک کر سوال کیا: ''میں کہاں تھی؟''

ہم نے کچھ دیر سوچ کر کہا: ''پتا نہیں! لیکن قیاس اغلب ہے کہ آپ گھر میں تھیں۔ پڑوس کی عورتیں جمع تھیں۔ پھٹے کپڑے سیتے، بٹن ٹانکتے اور ترکاری چنتے ہوئے ایک دوسرے کی شکایتوں میں مگن تھیں۔''

بیوی کو یوں ہمارا موج مستی کرنا پسند نہ آیا، روٹھتے ہوئے کہا: ''اسی لیے مجھے وہ سوت لگتی ہے۔ جی جلانے روز آجاتی ہے۔ کبھی آپ کو وہ کلب اور ناچ گانے کی محفل میں بھی ساتھ لے گئی ہوگی!'' ہم نے کان پکڑ کر گال پیٹتے ہوئے کہا: ''نہیں بیگم، وہ ہمیں ایسی جگہوں پر مطلق نہیں لے جاتی۔''

ہم نے سفید جھوٹ بولا، حالانکہ وہ ہمیں کم سن اور خوبصورت حسیناؤں کے پاس تقریباً روز ہی لے جاتی تھی۔ ان سے مل کر ہم بہت خوش ہوتے۔ کل ہی کا واقعہ ہے۔ دفتر سے ہم مثل پروانہ سیدھے شمع کے گھر پہنچے۔ سن سولہ کے قریب، کھلتا ہوا رنگ، کتابی چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں جن میں ہمارا انتظار تھا۔ ہمارے استقبال کے لیے شمع دروازے میں موجود تھی۔ جوش ملیح آبادی کے ادائے سلام کی تفسیر بن کر اس نے ہمیں سلام کیا۔

شاعرانہ سلام کے بعد ہمارے ہاتھ سے بیگ لیا اور ہمیں باتھ روم میں دھکیل دیا۔ نہا دھو کر گلفام بنے باہر آئے۔ شمع چائے کی میز پر ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ مخروطی انگلیوں سے چائے بنا کر پیش کی۔ ہم نے چائے پی اور شمع کے ساتھ بانہوں میں بانہیں ڈال کر چہل قدمی کے لیے چل دیے۔

اس رنگین منظر کے برخلاف ہماری بیوی کا رویہ ملاحظہ فرمائیے۔ ہم دفتر سے تھکے ماندے گھر لوٹتے ہیں۔ تھک اس لیے جاتے ہیں کہ ہمیں گھر میں آرام نہیں ملتا اور دفتر میں باس سونے نہیں دیتا۔ گھر لوٹنے پر دروازہ کھلا ملتا ہے۔ متوسط طبقے کے گھروں میں چرانے کے لیے عزت کے علاوہ کوئی اور قیمتی چیز نہیں ہوتی۔ قدموں کی آہٹ سن کر کہیں سے بیوی کی آواز آتی ہے۔ ''آگئے!''

ہمیں محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارے آنے کی امید نہ تھی۔ ابھی ہم سوچتے ہی رہے ہوتے ہیں کہ خوش آمدید کہنے کا یہ کیسا انداز ہے، بیوی باورچی خانے سے برآمد ہو بچے کو اپنی گود سے ہماری گود میں منتقل کر ''سنبھالیے اپنی اولاد کو''، طنز کا تیر چلا کر یہ جا، وہ جا۔ ابھی ہم سنبھلنے بھی نہیں پاتے کہ مزید چند بچے اِدھر اُدھر سے نمودار ہو کر ہمیں نرغے میں لے لیتے ہیں۔ کوئی میووں کا طالب ہے تو کوئی بسکٹ اور چاکلیٹ کے لیے رو رہا ہے۔ ڈرا دھمکا کر بچوں کو بھگایا اور گود کے بچے کو واپس کرنے بیوی کی تلاش میں نکلے۔ بیوی کو پانی کے نل کے پاس کپڑوں کے ڈھیر میں غرق پایا۔ بیوی کے منع کرنے کے باوجود گود میں سے بچے کو اتارا اور انھیں سونپا۔

بیوی بھلا کہاں نچلی بیٹھنے والی تھیں۔ سانسیں درست ہی کی تھیں اور دو گھونٹ پانی پیا ہی تھا کہ بیوی نے اشیائے صرف کی فہرست تھما کر باہر کا راستہ دکھا دیا۔ بھلا یہ بھی کوئی شریکِ زندگی کا طرزِ حیات ہے! کیا ہم شوہر اور بیوی صرف اس لیے ہیں کہ راشن لائیں، کپڑے دھوئیں، بچے پیدا کریں اور ان کی پرورش کریں؟

ہم اپنے آپ پر افسوس کا اظہار کرنے کے لیے دو منٹ خاموش رہے۔ بیوی نے خاموشی توڑی: ''جب آپ اس کے پاس ہوتے ہیں تو کیا میں بھی کبھی آپ کے ساتھ ہوتی ہوں؟''

ہم نے سچ کہا: ''کیوں نہیں بیگم۔ آپ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو ہمارے ساتھ ہوتی ہیں۔ آپ اور ہم شاپنگ کرتے ہیں بلکہ یوں کہیے کہ آپ شاپنگ کرتی ہیں اور ہم آپ کی خدمت کرتے ہیں۔ صبح بازار کھلنے سے رات بند ہونے تک آپ شاپنگ کرتی ہیں۔ آپ کی ہر خواہش پر ہمارا دم نکلنے کے بجائے اسے پوری کرنے کے لیے ہماری جیب میں ڈھیر سارے پیسے اور چند چیک ہوتے ہیں۔ کپڑوں کی خریداری پر ہم نے ہزاروں روپے ادا کر دیے، اف تک نہ کی۔ آپ نے

ہمہ اقسام کے زیور خریدے اور ہم نے خوشی خوشی بل ادا کر دیا۔

بھاؤ تاؤ کرنے میں آپ نے وقت گنوایا۔ ہم نے ٹوکا تو آپ نے اسراف پر لیکچر دیا۔ کئی دکانیں گھوم پھر کر آپ نے وہی پہلی جگہ سے خریداری کی۔ ہم نے شکایت کی تو آپ نے اسے ٹھوک بجا کر خریدنے کا گر کہا۔ ہم خاموش رہے۔ غرض شام میں دکان، دکان پھر کر اور پیکٹ اور تھیلیوں بلکہ تھیلوں کا بوجھ ڈھو کر تھکے ماندے گھر پہنچے۔ گھر پہنچنے کے بعد ستانے کے بجائے آپ نے پیکٹ کھول کر دیکھنا شروع کیا۔ زیور پہن کر خوش ہوئیں۔ ایک پیکٹ سے پتا چلا کہ ساڑی کا میچنگ بلاؤز دکان میں چھوٹ گیا ہے۔ آپ نے ہمیں الٹے پیر بازار دوڑایا۔"

"آپ نے بہت اچھا خواب دیکھا۔ ایسی میری قسمت صرف خواب ہی میں ہو سکتی ہے۔" بیوی نے اپنی رائے دے کر کہا۔ "آپ کے اس خواب کو آگے بڑھاتے ہیں۔ کیا آپ سیدھے گھر سے دکان گئے؟"

"سچ کہنے پر آپ خفا تو نہ ہوں گی؟" ہم نے استفسار کیا۔ بیوی نے فلسفیانہ انداز میں جواب دیا: "ہر کوئی سچ کہنے کے لیے کہتا ہے لیکن سچ سننا کوئی گوارا نہیں کرتا لیکن آپ صرف سچ کہیے۔ مجھے سچ کہنا اور سننا دونوں پسند ہیں۔"

"تو پھر سنیے"۔ ہم نے سچ کہا۔ "آپ کا پیکٹ اٹھائے ہم اپنے دوست کے پاس پہنچے۔ انھیں ساتھ لے کر ریسٹورنٹ گئے۔ وہاں تھکن اتاری۔ پیٹ بھرا۔ گپ شپ کی اور گھر واپس آ کر آپ کو بتایا کہ دکان بند ہو چکی۔"

سچ بات سن کر بیوی کو غصہ آیا، کہنے لگیں: "آپ کو بس دوست احباب اور وہ چاہیے۔ جب بھی موقع ملے آپ ان کے ساتھ ہوا ہو جاتے ہیں۔"

"آپ صحیح فرماتی ہیں۔" بیوی کا الزام ہم نے بخوشی قبول کیا۔ یہ حقیقت بھی ہے۔ دوستوں اور اس کے یہاں ہمارے مسائل کا حل تو نہیں ہے لیکن ان سے فرار ضرور ہے۔ دوستوں کے ساتھ ہم اپنی مشکلات اور مصائب کو بالائے طاق رکھ کر ادب، آرٹ اور سیاست جیسے موضوعات پر گھنٹوں بحث اور مباحث میں الجھ جاتے ہیں لیکن دوستوں سے زیادہ وہ ہماری ہمدرد، غم گسار اور بہی خواہ ہے۔ جب بھی ہم پریشان ہوتے ہیں وہ ہمارا سر سہلاتے ہوئے آتی ہے۔ آنکھیں خود بخود بند ہونے لگتی ہیں۔ پھر کوئی مسئلہ درپیش رہتا ہے اور نہ ہی کوئی سوال۔

ہماری حالت کی ترجمانی حضرت میر کے اس شعر سے ہوتی ہے

وہ آئے بزم میں اتنا تو میر نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

وہ بہت پیاری، معصوم اور میٹھی ہے۔ اس کی آغوش میں پہنچ کر ہم دنیا سے بے خبر ہو جاتے اور اپنی ایک خیالی دنیا آباد کر لیتے ہیں۔ بستر سے اٹھنے کے بعد سے اس کا انتظار رہتا ہے۔ بعض اوقات وہ جلد آتی تو بعض مرتبہ بہت انتظار کرواتی ہے۔ کبھی بے وفائی بھی کرتی ہے۔ نہیں آتی تو اس کی جدائی بے چین کر دیتی ہے۔ طبیعت بوجھل ہو جاتی ہے۔ گھنٹوں تڑپانے کے بعد جب وہ آتی ہے تو پھر ایک نشہ سا طاری ہو جاتا ہے۔

ہماری کئی خواہشات اور ارمانوں کو اس نے پورا کیا ہے۔ دن تمام سرکاری بس میں پسینا بہاتے پھرتے ہیں لیکن اس کی آغوش میں پہنچ کر ایئر کنڈیشنڈ کار میں گھومنے کا ارمان پورا کرتے ہیں۔ صبح سے شام تک دفتر میں کئی صفحات کالے کرتے ہیں لیکن اس کی سنگت میں ہم صرف چیک پر دستخط کرتے ہیں۔ کئی افسروں کی ماتحتی میں کام کرتے ہیں۔ ان کا ہر حکم بجالاتے ہیں لیکن اس کے بل بوتے نوکروں کی فوج پر حکم چلاتے ہیں۔ بھوکے پیٹ اس سے ملنے کے بعد عالیشان ہوٹل میں مرغ و ماہی تناول کرتے ہیں۔

کیا آپ نے اندازہ لگایا، ہماری "وہ" کون ہے اور بقول ہماری بیوی کے وہ آتے ہی ہم گول بلکہ گل ہو جاتے ہیں۔

"وہ" نیند ہے۔ غم روزگار کا مداوا۔ ہمارے اور آپ کے مسائل سے فرار بلکہ بیشتر مسائل کا حل نیند ہی تو ہے۔

بیوی کی شکایت سننے اور ان سے بحث میں الجھنے کے بعد ہم نے ان سے سوال کیا: "بیگم کیوں ہم پر اس کے ساتھ رنگ رلیاں منانے کا الزام رکھتی ہیں۔ جب وہ آپ کے پاس آتی ہے، کیا آپ بھی اس کے پیچھے نہیں ہو جاتیں؟" ◆◆◆

صبا عمران

بسگام کی قربانی

جنگل کے دو مہیب ترین درندوں کے درمیان جب سنسنی خیز لڑائی ہوئی

"آپ" کے ملازم چندر اور میں نے خود اُسے دیکھا ہے۔ جیسے ہی ہم سستانے جنگل کے درمیان واقع فقیر سائیں کے مزار پر رُکے، بندروں نے یکدم شور مچانا شروع کر دیا اور مور چیختا ہوا اُڑ کر نالے کے پار چلا گیا۔ ہم چونکنے ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے کہ دائیں طرف سے وہ آتا دکھائی دیا۔ وہ اتنا بڑا تھا کہ سب شیروں کا سردار دِکھتا تھا۔" قصبے کا شکاری علی، شکار کی غرض سے نربدا (بھارت) آئے ہوئے میجر اور مجھے اپنی رُوداد سنا رہا تھا کہ اُس نے آج ہی قدرتی علاقے میں ایک نہایت شاندار شیر دیکھا ہے۔

شکار کی غرض سے آیا ہوا ہمارا گروہ پوری طرح مسلح تھا۔ ہمارے پاس ہاتھی، بندوقیں، بطور چارا استعمال کے لیے جانور، شکاری چاقو غرض وہ سب کچھ تھا جو شیر کے شکار کے لیے لازم و ملزوم سمجھا جاتا ہے۔ اُس رات ہم خیمے کے باہر بیٹھے شیروں کی خونریزی، سفاکی اور اُن کی بے پناہ طاقت کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ تبھی میجر نے بتایا کہ شیر ہاتھی کو مار سکتا ہے۔ وہ اُسے اُس جگہ پر کاٹتا ہے جہاں ہاتھی کے شکاری نیزے اور تلوار سے گھاؤ لگاتے ہیں جس سے ہاتھی ادھ موا ہو جاتا ہے۔ اُس کے لفظوں میں ایک انہونی کی پیشین گوئی تھی جسے ہم اُس وقت نہیں سمجھ سکے۔

بھارت میں شیر کا شکار اپریل سے شروع ہو کر مون سون تک جاری رہتا ہے کیونکہ اس دوران شدید گرمی کے باعث چشمے، ندیاں اور نالے سب سوکھ جاتے ہیں۔ جنگلی جانور اپنے مسکن چھوڑ کر پہاڑی چوٹیوں کے دامن اور نچلی جگہوں پر موجود پانی کے ذخیروں کے قریب اپنا مسکن بنا لیتے ہیں۔

شیر سورج کی حدت برداشت نہیں کر سکتا اور پیاس بھی،

سو وہ سوکھی گھاٹیوں اور غاروں میں چھپتا پھرتا اور رات کے مقابلے دن میں کافی سُست ہو جاتا ہے۔ اسی لیے شکاریوں کو اگر اُس کی کچھار بھی مل جائے تو وہ سورج کے پوری طرح نکلنے کا انتظار کرتے اور پھر حملہ کرتے ہیں۔ شیر اپنے تمام شکاریوں کے ساتھ ایک جیسا رویہ نہیں دکھاتے، کچھ چھُپ جاتے، کچھ چکما دے کر بھاگ جاتے تو کچھ جوابی حملہ کرتے ہیں اور بعض اسی وقت حملہ آور ہوتے ہیں جب زخمی ہو جائیں۔

ہم نے مقامی کھوجیوں کی خدمات بھی حاصل کر لی تھیں۔ اُس روز دن کے دس بجے تھے جب ہمارے ایک کھوجی نے جو قصبے کے شکاری علی کے ساتھ شیر کی تلاش میں نکلا تھا، ہمیں قریبی علاقے میں شیر کی موجودگی کی اطلاع دی۔ ہم نے فوراً تیاری پکڑی اور ہاتھیوں کا معائنہ کیا۔ یہ ہم روز ہی کرتے تھے تاکہ اُن کے جسم پر ڈولی کے وزن اور رسیوں سے کوئی زخم نہ بن گیا ہو۔ جنگلی ہاتھی کے زخم جلد بھر جاتے ہیں چاہے جتنے بھی گہرے ہوں مگر پالتو ہاتھی کو لگا ہوا معمولی زخم بھی سنجیدہ صورتحال اختیار کر لیتا ہے اگر اس کی مناسب دیکھ بھال نہ کی جائے۔

ہم نے اپنی رائفلیں صاف کیں۔ ڈھیروں کارتوس بیگ میں ڈالے اور سفر کا آغاز کیا۔ بڑی بڑی گھاس کے تپتے ہوئے میدانوں سے گزر کر جب ہم جنگل میں داخل ہوئے تو وہاں زندگی کے کوئی آثار نہ تھے۔ سخت گرمی میں دن کے وقت ہمیشہ جنگل ایسا ہی ہوتا ہے۔ ندی نالے سب سوکھے پڑے تھے۔ ایک بہت بڑا پرانا درخت بھی ٹوٹا پڑا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے ہم کسی تباہ شدہ پرانے شہر میں آ گئے ہیں۔ ہم نے پانی کے ذخیرے کے قریب پہنچ کر ہانکا شروع کروا دیا کیونکہ ہمارے کھوجی کے مطابق شیر وہیں کہیں قریب ہی تھا۔ باجوں، ڈھول اور تاشوں کا شور بلند ہونے لگا۔ ایسے عالم میں ہاتھیوں پر بالکل بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ جب اُن کی اپنی جان کو خطرہ ہوتا ہے تو وہ اس قدر بے چین اور پریشان ہوتے ہیں جیسے کوئی ہسٹریائی عورت..... اُن کے رویے کے متعلق کچھ بھی قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ وہ شیر کے حملے پر حملہ بھی کر دیتے اور مڑ کر پیچھے والوں کو روندتے فرار بھی ہو سکتے ہیں۔ اسی لیے اُن کی تربیت میں مہینوں لگ جاتے ہیں۔

ہمارے کھوجی ہم سے آگے چل رہے تھے۔ ابھی ہم نالے کے قریب پہنچے ہی تھے کہ نالے کے کنارے کھڑا بارہ سنگھا ایک دم بھاگ اُٹھا۔ بندر شاخوں میں چھپ گئے اور مور اُڑ کر دور چلا گیا۔ ہم نے اُن سب کو دیکھا مگر جس کی تلاش تھی وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

ہمارے ایک کھوجی نے دور سے ایک جھاڑی کی طرف اشارہ کیا کہ شیر اس میں ہے۔ اچانک اُس کے پاؤں کے نیچے شاید کوئی شاخ آ کر ٹوٹ گئی اور شیر چوکنا ہو گیا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے جھاڑی سے نکلا اور کھوجی کو دبوچ لیا۔ شیر نے پوری قوت سے اُس کے پھیپھڑوں میں پنجے گاڑ دیے۔

میں چلایا: ''جلدی آگے بڑھو''۔ مہاوت نے ہاتھی کو اشارہ کیا اور وہ ہر چیز کو روندتا آگے بڑھنے لگا۔ میجر پہلے پہنچا اور نشانہ باندھ کر گولی چلا دی۔ شیر کی خوفناک اور درد بھری غراہٹ گونجی اور پھر ہم نے اُسے بھاگتے دیکھا۔ وہ کھوجی کو وہیں چھوڑ گیا تھا۔ ہم قریب پہنچے تو اُس کا جسم جھٹکے کھا رہا تھا۔ وہ تڑپ رہا تھا جیسے آخری ہچکیاں لے رہا ہو۔ دوسرا کھوجی درخت کے ساتھ لگا کھڑا سکتے کی سی حالت میں اُسے دیکھ رہا تھا۔ جب کہ تیسرا پہلے والے کی حالت دیکھ کر بے ہوش ہو گیا تھا۔

ہم نے اُن دونوں کھوجیوں کے اوسان بحال ہونے کا انتظار کیا اور پھر انھیں اپنے زخمی ساتھی کو لے کر گاؤں واپس جانے کا کہا۔ ویسے بھی اب اُن کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ خون کی ایک لکیر ہماری راہنمائی کر رہی تھی۔ شیر کے زخم نے اُس

کی ساری چالاکی ختم کر دی تھی۔ ہم لکیر کے تعاقب میں آدھ میل ہی دور گئے تھے کہ میرا ہاتھی رُک گیا اور درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف سونڈ سے اشارہ کرتے ہوئے پیچھے ہٹنے لگا۔ اگر مہاوت اُسے نہ روکتا تو وہ بھاگ جاتا۔

میجر کا ہاتھی بھی پیچھے ہٹنے لگا مگر مہاوت نے اُسے قابو میں کیے رکھا پھر میجر چلایا: ''اب ان ہاتھیوں کو روکنا مشکل ہے، وہ دیکھو شیر آ رہا ہے۔''

شیر درختوں کے جھنڈ سے نکل کر بھاگتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا۔ اُس کی دم کھڑی اور آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ طیش اور غصّے سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ میں اور میجر دونوں نشانہ باندھ رہے تھے کہ میرا ہاتھی خوفزدہ ہو کر چنگھاڑتا ہوا نیچے گھاٹی میں اُترنے لگا۔ میں اور مہاوت ہاتھی کے بھاگنے سے گر گئے جب کہ ڈولی مضبوطی سے اپنی جگہ بندھی رہی۔ شیر قریب آ رہا تھا۔ ہم دونوں جلدی سے قریبی درخت پر چڑھ گئے۔ اس دوران میجر گولی چلا چکا تھا۔ شیر دوبارہ جھاڑیوں میں جا کر چھپ گیا۔

بسگام ہاتھی جس پر میجر سوار تھا، نہایت دلیر ثابت ہوا۔ اُس کا مہاوت اُسے شاباشی دے رہا تھا۔ وہ اسے تھپکیاں دے کر اُس کا حوصلہ بڑھا رہا تھا اور دوسروں کو اُن کی بزدلی پر ملامت کر رہا تھا: ''تم میرا سب کچھ ہو بسگام، میرے راجے شاباش..... ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ تم اس شیر سے ڈر کر بھاگ جاتے..... تم بہت دلیر ہو..... تم اور بزدلی..... توبہ توبہ استغفار۔''

اُس نے بسگام کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ وہ جھاڑیوں سے چند گز ہی دور تھا کہ شیر نے یکدم وہاں سے نکل کر ہاتھی پر حملہ کر دیا۔ وہ اس کے سر پر چڑھ گیا اور اپنے دانت گاڑ دیے۔ خوفزدہ ہاتھی زور زور سے اپنا سر ہلانے لگا تاکہ شیر کو ہٹا سکے مگر وہ نہیں ہٹا۔ ہاتھی کے ہلنے سے ڈولی بُری طرح جھول رہی تھی۔ میجر نے گولی چلائی مگر اُس کا نشانہ خطا گیا۔ گولی کی آواز سے شیر کی گرفت لمحہ بھر کو ڈھیلی ضرور پڑی اور وہ نیچے گر گیا۔

اب پاگل ہوتے ہوئے شیر نے ہاتھی کی پچھلی ٹانگ میں اپنے دانت گاڑ دیے۔ بسگام درد سے چنگھاڑتا ہوا نیچے بیٹھ گیا۔ وہ شیر کو کچل دینا چاہتا تھا مگر چالاک شیر پیچھے ہٹ گیا اور ایک بار پھر ہاتھی کے سر پر حملہ کر دیا۔ اس کی حرکت اتنی تیز تھی کہ میجر فائر نہ کر سکا۔ میں جس درخت پر تھا، وہاں سے بھی نشانہ ٹھیک نہیں بندھ رہا تھا۔ میجر درمیان میں حائل ہو رہا تھا۔

شیر نے پھر ہاتھی کی ٹانگ چھوڑی اور اُس کی سونڈ میں اپنے نوکیلے دانت گاڑ دیے۔ ہاتھی جیسے تڑپ ہی اُٹھا۔ وہ بُری طرح ہلنے لگا اور زمین پر لیٹ گیا۔ اب میجر نے شیر کے سر کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ صد شکر کہ گولی نشانے پر لگی اور شیر ٹھنڈا ہو گیا۔ یہ ایک نہایت شاندار شیر تھا اور اُس نے خوب لڑائی لڑی تھی۔ اُس کی لاش اُٹھانے کے لیے جب دوسرے ہاتھی کو لایا گیا تو مرے ہوئے شیر کو دیکھ کر ہی اُس پر ہسٹریا کے دورے پڑنے لگے۔ یہ بسگام ہی تھا جو اتنا دلیر ثابت ہوا اور اپنی جان پر کھیل گیا۔

ہم گاؤں واپس آ گئے اور بسگام کی مرہم پٹی کر دی گئی۔ بے شک وہ آج کے دن کا ہیرو تھا۔ شیر کے دانتوں نے اُس کا سر، کندھے، ٹانگیں اور سونڈ بری طرح چیر پھاڑ ڈالی تھی۔ اس کے زخموں سے خون نہیں رُک رہا تھا اور پٹی بار بار گیلی ہو جاتی۔ اُس کی آنکھیں بند ہوئے جاتی تھیں اور جسم کانپ رہا تھا۔

اگلے دن دوپہر سے پہلے مہاوت روتا ہوا آیا اور اُس نے اطلاع دی کہ بسگام مر گیا۔ ہمیں بہت افسوس ہوا۔ یہ واقعہ میری شکاری زندگی کے اُن نایاب واقعات میں سے ایک ہے جن میں ایک ہاتھی شیر کے ہاتھوں مارا گیا۔ ◆◆◆

سَر کٹا انسان

موسیٰ رضا: ترجمہ: شاہ محی الحق فاروقی

ترنیتار ایک ایسا غیر معروف مقام ہے کہ (بھارتی) گجرات کے عام نقشوں میں تو اس کا کوئی نشان بھی نہیں مل سکتا لیکن جن دنوں کی میں بات کر رہا ہوں، تب وہ جگہ جزیرہ نمائے سوراشٹر میں خاصی مشہور تھی۔ ہر سال ساون کے مہینے میں ترنیتار میں ایک لوک میلا (عوامی میلا) لگتا تھا جس میں شرکت کرنے کے لیے جزیرہ نما کے اندر سو سو میل دور سے لوگ آتے تھے۔ روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ راجا دروپد نے اپنی مشہور بیٹی کا سوئمبر یہیں رچایا تھا اور مہابھارت کے ہیرو 'ارجن' نے اسی سوئمبر میں تیر اندازی کا مظاہرہ کیا تھا۔

ایک بھارتی سرکاری افسر کی پیشہ ورانہ زندگی میں پیش آئے سنسنی خیز اور حیران کُن واقعات

ضلع کے مقامی افسروں اور اہلکاروں کی معمولی مدد کے ساتھ میلے کے منتظمین بڑی بڑی چرخیاں، جھولے اور ہنڈولے لگاتے۔ تیر اندازی اور قسمت آزمائی کے اسٹال قائم کرتے جو سادہ مزاج اور بے تکلف دیہاتیوں کی دلچسپی اور انھیں میلے میں کھینچ لانے کا باعث بنتے۔

ترنیتار کا میلا سیدھا سادا دیہاتی میلا تھا جہاں کسان زرعی آلات اور کیمیاوی کھاد بھی خریدتے تھے۔ بہترین نسل کے بیل تلاش کرتے اور پگڑی کے لیے لال رنگ کے کپڑوں کا مول بھاؤ کر لیتے۔ ان کی بیویاں اپنی چولیوں اور پیٹی کوٹ کے لیے رنگ برنگ کے کپڑے خریدتیں اور شیشے کی چمک دار چوڑیوں کی قیمتوں پر تکرار کرتی تھیں۔ گاؤں کی گوریاں جھنڈ کی جھنڈ اس میلے میں آتیں، آپس میں کھی کھی، کھی کھی کرتیں۔ ربط ضبط بھی بڑھائے جاتے اور البیلا نوجوان اپنی محبوبہ کو گودنے والے کی دکان پر لے جا کر اس

کے بازو پر اپنا نام گدوا تا۔ میلے میں عوامی موسیقی کے مظاہرے ہوتے۔ ڈھول کی تال پر رقص ہوتے۔ کوئی بھی اس اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا جس کا مظاہرہ شہر کے لوگ دیہاتی ماحول میں کرتے ہیں۔ ہر شخص وہاں خوش رہتا اور خوش نظر آتا بھی تھا۔

یہ میلا تین دن تک رہتا اور ان تین دنوں میں ہزاروں دیہاتی اسے دیکھنے آتے۔ مویشی تبدیل کیے جاتے، مٹھائیوں کی دکانوں پر جلیبی وغیرہ جیسی مختلف اقسام کی مٹھائیاں خوب بکتی تھیں۔ مقامی معاملت دار نے جب تھان گڑھ میں، جہاں میں دورے پر آیا ہوا تھا مجھے یہ میلا دیکھنے کی دعوت دی تو میں نے بیگم اور بچوں کے ساتھ یہ میلا دیکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

جوں ہی ہم میلے کے قریب پہنچے تو پیدل چلنے والوں اور بیل گاڑیوں کی وجہ سے سڑک تقریباً بند ہو چکی تھی۔ ہزاروں دیہاتی واپس آ رہے تھے۔ آنے جانے والے مجمع نے جیپ کے لیے راستہ ناممکن بنا دیا تھا لہٰذا ہمیں اتر کر پیدل چلنا پڑا۔ گرمی اور گرد کی وجہ سے ماحول زیادہ تکلیف دہ ہو رہا تھا۔ میلے کے اصل میدان میں پہنچ جانے کے بعد ہی ہمیں کچھ سکون ملا۔

ہم نے سوراشٹر کے تمام مویشی دیکھے، کاٹھیاواڑی گھوڑوں کا معائنہ کیا۔ تقریباً ہر دکان پر تھوڑی دیر کے لیے رکے اور کچھ جلیبیاں خریدیں۔ جب ہم ایک کنارے دکان لگائے ہوئے نجومی کو اپنا ہاتھ دکھا کر اپنے آنے والے حالات کے بارے میں خوش خبریاں سن چکے تو ہم نے واپسی کا فیصلہ کیا۔

ابھی ہم واپسی والے پھاٹک کے پاس پہنچے ہی تھے کہ میں نے ایک پھٹا ہوا خیمہ دیکھا جس نے غالباً انگریزوں کے زمانے میں اچھے دن دیکھے ہوں گے۔ کثرت استعمال سے خیمے کی رسیاں گھس چکی تھیں اور موگری کی چوٹ کھا کھا کر اس کی میخوں کا اوپری حصہ پھسل چکا تھا۔ قدرے سیاہ رنگ کا ایک شخص جس کی عمر تیس سال سے کچھ اوپر ہوگی، اس پردے کے پاس کھڑا تھا جو خیمے کے دروازے کا کام دے رہا تھا۔

وہ ایک خوش مزاج آدمی لگتا تھا۔ اس کے ہونٹوں کے کناروں پر ایک مسکراہٹ مستقل بنیادوں پر پھیلی تھی۔ بال بغیر کنگھی کے اور دن بھر کی پڑی ہوئی گرد نے انھیں تقریباً سفید کر دیا تھا۔ وہ خاکی ڈرل کی قمیص پہنے ہوئے تھا جو غالباً فوجی اسٹور کی مسترد شدہ ہوگی۔ قمیص کا کپڑا ابھی خیمے ہی کی طرح خستہ حال ہو چکا تھا۔ اس کی ایک جیب غائب ہو چکی تھی اور بہت سے بٹن بھی کم ہو چکے تھے۔ ہر لحاظ سے وہ ایک غریب دیہاتی معلوم ہو رہا تھا جس نے شہر کے مسترد کپڑوں کے عوض اپنا روایتی لباس اتار پھینکا تھا۔

جوں ہی اس نے مجھے سرکاری اہلکاروں اور پولیس کے جوانوں کے جھنڈ میں چلتے دیکھا اسے یقین ہو گیا کہ کچھ گاہک آ گئے، چنانچہ اس نے آوازیں لگانی شروع کر دیں: ''آیئے صاحب جی، آیئے، آیئے، براہ کرم، آیئے۔ آیئے اور بغیر سر والے آدمی کو دیکھیے۔ آیئے صاحب جی، بغیر جسم والے آدمی کو باتیں کرتے ہوئے سنیے۔ صاحب جی، یہ ایسی حیرت انگیز چیز ہے جو آپ نے پہلے کبھی نہیں دیکھی ہوگی اور نہ میرے خیمے کے علاوہ اسے کہیں اور دیکھ سکیں گے۔ صاحب جی، میں غریب آدمی ہوں۔ اگر آپ آ جائیں گے تو میری قسمت کھل جائے گی۔ اگر آپ آ جائیں گے تو پھر بہت سے لوگ میرا یہ کمال دیکھنے آئیں گے۔ میں آپ کا دیا ہوا سرٹیفکیٹ ان لوگوں کو دکھاؤں گا۔ آیئے صاحب، آیئے، براہ کرم، ضرور آیئے''۔

ایمانداری کی بات یہ ہے کہ میلے کی بھیڑ بھکڑ میں تپتی دھوپ میں گھوم پھر اور کوئی دو کلو گرام گرد و غبار پھانک کر اب ہم مزید کوئی تماشا دیکھنے کے لائق نہیں رہ گئے تھے خواہ وہ بے سر والا ہو یا سر والا۔ اس کے علاوہ میں ایسے چلتے پھرتے شعبدہ باز بہت دیکھ چکا تھا جو گلی کوچوں میں طرح طرح کے شعبدے دکھاتے پھرتے ہیں۔ وہ اپنے منہ سے زندہ کالا بچھو اگلنے کے علاوہ ریت کے تودے سے پلک جھپکتے میں آم کے درخت اگا دیتے ہیں۔ کوئی بھی ذہین آدمی جو پیدائشی بھولا

بھالا نہ ہو ذرا سا غور سے دیکھ کر اس طریقے کو سمجھ سکتا ہے جس سے وہ شعبدہ دکھایا جاتا ہے، یعنی شعبدہ باز کا ہاتھ کتنی تیزی سے چلتا ہے اور وہ پوری چرب زبانی کے ساتھ بہت تیز لہجے میں پٹر پٹر بولتے دیکھنے والے کی توجہ عین وقت پر کیسے ادھر ادھر بانٹ دیتا ہے۔

یہ سوچ کر میں نے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا لیکن وہ کرتبی انسان میرا پیچھا چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا۔ وہ تقریباً میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ مسلسل خوشامد کر رہا تھا یہاں تک کہ میرا دل پسیج گیا۔ میں نے سوچا کہ میرے چند منٹ ضائع ہوں گے لیکن یہ شخص کتنا خوش ہو جائے گا!

''اور یہاں داخلہ فیس کتنی ہے؟'' میں نے پوچھا

''نہیں، صاحب جی، آپ کے لیے کوئی فیس نہیں۔ نہ آپ کی نہ آپ کے ساتھ کسی کے لیے کوئی فیس ہے۔ بالکل مفت ہے، صاحب جی۔ مہربانی کر کے آجائیے''۔

''نہیں، مجھے افسوس ہے۔ بغیر فیس دیے نہ میں جاؤں گا اور نہ میرے ساتھیوں میں سے کوئی جائے گا۔ تم مجھے فیس بتاؤ ورنہ ہم لوگ چلے جا رہے ہیں''۔

میری یہ قطعی شرط سننے کے بعد اس کرتبی آدمی نے جھجکتے ہوئے چار آنے فی کس فیس بتائی۔ ان دنوں میں بھی یہ فیس بہت حقیر تھی لہٰذا ہم دے کر اندر چلے گئے۔ خیمے کا رقبہ آٹھ مربع فٹ سے زیادہ نہ تھا۔ اندر سے بھی وہ اتنا ہی خستہ حال تھا جتنا باہر سے نظر آ رہا تھا۔

جوں ہی ہم خیمے میں داخل ہوئے میری نظریں وسط میں چبوترے پر قائم ایک انسانی سر پر پڑیں۔ کوئی جسم اس سر سے ملحق نہیں تھا۔ خود چبوترہ بھی بانس کی چار کھپچیوں پر قائم تھا۔ اس کی بلندی کوئی چار فٹ تھی۔ وہ زمین سے چار کونوں پر اٹھا ہوا تھا جن کے درمیان تین فٹ کا فاصلہ تھا۔ اس کے اونچے والے حصے پر بانس کی چار کھپچیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہر طرف بانس ہی کی تیلیاں آڑی ترچھی لگا کر اسے مضبوط کر دیا گیا تھا۔ جہاں یہ تیلیاں ایک دوسرے کو قطع کر رہی تھیں، آٹھ مربع انچ کا ایک تختہ لگا ہوا تھا۔ اس تختے پر ایک انسانی سر رکھا ہوا تھا جسے مٹی سے پلاسٹر کر کے جہاں گردن ختم ہوتی تھی وہاں تختے سے پیوست کر دیا گیا تھا۔

تختے کے نیچے خالی جگہ تھی اور کوئی شخص بھی دوسری طرف کھڑے ہوئے تمام لوگوں کو چاروں کھپچیوں کے ذریعے دیکھ سکتا تھا۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر بغیر سر کا ایک جسم پڑا تھا جو چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ سر کٹی ہوئی گردن پر مٹی کا پلاسٹر کیا ہوا تھا۔ میں نے ''مردہ جسم'' کی زیادہ فکر نہیں کی کیونکہ اصلی سر کو کسی چادر کے نیچے چھپا کر سر کے اوپر موزوں مسالے سے گردن بنا دینا اور اصلی سر چھپا کر دھوکا دینا آسان تھا۔ میری ساری توجہ خیمے کے درمیان بورڈ پر رکھے ہوئے انسانی سر پر تھی کیونکہ یہ انسانی سر زندہ تھا۔

ہم جوں ہی خیمے میں داخل ہوئے اس سر نے ہمیں اس طرح دیکھا کہ ہم لوگوں کی نظریں آپس میں ملیں۔ اس کے بعد وہ یوں مسکرانے لگا کہ سفید دانتوں کی دونوں قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ میں بدحواس ہو گیا بلکہ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں کہ خوف کے مارے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میری تھرتھری چھوٹ گئی۔

وہ کرتبی شخص بھی ہم لوگوں کے ساتھ ہی خیمے میں داخل ہوا اور اس نے سر کو مخاطب کر کے کہا: ''بڑے صاحب آئے ہیں اور بہت سے صاحب لوگ بھی ان کے ساتھ آئے ہیں۔ ان سب کو سلام کر، اے بے سر کے آدمی''۔

یہ سنتے ہی چادر کے نیچے والے جسم نے ''نمستے'' کے انداز میں اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے۔ ساتھ ہی سر نے اپنا منہ کھول کر کہا: ''نمستے''۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ دونوں آپس میں ملے ہوئے ہوں۔ بلا جسم والے سر سے نکلنے والی آواز سن کر میرے سر کے بال جڑ سے کھڑے ہو گئے۔

''ہمارے خیمے میں خوش آمدید، صاحب جی۔ میرا سلام قبول کیجیے۔ میں معزز خاتون یعنی آپ کی بیگم صاحبہ کو بھی خوش

آمدید کہتا ہوں''۔ سر نے یہ جملے کہے جب کہ اس کی آنکھیں کونے میں کھڑی حسن آرا کی طرف مڑ گئیں۔

''اور میرا اسلام آپ کے چھوٹے بچے کو بھی''۔ اس سر کی نظریں ڈگمگا ڈگمگا کر چلنے والے میرے چھوٹے بچے پر پڑیں جس کا سر بورڈ کی سطح سے نیچے تھا۔

میری نظریں جو دیکھ رہی تھیں اسے میری عقل ماننے سے انکار کرتی تھی۔ کسی سر کو اس کے جسم سے علیحدہ کر کے اسے کسی بورڈ پر کیسے رکھا جا سکتا ہے جب کہ وہ زندہ بھی رہے، مسکرا بھی سکے، اپنی پلکیں اٹھا کر لوگوں کی نظروں سے نظریں بھی ملائے اور اپنی نظریں ان لوگوں پر قائم بھی رکھے، جن سے وہ باتیں کر رہا ہو بلکہ ہر وہ فعل انجام دے جو کسی جسم سے لگا ہوا سر دے سکتا ہو، لہٰذا جو کچھ میری آنکھیں دیکھ رہی تھیں میں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ میں اس کرتبی شخص کی طرف مڑا اور اس سے پوچھا: ''یہ کرتب کیا ہے؟ یہ سر کیسے بولتا ہے؟''

''نہیں صاحب جی، یہ کوئی کرتب نہیں جادو ہے۔ اپنے جادو کی قوت سے میں نے اپنے اسسٹنٹ کا سر کاٹ کر اسے بورڈ پر رکھ دیا ہے۔ جب شام ہو گی تو میں اسے دوبارہ اس کے جسم کے ساتھ لگا دوں گا۔ پھر ہم دونوں گھر چلے جائیں گے''۔

ظاہر ہے مجھے اس کی بات پر یقین نہیں آیا چونکہ ہلتے ہوئے ہونٹوں سے آواز صاف سنائی دے رہی تھی لہٰذا یہ انتقال آواز کا کرتب بھی ہو سکتا تھا یعنی وہ کرتبی آدمی اپنی ہی آواز سر کی جانب اس طرح پھینک رہا تھا کہ وہ وہیں سے آتی محسوس ہوتی تھی۔ میں نے یہ سوچ کر غور سے سر کی طرف دیکھا کہ یہ یقیناً کسی قسم کا دھوکا ہے۔ میں نے اپنی انگلیوں سے اس کے گال کو چھوا تو وہ گرم تھا اور اس سے پسینا نکل رہا تھا۔

سر اور خیمے میں کسی جگہ کے درمیان کسی قسم کا تار یا پائپ نہیں جا رہا تھا۔ میں نے کرتبی شخص سے اس کی چھڑی مانگ کر چبوترے کے نیچے اور اس کے درمیان میں یہ دیکھنے کے لیے گھمائی کہ خالی جگہ کا تاثر کہیں نظر کا دھوکا تو نہیں کہ جسم نیچے چھپا ہوا ہو۔ میں یہ پڑھ چکا تھا کہ اسٹیج پر اس قسم کا کرتب آئینوں کی مدد سے کیا جاتا تھا لیکن وہاں تو کوئی اسٹیج نہیں تھا اور میں بے جسم والے سر سے مشکل سے دو فٹ کے فاصلے پر اس انداز میں کھڑا تھا کہ ہم دونوں کی نظریں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔

میں نے سوچا کہ اگر یہ کوئی کرتب تھا تو چار آنے فیس لینے والے ایک سیدھے سادے غریب اور ان پڑھ دیہاتی کو اتنے وسائل کہاں سے حاصل ہوتے کہ وہ پلاسٹک کا ایک ایسا سر بناتا جس کے اندر کمپیوٹر کے کنٹرول اس طرح نصب ہوتے کہ وہ آنکھوں کی پتلیوں اور اپنے دوسرے عضلات کو حرکت کی ہدایت دے سکتا اور انسانی آواز میں سوالوں کے جواب دے سکتا لہٰذا مجھے اس امکان کو رد کرنا پڑا۔

ہم سب نے اس چبوترے کا ایک بار نہیں بار بار چکر لگایا، چبوترے میں لگی ہوئی بانس کی تمام کھپچیوں اور ہر کونے پر بندھی رسیوں کو جھک جھک کر غور سے دیکھا مگر ایسا کوئی نشان نہ مل سکا جس سے یہ معلوم ہوتا کہ اگر یہ جادو نہیں تو پھر یہ کام کیسے کیا گیا؟ آخر کار میں نے اس کرتبی آدمی کو ایک تصدیق نامہ دے ہی دیا جس میں تسلیم کیا گیا کہ میں نے ایسی تعجب انگیز چیز دیکھی جس کی میں کوئی عقلی توجیہہ پیش نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد ہم اس خیمے سے رخصت ہو گئے۔

چند سال بعد مجھے بتایا گیا کہ ترنتیار کا میلا عوامی میلے کی حیثیت سے ختم ہو چکا۔ اسے محکمہ سیاحت نے لے لیا ہے اور اب میرے زمانے کے غریب اور سیدھے سادے دیہاتیوں کے بجائے شہری اور غیر ملکی سیاح اسے دیکھنے آتے ہیں، لیکن میں اب بھی سوچتا ہوں کہ وہ کرتبی آدمی جو اب ساٹھ سال سے اوپر کا ہو گا، کیا اب بھی وہیں اپنے پھٹے پرانے خیمے اور بغیر جسم کے سر کے ساتھ موجود ہو گا؟

بہر حال ترنتیار اب تک میری یادداشت میں اس ایک کرتب کی وجہ سے محفوظ ہے جس کی کوئی توجیہہ میں آج تک پیش نہ کر سکا۔ جب کبھی مجھے یہ انوکھا واقعہ یاد آئے تو ساتھ ہی اپنی جوانی کے دنوں کا ایک اور ایسا ہی ماجرا ذہن میں گھومنے

لگتا ہے۔

اس وقت میں رادھن پور کا ایس، ڈی، ایم تھا۔ میرے علاقے سے دور دراز ''دیفر'' برادری کے لوگ آباد تھے۔ یہ مخلوط النسل لوگ ہیں۔ ان میں مختلف تناسب میں سندھی، عرب، پٹھان اور رابری نسل کی خصوصیات کا امتزاج موجود ہے۔ یہ لوگ اپنے مخصوص مذہب کی پیروی کرتے جس کی خاص بات یہ ہے کہ یہ لوگ بزرگوں اور قبروں میں بڑا گہرا اعتقاد رکھتے ہیں۔ ان کی رہائش جس علاقے میں ہے وہ کسی حد تک ریگستانی، پتھریلا اور زیادہ تر بنجر ہے۔ اگر کہیں تھوڑا بہت پانی مل جائے تو دیفر وہاں کچھ معمولی کاشت کر لیتے۔ اس کے علاوہ وہ اپنی لحمیاتی خوراک کے لیے جانوروں کا شکار کرتے۔

اس علاقے کے بنجر ہونے اور دوسرے ناموافق جغرافیائی حالات کی وجہ سے دیفروں کو اتنی محنت کرنی پڑتی کہ وہ بڑے تنومند اور جفاکش ہو گئے۔ وہ عموماً بہت اچھے شہسوار ہوتے اور مجھے بتایا گیا کہ یہ لوگ نوابوں کی فوجوں میں شریک ہو کر اعلیٰ قسم کی جنگ جوئی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ جب انگریز ہندوستان کے مالک بن گئے اور دیسی ریاستوں کی فوجیں سبک دوش ہو گئیں تو دیفروں کو اپنی روزی تلاش کرنے کی ضرورت آن پڑی۔ ان کی ملازمت کا اہم ذریعہ ختم ہو گیا اور اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے بنجر پتھریلی زمین میں امکانات انھیں مدھم نظر آنے لگے تو وہ ڈاکو اور مویشی چور بن گئے۔

ان میں سے بعض لوگ اپنے ناقابل رسائی علاقے سے نکلتے، پہلے سے نشان زدہ کسی گاؤں پر رات کے وقت حملہ کرتے اور جو جانور بھی ہاتھ لگ جاتے وہ انھیں چھین لیتے۔ جو زیادہ بہادر ہوتے وہ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شاہراہوں پر ڈاکے ڈال کر مسافروں کو لوٹتے اور ادھر ادھر ڈکیتیاں ڈالتے۔ وہ کسی خوف و خطرے کے بغیر یہ کام کرتے کیونکہ جوں ہی اپنے علاقے میں دوبارہ داخل ہو جاتے تو پھر ان کا تعاقب کرنا مشکل ہو جاتا۔

ان کا علاقہ اتنا پتھریلا اور ریتیلا تھا کہ اس میں کسی قسم کی موٹر گاڑی داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس علاقے میں صرف اونٹ یا گھوڑے کے ذریعے سفر کیا جا سکتا تھا لیکن جہاں تک ان دونوں جانوروں کا معاملہ تھا تو ان میں دیفروں سے بہتر اور کون ہو سکتا تھا؟ جوں ہی کوئی دیفر کسی گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا یا اونٹ پر سوار ہوا تو اسے گرفتار کرنا ناممکن ہو جاتا۔ ان جانوروں کی سواری میں پولیس کا آدمی بھی کسی دیفر کو شکست نہیں دے سکتا تھا۔

نوابوں کی حکومت کے زمانے میں جب کبھی ڈاکا تکلیف دہ صورت اختیار کر لیتا تو نواب خود ایک مہم جو فوج اپنی راہنمائی میں تیار کرتا اور گھڑ سواروں کے دستے دیفروں کے دیہاتوں پر حملہ کرنے کے لیے بھیج دیے جاتے۔ وہاں پہنچ کر یہ دستے چند دیہاتوں کو تہس نہس کر دیتے اور مجرموں کے ساتھ معصوموں کو بھی سزا دیتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ کچھ دن کے لیے لوٹ مار کا سلسلہ بند ہو جاتا لیکن آزادی کے بعد اس طریقے کو ترک کرنا پڑا۔ ایک آئینی حکومت جو قانون کی پابند ہو، قرون وسطیٰ کے جلد بازی والے طریقوں پر عمل نہیں کر سکتی لہٰذا اب مہماتی فوجوں کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان مسائل کو زیادہ قانونی طور پر حل کرنے کے لیے ہم مجبور ہو گئے، لیکن قانونی ذرائع اور جمہوری عمل میں وقت لگتا ہے اور لوگ صبر اور انتظار نہیں کر سکتے۔

چناں چہ حکومت کے پاس شکایتیں پہنچنے لگیں اور مجھے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی جانب سے چند سخت قسم کے تہدید نامے موصول ہوئے۔ ڈی ایم نے مجھ پر الزام لگایا کہ میں آرام سے بیٹھا ہوں اور کچھ نہیں کر رہا جب کہ دیفر میرے سب ڈویژن میں طوفان مچائے ہوئے ہیں حالانکہ یہ الزام صحیح نہیں تھا۔ میں نے دو مرتبہ پولیس پارٹیاں بھیجی تھیں لیکن دونوں بار وہ لوگ خالی ہاتھ واپس آ گئے کیونکہ مجرم پکڑے نہیں جا سکے۔

آخر میں نے طے کیا کہ اب وقت آ گیا ہے، میں معاملات

خود اپنے ہاتھ میں لوں، دیفر ڈاکوؤں سے خود گفت و کر کے کسی فیصلے پر پہنچوں۔ میں نے محسوس کیا کہ جب تک فساد کی اصل جڑ یعنی غربت اور بیکاری کو دور نہیں کیا جاتا دیفر اپنے پڑوسیوں کے جسموں میں کانٹے بنے رہیں گے۔ مجھے بتایا گیا کہ دیفروں سے عقل کی بات فضول ہے کیونکہ وہ لوگ صرف اسی قسم کی قوت تسلیم کرتے ہیں جس کا مظاہرہ پرانے زمانوں میں نواب کیا کرتے تھے۔ میرے بعض مشیروں نے مجھے یہ مشورہ بھی دیا کہ دیفروں کو شکست دینے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ان پر چڑھائی کر کے ان کے چند دیہات جلا دیے جائیں، خاص طور سے اس وقت جب دیفر وہاں موجود ہوں۔ بعض لوگوں نے کہا کہ دیفر اتنے خطرناک لوگ ہیں کہ اگر میں معقول فوج کے بغیر ان کے علاقے میں گیا تو وہ مجھے نہیں بخشیں گے۔

بہر حال یہ تمام مشورے سن کر میں نے چند آدمیوں کو درمیان میں ڈال کر دیفروں سے گفت و شنید شروع کی۔ ان کا ابتدائی ردعمل سخت منفی تھا اور وہ مجھ سے ملنے پر آمادہ نہیں تھے۔ بہر حال قدرے ترغیب و تحریص کے بعد ایک سمجھوتا ہو گیا کہ میں زیادہ سے زیادہ دو ساتھیوں کے ہمراہ جاؤں اور دیفروں کے لیڈر مجھ سے ڈنگر پور نامی گاؤں میں ملاقات کریں گے۔ شروع میں تو میرے پولیس چیف یعنی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے اس تجویز کو قطعی مسترد کر دیا۔ اس نے کہا کہ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ مجھے صرف دو ساتھیوں کے ہمراہ ڈاکوؤں کے غار میں بھیج دیا جائے۔

میں نے کہا کہ دوسری صورت میں چند دیہات کو زمین دوز کر دینے کے علاوہ اور کوئی طریقہ بھی نہیں اگر کوئی ہے تو وہ مجھے بتائیں، چنانچہ ڈی ایس پی کو بھی مجھ سے اتفاق کرنا پڑا۔ میں اپنے معاملت دار اور اس علاقے کے سب سے سخت سب انسپکٹر کے ہمراہ ڈنگر پور روانہ ہو گیا۔

ڈنگر پور پہنچنے کے لیے ہمارے پاس پوری ہدایت موجود تھی۔ راستے کی نشانیوں کی کمی بیشی کے خطرے کی بنا پر میری خواہش یہ تھی کہ میں اپنے پاس قطب نما رکھ لوں لیکن معاملت دار کو راستے کے بارے میں اپنی عقل پر پورا اعتماد تھا۔ اُدھر انسپکٹر بھالا کو اپنے دماغ سے زیادہ اپنی جسمانی قوت پر بھروسا تھا۔ دراصل دماغی قوت اس کے پاس تھی ہی کم لہٰذا وہ اس کا استعمال بھی کم کرتا تھا۔ ہم نے جھاڑیوں، ٹیلوں اور پہاڑیوں سے گزرتے ہوئے چند ایک ریگستانی میدانوں کو پار کیا اور دوپہر کے وقت ببول کے معمولی سایوں کے نیچے اپنے گھوڑے کھڑے کر کے قدرے آرام کیا۔ گرمی اتنی سخت تھی کہ ہم پسینے سے شرابور ہو گئے۔ ہم نے راستے میں ملنے والے چند ایک دیہاتیوں سے ڈنگر پور کا فاصلہ پوچھا۔ سب نے ہمیں یقین دلایا کہ بس دو کھیت کے فاصلے پر۔ تقریباً غروب آفتاب کے وقت ہم ڈنگر پور پہنچ گئے جس میں معاملت دار کے شعور راہ سے زیادہ اتفاق کو دخل تھا۔

گاؤں سے ایک میل پہلے تقریباً ایک درجن دیفر لیڈروں نے ہمارا استقبال کیا۔ اپنی جھاڑی دار مونچھوں، نوکیلی ناکوں اور بڑی سی سیاہ پگڑیوں کی بنا پر وہ لوگ ظاہری شکل و شباہت میں بڑے خطرناک نظر آ رہے تھے لیکن سلام دعا میں ان کا انداز دوستانہ تھا۔ ہم نے خود کو درجن سے کچھ اوپر بہادر قسم کے جنگجو گھڑ سواروں کے درمیان پایا۔ اس طرح ان مجرموں کے ساتھ ہماری پارٹی ڈنگر پور کی جانب روانہ ہوئی۔ گاؤں کے قریب میں نے ایک ٹیلا دیکھا جس پر چھوٹا سا سفید مقبرہ تھا اور اس کے اوپر ایک گنبد تھا۔ گنبد پر ہرے رنگ کا ایک جھنڈا لہرا رہا تھا۔ غور خان (دیفروں کے لیڈر) نے مجھے بتایا کہ وہاں ایک بہت بڑے بزرگ دفن ہیں اور ان کے احترام میں ہم سب کو گھوڑے سے اتر کر گاؤں تک پیدل جانا ہوگا۔ دیفروں کے ایک لیڈر، شوکت خان نے اس بات پر اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ بزرگ کو یہ بات پسند نہیں ہے کہ کوئی شخص گھوڑے پر بیٹھ کر ان کے مقبرے کے سامنے سے گزرے چونکہ میں دیفروں سے گفت و شنید کے لیے آیا تھا لہٰذا میں نے حکمت اسی میں سمجھی کہ ان لوگوں کی بات مان لوں لیکن تنومند سب انسپکٹر بھالا ایسے توہمات کا قائل نہیں تھا۔

"اگر ہم نہیں اتریں گے تو کیا ہوگا؟" اس نے پوچھا
"ہماری یادداشت میں اب تک کوئی شخص گھوڑے پر بیٹھ کر اس سڑک سے نہیں گزرا، تھانیدار صاحب۔" غور خان نے جواب دیا "میرے والد نے مجھے بتایا تھا کہ ایک مرتبہ ایک گورا صاحب (انگریز) نے ان کی رائے ماننے سے انکار کر دیا اور گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے بیٹھے اس نے سڑک پار کرنے کی کوشش کی۔ وہ جوں ہی مقبرے کے سامنے آیا گھوڑے نے اسے پھینک دیا اور اسے خاصی چوٹ آئی۔ یہ بزرگ اپنی توہین برداشت نہیں کرتے۔"

"احمق"۔ انسپکٹر جھالا نے کہا: "میں اس قسم کے توہمات پر یقین نہیں رکھتا۔ میں تمھیں دکھاؤں گا کہ یہ سب بوڑھی عورتوں کی کہانیاں ہیں۔"

یہ کہتے ہی، اور قبل اس کے کہ میں مداخلت کر پاتا، انسپکٹر جھالا نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی جس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ میں نے انسپکٹر جھالا کو روکنا چاہا اور وہ بھی صرف سیاسی مصلحت کی بنا پر نہ کہ اس کی شہسواری کی صلاحیت میں کسی عدم اعتماد کی بنا پر! مجھے معلوم تھا کہ وہ شہسواری کے مظاہرے میں گزشتہ پانچ سال سے مسلسل صوبائی تمغہ جیت رہا تھا۔

سب انسپکٹر جھالا کا گھوڑا قدرے آہستہ انداز میں دوڑ رہا تھا لیکن جوں ہی وہ مقبرے کے سامنے پہنچا وہ اچانک ہنہنایا اور پچھلے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے اس نے انسپکٹر جھالا کو نیچے پھینک دیا اور پھر خاموشی کے ساتھ وہیں کھڑا ہو گیا۔ ہم سب انسپکٹر جھالا کی طرف دوڑے۔ ہمیں یہ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ زخمی نہ ہو گیا ہو۔ خوش قسمتی سے گھوڑا سرپٹ نہیں بھاگ رہا تھا لہٰذا گرنے سے انسپکٹر کو چند معمولی زخم آئے لیکن اس کے غرور کو لگنے والا زخم زیادہ سنگین تھا۔ وہ بھی لوگوں کے ساتھ پیدل چل پڑا۔ وہ خاموش اور کسی حد تک دبا دبا سا تھا۔ ہم سب نے گاؤں کا رخ کیا۔

دیفروں کے ساتھ ہونے والی گفتگو کی تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں۔ بات چیت کے بعد اس رات بہت مزیدار کھانا کھایا گیا۔ خاص کھانا ہرن کا (جسے یقیناً غیر قانونی طور پر شکار کیا گیا ہوگا) بھنا ہوا گوشت اور کلیجی تھی۔ معاہدہ قطعی طور پر دوسرے دن شام تک جا کر طے ہو سکا۔ دیفروں کو ایک بہت بڑے علاقے میں آباد کرنے کا فیصلہ ہوا جہاں وہ کاشت کر سکیں اور پولیس کی بہتر نگرانی میں رہیں۔ ہم اپنے مقصد میں کامیاب تکمیل کے بعد رادھن پور واپس آئے۔ مزید گفت و شنید کے لیے انسپکٹر جھالا اس کے بعد کئی مرتبہ ڈنگر پور گیا اور اس نے مجھ سے کہا:

"سر، پہلی بار گرنے کے بعد مجھے یقین نہیں تھا کہ اس میں کسی بزرگ کی کوئی کرامت ہے لہٰذا تین چار مرتبہ پھر جب میں وہاں گیا تو میں نے اپنی ہنرمندی کا امتحان لینے کی کوشش کی لیکن سر، لعنت ہو مجھ پر، جب بھی میں نے اس جگہ کو گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے پار کرنے کی کوشش کی، میں گر گیا۔ اس سے کوئی بحث نہیں کہ گھوڑا سرپٹ دوڑ رہا تھا، دلکی بھاگ رہا تھا یا صرف آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ چال کوئی بھی ہو، گھوڑا جھجکتا تھا، میری گرفت کمزور پڑ جاتی اور میں زمین پر گر جاتا تھا۔ سر، آپ اس بارے میں کیا کہیں گے؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے کئی طریقوں سے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔ یہ کہ میری رائے میں پہلی بار گرنے کے بعد نفسیاتی طور پر اس کی یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ جب بھی اس نے کوشش کی، اسے خوف آتا تھا اور غالباً تحت الشعوری طور پر وہ اپنا خوف گھوڑے تک پہنچا دیتا۔ اسی لیے جب وہ مقبرے کے سامنے پہنچتا تو گھوڑا اسے پھینک دیتا تھا لیکن جھالا ان باتوں سے اتفاق نہ کرتا۔ صاف بات یہ ہے کہ خود میں بھی ایسی باتوں سے مطمئن نہیں تھا۔ ترنیتار کے کرتبی آدمی کی طرح یہ بھی میرے لیے ایک پراسرار راز ہے جس کی کوئی توجیہہ میں اب تک پیش نہیں کر سکا۔

(موسیٰ رضا بھارت کے سابق اعلیٰ سرکاری افسر ہیں۔ وہ کئی عہدوں پہ فائز رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی آپ بیتی لکھی جس سے زیر نظر واقعہ لیا گیا ہے) ◆◆◆

ڈاکٹر جاوید اقبال

سردی سے بچانے والے ٹوٹکے

موسم سرما سے مخصوص قدرتی اشیا کے خواص

سردیاں شروع ہوتے ہی بہت سے امراض بھی جنم لیتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جو انسانی قوتِ مدافعت کی کمزوری یا شدید سردی کے اثرات برداشت نہ کرنے کے سبب چمٹتے ہیں۔ اس موسم میں خشک میوہ جات قدرت کا انمول تحفہ ہیں۔ یہ خوش ذائقہ ہونے کے ساتھ ساتھ بے شمار طبی فوائد کے حامل ہوتے ہیں جو سردیوں میں انسانی جسم کی قوتِ مدافعت بڑھا کر موسمی بیماریوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرتے ہیں۔

سرما کی بیماریوں سے نجات کے لیے گھریلو استعمال کی عام اشیاء کے خواص درجِ ذیل ہیں:

☆ نہاتے وقت ایک بالٹی پانی میں ایک چمچ سرسوں کا پاؤڈر ڈال دینے سے بچوں اور بڑوں کو سردی کا اثر نہیں ہوگا۔

☆ سردیوں میں جلد کو چکنا اور چمکدار بنانے کے لیے زیتون کے تیل کا مساج مؤثر ہے۔ اس تیل میں شامل چکنائی جلد کی کھوئی ہوئی نمی واپس لانے میں مدد دیتی ہے۔

☆ موسمِ سرما میں عموماً ہونٹ پھٹنے کی شکایت ہر دو جنس میں ہوتی ہے۔ پھٹے ہونٹ درست کرنے کے لیے پانچ گرام مکھن میں ایک گرام نمک اچھی طرح ملا لیں۔ یہ مرکب کچھ دن تک روزانہ رات کو سوتے وقت ہونٹوں پر لگا دیں تو ان کا پھٹنا ختم ہوگا اور وہ نرم و ملائم ہو جائیں گے۔

☆ ہاتھ پاؤں سوج جائیں، سوجن نمایاں ہو اور خارش ہوتی ہو تو سرسوں کا تیل گرم کر کے اس میں تھوڑا سا نمک ڈال دیں۔ پھر اس تیل سے ہلکے ہاتھوں سے متاثرہ حصوں پر مالش کریں۔ کچھ ہی دیر میں افاقہ ہو جائے گا۔

☆ سردیوں میں عموماً ایڑیاں پھٹ جاتی ہیں۔ اس سے نجات کے لیے ایک چمچ تازہ مکھن اور ایک چمچ شہد آپس میں ملا کر یکجا کر لیں۔ یہ آمیزہ روزانہ رات پیروں پر لگا کر اوپر

شاپر چڑھا، جرابیں پہن لیں۔ دس پندرہ دن لگاتار اس عمل سے پاؤں بچوں کی طرح نرم و ملائم ہو جائیں گے۔ اسی مقصد کے لیے عرق گلاب میں گلیسرین ڈال کر لگائیں تب بھی بہت جلد شفایابی ہو جاتی ہے۔

☆ سردیوں کا بہترین ٹانک: رات کو سوتے وقت ایک چمچ روغن بادام ایک گلاس نیم گرم دُودھ میں ڈال کر نوش کیجیے۔

☆ بچوں کو ٹھنڈ سے بچانے کے لیے حسب ضرورت سرسوں کے تیل میں اجوائن نصف چمچ، تین عدد لہسن کے جوئے ڈال کر اتنا پکائیں کہ دانے کالے پڑ جائیں۔ اب اس تیل کو بوتل میں محفوظ کر لیں۔ جب محسوس کریں کہ بچے کو ٹھنڈ لگ گئی ہے تو اس تیل سے سینے پر مالش کریں۔ بہت جلد آرام آجائے گا۔

☆ موسم سرما کی کھانسی، گلے کی خرابی، سینے کی جکڑن اور ٹھنڈ کے اثرات رفع کرنے کے لیے لونگ پر تھوڑا سا نمک لگا کر چوسا جائے تو بہت جلد شفایابی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح باغی دمے میں مریض کا کھانس کھانس کر بُرا حال ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں لونگ بہترین علاج ہے۔ اس مقصد کے لیے لونگ کے پانچ دانے اُبال کر چھان لیں اور اس میں ایک چمچ شہد ملا کر مریض کو پلائیں۔

☆ ایک پاؤ دُودھ میں تین سے پانچ چھوہارے اور چلغوزے کوٹ اور جوش دے کر پینے سے سردی لگنا اور اعصابی کمزوری جیسی شکایات رفع ہوتی ہیں۔

☆ ایک پیالی گرم پانی میں تازہ ادرک کا رس یا خشک سونٹھ کا سفوف ایک چمچی اور شہد ملا کر پینے سے گلے کی خراش، نزلہ اور کھانسی کے علاوہ سردی زیادہ لگنے کی شکایت دور ہو جاتی ہے۔

☆ پیاز کا رس اور شہد مساوی وزن میں ملا کر روزانہ تین تا چار چمچ لینے سے نزلہ زکام، کھانسی، برانکائیٹس اور دیگر تنفسی امراض سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔ سردیوں میں زکام سے محفوظ رہنے کے لیے بہترین نسخہ ہے۔

☆ شدید سردی سے بچاؤ کے لیے دس سے پندرہ دانے کالی مرچ کے لے کر انھیں دو سو گرام گڑ کے ساتھ کھا لیں۔ اس سے جسم گرم ہو جاتا ہے اور سردی کا اثر نہیں ہوتا۔

☆ سردی ختم کرنے کے لیے تین تولہ اخروٹ کی گری اور تین دانے انجیر لے کر اچھی طرح چبا لیں۔ اس سے سردی کے اثرات ختم کرنے میں مدد ملتی ہے۔

☆ سردی کی وجہ سے بار بار پیشاب آتا ہو تو دار چینی پسی ہوئی تقریباً دو ماشہ (یعنی دو گرام) دُودھ میں ڈال کر پی لیں یا پھر یہ شکایت چلغوزے کھا کر بھی رفع کی جا سکتی ہے۔

☆ سردی میں بوڑھے افراد کو جوڑوں کا درد بہت زیادہ تنگ کرتا ہے۔ ایسی صورت میں روزانہ صبح چائے میں ایک چمچی السی کا تیل ڈال کر استعمال کیا جائے تو مفید نتائج نکلتے ہیں۔ کھانسی، سینے کی جکڑن اور سانس کی بیماریوں کے لیے اسی طریقے کو کچھ دن استعمال کریں تو افاقہ ہوگا۔

☆ دار چینی کا سفوف پانی میں ملا کر ماتھے پر لگانے سے سر درد ختم ہو جاتا ہے۔ بالخصوص سردی کے باعث لاحق سر درد کے لیے بہترین دوا ہے۔ موسم سرما میں نزلہ زکام سر درد کی عام وجہ ہے۔ دار چینی زکام کا بہترین علاج ہے۔ اس کا موٹا سفوف ایک گلاس پانی میں چٹکی بھر سیاہ مرچ کے سفوف اور شہد کے ساتھ اُبال کر پیا جائے تو یہ وبائی زکام، گلے کی خراش اور بخار کا شافی علاج ہے۔

☆ سردی سے ہونے والا سر درد عموماً نزلہ زکام کے باعث پیدا ہوتا ہے۔ ایسے مریضوں کے ناک، کان، ناف اور تلوؤں پر سرسوں کا تیل لگانے سے فائدہ ہوتا ہے۔

☆..... بوڑھے افراد میں بعض اوقات پیشاب بند ہو جاتا ہے۔ یہ مسئلہ سردی میں ہو تو ایسی صورت میں دو یا تین گرام اجوائن ایک پاؤ دُودھ میں جوش دے کر چھان کر پلائیں۔ بہت جلد پیشاب جاری ہو جائے گا۔

جاسوسی کہانی

انجم فاروق ساحلی

زُلفِ گراں

گناہوں کی دلدل میں دھنس جانے والے ایک احمق نوجوان کا قصہ عجب

جبران کا چچا محمد علی اپنے بستر پر مُردہ پایا گیا۔ اُس کی سانس رُک گئی تھی اور بے نُور آنکھیں چھت کو گھور رہی تھیں۔ ملازمہ نے اُسے بے حس و حرکت دیکھ کر گھر کے افراد کو علی الصباح اطلاع کی۔ سب اپنے اپنے کمروں سے نکل کر چچا کے کمرے میں آئے۔ آج شام محمد علی کے بیٹے شہزاد کی سالگرہ تھی۔

ڈاکٹر شوکت علی کو بُلوایا گیا جو محمد علی کے پھوپھی زاد بھائی اور بطور مہمان حویلی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے ڈاکٹری معائنے کے بعد اعلان کیا کہ موت سانس رُکنے سے واقع ہوئی ہے اور قتل کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔

اس وقت پرانا ملازم، کرم دین انسپکٹر عمران کو ساتھ لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ انسپکٹر عمران نے آگے بڑھتے ہوئے اہل خانہ کو مطلع کیا: ''میرے پڑوسی محمد علی آج کچھ ضروری امور کے سلسلے میں مجھ سے مشورہ کرنا چاہتے تھے۔ اُن کی زندگی کو شاید خطرہ لاحق تھا۔''

''ایسی تو کوئی بات نہیں تھی۔ وہ اپنی زندگی سے مطمئن، آسودہ اور خوش و خرم تھے''۔ بیگم محمد علی نے انسپکٹر عمران کو گھورتے ہوئے کہا۔

''بیگم صاحبہ! یہ آپ کا خیال ہے لیکن اُن کے خدشات کچھ اور تھے''۔ انسپکٹر عمران نے اہل خانہ پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ اُس کے اشارے پر سب لوگ بستر سے

ہٹ کر کچھ فاصلے پر کھڑے ہو گئے۔ انسپکٹر عمران نے محمد علی کے مُردہ وجود کو دیکھ کر ماحول کا جائزہ لیا۔

محمد علی کا بستر مشرق کی سمت دیوار کے قریب تھا۔ مغرب کی جانب دیوار میں دو بڑی کھڑکیاں تھیں جن کے پٹ کھلے ہوئے تھے اور باہر حویلی کے باغ میں پھیلے درختوں کے جھنڈ دکھائی دے رہے تھے۔ رات کے پچھلے پہر چونکہ آندھی چلی تھی لہٰذا پیپل کے بڑے بڑے خشک زرد پتے اُڑ اُڑ کر اندر آئے اور فرش پر ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ انسپکٹر عمران نے آگے بڑھ کے کھڑکیوں کا بغور جائزہ لیا۔ باہر جھانکا پھر بالمقابل کھڑکی سے لے کر بستر تک فرش پر پھیلے زرد پتوں کا جائزہ لیا۔ اُس کا خیال حقیقت میں بدلنے لگا۔ اُس نے بستر کے ساتھ میز پر الٹی پڑی سانس بحال کرنے والی گولیوں کی بوتل کو غور سے دیکھا۔ شیشی کا ڈھکنا اُترا ہوا تھا، گولیاں میز اور فرش پر بکھری ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

انسپکٹر عمران نے اشارے سے ڈاکٹر شوکت کو قریب بُلایا اور پوچھا: ''ڈاکٹر صاحب کیا خیال ہے، یہ دوا کی شیشی رات کے وقت میز پر کس طرح اُلٹ گئی؟ گولیاں میز اور فرش پر دُور دُور تک بکھری ہوئی دکھائی دے رہی ہیں۔'' انسپکٹر عمران نے ڈرامائی انداز سے گولیوں کی طرف اشارہ کیا۔

اہل خانہ بے چینی سے انسپکٹر عمران کو دیکھنے لگے۔ ڈاکٹر چند لمحے کھڑا سوچتا رہا پھر پُریقین لہجے میں بولا: ''رات کے وقت اچانک محمد علی کی سانس رکنے سے طبیعت بگڑ گئی۔ انھوں نے دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر شیشی کا ڈھکنا اُتارا اور گولیاں نکال کے کھانا چاہتے تھے کہ سانس کی بندش کی تکلیف بڑھ گئی اور وہ جان کنی میں مبتلا ہو گئے۔ اس وقت اضطرابی کیفیت میں ہاتھ لگنے سے شیشی الٹ گئی اور گولیاں اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔''

انسپکٹر عمران نے نفی میں سر ہلایا اور بڑھتے ہوئے محمد علی کے تکیے کو کھینچ کر الٹتے ہوئے اُس کا جائزہ لیا۔ اُس کی تیز نگاہ تکیے کے سفید غلاف پر بنے زرد رنگ کے پھولوں کے درمیان رینگنے لگی۔ اچانک وہ چند سرخ سرخ ننھے ننھے دھبے دیکھ کر چونک اُٹھا۔ اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ دھبوں کو دیکھ کر اُس نے محمد علی کے گال پر لگی گردن تک جانے والی خراش کا جائزہ لیا اور پھر سب پر ڈرامائی نگاہ ڈالتے ہوئے بولا:

''محمد علی..... میرے دوست کو قتل کیا گیا ہے۔ اُس کے قاتل کو پکڑنا اب میری ذمہ داری ہے۔''

سب پھٹی پھٹی نظروں سے انسپکٹر عمران کے جارحانہ تیور دیکھنے لگے۔ لاش کو سفید چادر سے ڈھک دیا گیا۔ انسپکٹر عمران نے کمرے کی صفائی سے ملازموں کو روک دیا۔ قریبی تھانے سے فنگر پرنٹ کا عملہ بُلوایا گیا۔ بستر اور کھڑکیوں سے انسانی انگلیوں کے نشانات تلاش کیے جانے لگے لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ بستر پر صرف محمد علی اور ملازم ہی کے نشانات انگشت پائے گئے۔

انسپکٹر عمران نے حویلی کا نقشہ منگوایا اور کمرے میں شمالی دیوار کے ساتھ لگی نشست گاہ پر آ بیٹھا۔ اس نے حویلی کے سارے محل وقوع کا جائزہ لیا۔ پھر اپنے اسسٹنٹ فرحان کو اشارہ کیا کہ اہم افراد میں سب سے پہلے بیگم محمد علی کو میرے پاس بھیج دو۔ حوالدار فرحان عملے کے ساتھ ہی آ پہنچا تھا۔

بیگم محمد علی رومال سے آنسو خشک کرتیں انسپکٹر عمران کے مقابل صوفے پر آ بیٹھیں۔

''بیگم صاحبہ! گستاخی معاف، میرے علم میں ہے کہ محمد علی کا آپ سے متعدد بار جھگڑا ہوا۔ آپ ایک بیوٹی پارلر بنانا چاہتی تھیں لیکن وہ اس کی اجازت دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ اس کام کو روپے کا اسراف اور اخلاقی طور پر اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ آپ کیوں پارلر بنانا چاہتی تھیں؟''

''تنہائی اور بوریت سے اُکتا کر! محمد علی چڑچڑے ہو گئے تھے۔ میں ان سے دُور رہنا چاہتی تھی۔ شادی سے قبل میں یہی کام کیا کرتی تھی چنانچہ مجھے تربیت کی بھی ضرورت نہیں تھی''۔ بیگم محمد علی نے بے باکی سے جواب دیا۔

انسپکٹر عمران نے محسوس کیا کہ اس عورت کو اپنے خاوند

کے مرنے کا کوئی افسوس نہیں اور آنکھوں پر رومال تو محض دکھاوا ہی ہے۔ ''شاید آپ نے انھیں ایک بار دولت کا سانپ بھی کہہ ڈالا تھا''۔

''مجھے ایسی کوئی بات یاد نہیں''۔ بیگم محمد علی نے ناگوار لہجے میں کہا۔

چند لمحے خشمگیں نگاہوں سے گھورنے کے بعد بولیں: ''پولیس والوں کو صرف تفتیش سے غرض ہوتی ہے۔ وہ کسی کو مرگ کے صدمے سے نکلنے کا موقع بھی نہیں دیتے بلکہ زخموں پر نمک پاشی کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتے ہیں''۔

''بیگم صاحبہ! اگر دیر کی جائے تو قاتل تک پہنچنا بے حد دشوار ہو جاتا ہے''۔ انسپکٹر عمران نے تنبیہی لہجے میں کہا۔ پھر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہوا بولا: ''مرحوم نے مجھے بتایا تھا کہ اُن کے کمرے میں پچھلے ماہ ایک زہریلا کالا ناگ کھڑکی کی جانب سے رینگتا ہوا بستر کے قریب چلا آیا تھا۔ اگر پیاس کی وجہ سے اُن کی آنکھ نہ کھل جاتی تو موت نزدیک پہنچ چکی تھی۔ اُنھوں نے اپنی وزنی ڈکشنری میز سے اُٹھا کر اُس پر پھینکی اور بستر سے نیچے اُتر کر اپنا پاؤں اس پر جما کر پوری قوت سے پیس ڈالا۔ اُن کا خیال تھا کہ کسی نے باہر کھڑے ہو کر کھلی کھڑکی سے سانپ اندر پھینکا ہے''۔

بیگم محمد علی جلدی سے بول اٹھیں: ''انسپکٹر صاحب! آپ اس وقت بھی رات کی رانی کی مہک کمرے میں محسوس کر رہے ہوں گے۔ باہر انھوں نے خوشبودار پودے لگوا رکھے تھے جن پر سانپ آتے ہیں۔ وہ انسانی مہک پا کر اندر رینگ آیا ہوگا''۔

''اُن کی موت کا سب سے زیادہ فائدہ آپ کو اور آپ کے بیٹے شہزاد کو ہوا ہے۔ اُن کی ساری جائیداد کے اب آپ دونوں وارث ہیں۔ اب آپ ایک چھوڑ کئی پارلر بنوا سکتیں اور شہزاد کئی من پسند گاڑیاں خرید سکتا ہے''۔

بیگم محمد علی غصیلی نگاہوں سے انسپکٹر عمران کو گھورنے لگیں۔ ''آپ بلاوجہ ہمیں ملوث کرنے پر تلے ہوئے ہیں بہرحال میں اپنے وکیل کو صورتحال سے آگاہ کر دوں گی۔ آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ انھیں قتل کیا گیا ہے؟ اُن کی قدرتی موت واقع ہوئی ہے۔ انھیں سانس رُکنے کی شدید تکلیف لاحق ہو چکی تھی۔ سردی، گرمی، برسات ہر موسم میں وہ کھڑکیاں کھلی چھوڑ کر سونے کے عادی تھے۔ ہم ماں بیٹے نے تو رات کمرے سے باہر قدم بھی نہیں نکالا۔ حویلی کے بڑے برآمدوں میں، دو مرتبہ چوری ہونے کے بعد کیمرے لگوائے گئے تھے۔ آپ مانیٹرنگ اسکرین پر مناظر دیکھ سکتے ہیں''۔ بیگم محمد علی نے چبھتے ہوئے کہا۔

''آپ جا سکتی ہیں''۔

بیگم محمد علی گھبرائی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ حوالدار فرحان نے اندر جھانکا، ''شہزاد کو اندر بھیج دو''۔

انسپکٹر عمران نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ دو منٹ بعد شہزاد کمرے میں داخل ہو کر مقابل آ بیٹھا۔ وہ دراز قد اور خوش شکل نوجوان تھا۔ اُس کے چہرے پر بے چینی کے آثار تھے لیکن وہ خائف معلوم نہیں ہوتا تھا۔

''شہزاد صاحب! آپ نے اپنے والد کو نت نئے مطالبوں سے پریشان کر رکھا تھا۔ آپ کا مطالبہ نئی ٹیوٹا کرولا گاڑی کا تھا لیکن محمد علی نے ایک آخری مطالبہ مسترد کر دیا اور کہا کہ تم نے اپنی نئی کار بیچ کھائی ہے۔ تم عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے، روپیہ اُڑاتے، جوا کھیلتے اور بڑی بڑی رقمیں ہار جاتے ہو''۔

شہزاد ایک ٹھنڈی آہ بھرتا ہوا بولا: ''انسپکٹر صاحب! مجھے کاروباری طور پر نقصانات ہوئے ہیں۔ میری کار کسی بدمعاش نے گن پوائنٹ پر رات کے وقت چھین لی تھی۔ اس لیے میں بحران کا شکار ہوا۔ ابو کی اطلاعات درست نہیں۔ وہ میری جاسوسی کرواتے رہتے تھے۔ اُن کو غلط معلومات فراہم کی گئیں''۔

''آپ رات کے وقت اپنے کمرے سے نکلے تھے یا نہیں؟'' انسپکٹر عمران نے اپنی تیز نگاہیں اُس پر مرتکز کرتے

ہوئے پوچھا جیسے اُس کے باطن میں جھانکنا چاہتا ہو۔

''نہیں انسپکٹر صاحب! میں باہر نہیں نکلا۔ میں تو بخار میں مبتلا تھا اور رات بھر بستر سے نہیں اُتر سکا''۔

''آپ کا کیا خیال ہے؟ اُن کے کمرے میں سانپ چھوڑ کر ہلاک کرنے کی کوشش کون کر سکتا ہے؟''

''اس سلسلے میں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا''۔ شہزاد فوراً بول اٹھا۔ ''ہمارے خیال میں تو سانپ خود بخود ہی ادھر آ نکلا تھا''۔

''آپ جا سکتے ہیں''۔

شہزاد اٹھا اور پُراعتماد انداز سے چلتا ہوا بیرونی دروازے سے باہر چلا گیا۔

حوالدار فرحان نے پھر کمرے میں جھانکا، ''محمد علی کے بھتیجے جبران کو کمرے میں بھیج دو''۔ انسپکٹر عمران نے سگریٹ سُلگاتے ہوئے اشارہ کیا۔ ٹھیک دو منٹ بعد جبران انسپکٹر عمران کے سامنے بیٹھا سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

انسپکٹر عمران نے اُس کا، کمرے میں داخل ہوتے وقت باقاعدہ جائزہ لیا۔ وہ ایک دراز قد و خوبصورت اور پُرکشش نوجوان تھا۔ بال جدید فیشن کے مطابق لمبے لمبے اور بار بار اُس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتے تھے۔ وہ مشینی انداز میں ایک ہاتھ سے اُنھیں ہٹاتا رہتا تھا۔ وہ سفید پتلون کے اُوپر رنگ دار قمیص پہنے ہوئے تھا۔ جبران بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔

انسپکٹر عمران نے اس کی بے تابی دیکھتے ہوئے پہلا سوال کیا:

''مسٹر جبران! آپ کا اپنے چچا سے چند روز قبل جھگڑا ہوا تھا۔ آپ غصّے اور اشتعال میں آ گئے تھے۔ آپ پر قتل کا شبہ کیا جا سکتا ہے''۔

جبران نے بائیں ہاتھ سے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے لمبے بالوں کو جھٹکا اور بائیں ہاتھ کی اُنگلی سے سفید چادر اوڑھے ابدی نیند سوتے چچا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''یہ قتل کا کیس نہیں چچا کی موت سانس رُکنے سے ہوئی ہے۔ ڈاکٹر نے پورے یقین کے ساتھ یہی خیال ظاہر کیا ہے لیکن آپ زبردستی.....''۔ اُس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''برخوردار یہ قتل کا ہی کیس ہے اور میں اس کمرے سے قاتل کو گرفتار کر کے ہی نکلوں گا''۔ انسپکٹر عمران نے تیز لہجے میں کہا۔ جبران کو جھٹکا سا لگا لیکن وہ فوراً ہی پُرسکون ہو کر گویا ہوا: ''آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟'' جبران نے انسپکٹر عمران کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے پوچھا۔

''ایک بہت اہم سوال''۔ انسپکٹر عمران نے بھی اپنی تیز نظریں اُس کے چہرے پر جما دیں۔

''فرمایئے''۔ جبران کے لہجے میں ہلکا سا طنز چھپا ہوا تھا۔

''آپ رات کے وقت اپنے کمرے سے باہر نکلے تھے یا نہیں، کسی بھی مقصد کے تحت؟'' انسپکٹر عمران نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''انسپکٹر صاحب!'' جبران نے پُراعتماد لہجے میں بالوں کو جھٹکتے ہوئے کہا: ''میں تقریباً ساری رات اپنی منگیتر شبانہ کے ساتھ کمرے میں تاش کھیلتا رہا ہوں کیونکہ ہم دونوں کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ شہزاد کی سالگرہ کے سلسلے میں جو مہمان حویلی میں ٹھہرے ہوئے ہیں، اُن میں میری منگیتر شبانہ بھی شامل ہے۔ میں چند منٹ کے لیے بھی کمرے سے باہر نہیں نکلا۔ آپ شبانہ کا بیان لے سکتے ہیں۔''

انسپکٹر عمران نے حوالدار فرحان کو آواز دے کر بلایا اور شبانہ کا بیان لینے کے لیے روانہ کر دیا۔ اس دوران خاموشی طاری رہی۔ جبران نے اجازت لے کر سگریٹ سُلگایا اور لمبے لمبے کش کھینچنے لگا۔ اُس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ وہ خود کو بے حد پُرسکون اور مطمئن ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''آپ زیادہ تر کام بائیں ہاتھ سے کرتے ہیں''۔ انسپکٹر عمران نے خاموشی کو توڑا۔

''آپ کا خیال درست ہے''۔ جبران نے دھواں اُڑاتے ہوئے جواب دیا۔ اس وقت فرحان اندر داخل ہوا اور

موبائل پر ریکارڈ شدہ شبانہ کا بیان انسپکٹر عمران کو سنوانے لگا۔ شبانہ نے جبران کے بیان کی حرف بہ حرف تصدیق کی تھی۔

''جبران صاحب! کیا شبانہ یہی لڑکی ہے جس کے ساتھ آپ سیر و تفریح کرتے ہیں۔ ہوٹلوں اور جوئے کے اڈوں پر جاتے رہتے ہیں''۔

''اس سوال کا موجودہ کیس سے کیا تعلق ہے؟'' جبران نے تلملاتے ہوئے کہا۔

''ہے تعلق، بلکہ بہت گہرا تعلق ہے۔ آپ شبانہ صاحبہ کی فرمائشوں کی وجہ سے پریشان ہیں۔ آپ اُن کے مطالبات پورے کرنے کے لیے کوئی بڑا ہاتھ مارنا چاہتے تھے۔ وہ بڑا ہاتھ یہی تھا کہ آپ کے چچا محمد علی آپ کے راستے سے ہٹ جائیں اور آپ اپنا خاندانی ورثہ حاصل کر لیں جس کے نگران آپ کے چچا ہی تھے''۔

''آپ کے والد کافی دولت مند تھے۔ انھوں نے چار سال قبل عام وصیت کے برعکس اپنے بھائی محمد علی کو جائیداد کا نگران مقرر کر دیا تھا کہ جب تک آپ یعنی جبران تیس برس کی عمر کا ہو کر ذمہ دار نوجوان نہ بن جائے اُسے اخراجات کے لیے صرف بیس ہزار روپے ماہانہ ہی دیے جائیں۔ باقی تمام ورثہ بینک بیلنس تیس سال کی عمر میں منتقل کیا جائے۔ آپ کی عمر اس وقت تقریباً اٹھائیس سال ہے۔ وہ آپ کی شاہ فرمائشوں سے پریشان و نالاں تھے اور اس کا اظہار کئی مرتبہ اپنے بھائی کے سامنے کر چکے تھے۔ آپ نے اپنی ضرورتوں اور بے جا خواہشات کی تکمیل کے لیے چچا کے سامنے غم و غصے کا اظہار کیا کہ میرا خاندانی ورثہ میرے سپرد کر دیا جائے لیکن وہ رضامند نہ ہوئے۔ تب اُنھیں ایک بلڈنگ کی سیڑھیوں سے دھکا دیا گیا اور پھر اُن کے کمرے میں رات کے وقت کالا ناگ چھوڑا گیا تو وہ چوکنا ہو گئے اور اپنے خدشات کا مجھ سے اظہار کیا۔ میں آپ لوگوں کا پڑوسی ہوں۔ اُن کا خیال رکھنا میرا فرض تھا، چنانچہ تمہاری اور شہزاد کی نگرانی شروع کروا دی گئی۔ جبران صاحب! آپ مقروض ہیں، جوا کھیلنے والے اکثر مقروض ہوتے ہیں۔ آپ پر قتل کا قوی شبہ ہے''۔ انسپکٹر عمران نے آخری الفاظ چبا چبا کر ادا کیے۔

''آپ کی معلومات اور خدشات درست ہیں مگر میں رات کو اپنے کمرے سے نہیں نکلا''۔

''بس کچھ دیر اور صبر کر لو پھر میں بتاؤں گا کہ تم کمرے سے کیسے باہر نکلے''۔

''یہ دھونس اور الزام تراشی ہے''۔ جبران نے ترش لہجے میں میز پر مارا۔

''بس کچھ دیر''۔ انسپکٹر عمران نے ہاتھ اُٹھا کر سخت لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے، میں منتظر ہوں آپ کے ثبوتوں کا''۔ جبران نے قدرے حقارت سے چچا کے بے جان وجود پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر عمران نے فرحان کو حکم دیا کہ حویلی میں لگے کیمروں کے مانیٹرنگ سسٹم کو تاروں کی مدد سے یہاں لا کر نصب کر دیا جائے۔ اس کام میں کچھ وقت لگا۔ اس دوران چائے اور سگریٹ کا دور چلتا رہا۔ کمرا دھوئیں سے بھر گیا۔ تنصیب کے بعد تاروں کے ذریعے مانیٹرنگ سسٹم اور اسکرین انسپکٹر عمران کے سامنے دیوار پر لگا دی گئی اور اُس پر رات کے مناظر چلنے لگے۔

تاریک اسکرین پر ایک نوجوان دکھائی دیا۔ جس نے سرخ رنگ کی پھولوں والی قمیص پہن رکھی تھی۔ چہرے پر سیاہ نقاب تھا۔ وہ حویلی کی راہداریوں میں چلتا پھرتا دکھائی دیا۔ پھر وہ اُن مقامات کی طرف چلا گیا جہاں کیمرے نصب نہیں تھے۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ جبران بھی بغور اسکرین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انسپکٹر عمران نے اہل خانہ کو بھی اسی کمرے میں بُلوا لیا اور مناظر اسکرین پر دوبارہ چلا دیے گئے۔

''یہ..... یہ شہزاد ہے۔ اُس کے پاس سرخ قمیص موجود ہے''۔ جبران خاموش نہ رہ سکا۔

''یہ بکواس ہے۔ میں تو رات کے وقت بخار میں پھنک

رہا تھا۔ رات بھر بستر پر پڑا رہا۔ مجھے تو کوئی ہوش ہی نہیں تھا۔ ضرور کسی نے میری سرخ قمیص چرائی ہے''۔ شہزاد غصے سے چلا کر بولا۔

انسپکٹر عمران نے تیسری بار غور سے سرخ قمیص والے نوجوان کو دیکھا جس نے منہ پر سیاہ رومال باندھ رکھا تھا۔ سر کے بال سیاہ ٹوپی میں چھپے ہوئے تھے۔ انسپکٹر نے اُس کی حرکات وسکنات کا مشاہدہ کیا اور پھر ایک منظر اسکرین پر روک کر اپنے اسسٹنٹ حوالدار فرحان کی طرف متوجہ ہوا۔

''فرحان! جبران علی کو گرفتار کرلو۔ یہی قاتل ہے''۔

کمرے میں بم سا پھٹ گیا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

جبران غصے سے سرخ ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں اپنے وکیل کو بلواؤں گا۔ آپ..... آپ.....'' وہ اس سے آگے کچھ نہ بول سکا۔

''میں سب کے سامنے قتل کی تفصیلات بیان کرتا ہوں اور ثبوت بھی دوں گا۔'' انسپکٹر عمران نے حاظرین پر نگاہ ڈالتے ہوئے ڈرامائی لہجے میں کہا۔

''قتل کا ارتکاب جبران نے شبانہ کے مطالبات پورے کرنے کے لیے کیا۔ اُس نے جھوٹا بیان دیا ہے۔ جبران نے اُسے جھوٹ بولنے پر رضامند کرلیا تھا کہ میں رات کے وقت کمرے سے باہر نکلوں گا لیکن تم صبح یہی بیان دوگی کہ یہ تو ساری رات میرے ساتھ تاش کھیلتا رہا۔''

شبانہ کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ کھا جانے والی نظروں سے انسپکٹر عمران کو گھورنے لگی۔

''جبران اپنے کمرے کی عقبی کھڑکی سے باہر نکلا اور مختلف مقامات سے گزر کر شہزاد کے کمرے کی پچھلی کھڑکی سے اندر کود گیا۔ اس کی پھولوں والی سرخ قمیص چرائی اور باہر نکل کر اُسے اپنی قمیص پر پہن لیا۔ چہرے پر سیاہ رومال باندھ کر سر کے لمبے بال سمیٹ کر سیاہ ٹوپی میں چھپائے، پھر چچا محمد علی کے کمرے کی طرف چل پڑا جو اُس مقام سے کافی فاصلے پر تھا۔ اس لیے مختلف راہداریوں سے گزرنا پڑا''۔

''محمد علی کے کمرے کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں''۔ انسپکٹر عمران نے کھڑکیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''انہی کھڑکیوں میں سے سرخ فریم دار کھڑکی سے جبران اندر داخل ہوا۔ وہ شہزاد کی سرخ قمیص پہنے ہوئے تھا۔ اُس کی آمد سے قبل تیز آندھی چل چکی تھی جس سے پیپل کے زرد پتے اُڑ اُڑ کر کمرے کے فرش پر بکھر گئے تھے۔ جب میں اس کمرے میں آیا، معائنہ کیا تو کھڑکی سے لے کر بستر تک خشک زرد پتے کچلے ہوئے تھے۔ تکیے کو اُلٹ کر دیکھا تو اس پر لمبی خراش کا خون دھبوں کی صورت میں لگا ہوا تھا۔ اس سے ثابت ہے کہ محمد علی کے منہ پر تکیہ رکھ کر زور سے دبا دیا گیا۔ اُن کا سانس رُک گیا۔ جدوجہد کرتے وہ ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ اس سے شیشی الٹ گئی جو بند کرنا وہ بھول گئے تھے، چنانچہ سرخ گولیاں اِدھر اُدھر فرش پر پتوں کے درمیان بکھر گئیں۔'' انسپکٹر سانس لینے کے لیے رُکا۔

''یہ سب ہوائی قلعہ ہے، کوئی ثبوت نہیں۔ میرا وکیل.....''۔ جبران غصے سے حلق کے بل چیخا۔

''ایک اور ثبوت موجود ہے۔ مجھے کوئی جھٹلا نہیں سکتا جبران''! انسپکٹر عمران گرجا۔

''تم ہر کام بائیں ہاتھ سے کرتے ہو یعنی لیفٹ ہینڈ ہو۔ اسکرین پر موجود نوجوان، جو حویلی کی راہداریوں میں گھوم رہا ہے۔ وہ ٹھوڑی کی کھجاہٹ، بالوں کے اوپر والی ٹوپی کی درستگی اور غرانے والی بلی کو بائیں ہاتھ سے چپل مار کر بھگاتا ہے۔ یہی سب سے بڑا ثبوت ہے۔ تم بائیں ہاتھ کے کاموں کی وجہ سے پکڑے گئے، ورنہ منصوبہ خوب تھا۔ تمہارے بائیں ہاتھ سے کی جانے والی حرکات کی تصاویر میں نے موبائل سے لے لی تھیں''۔ انسپکٹر عمران نے موبائل اُس کے سامنے کردیا اور پھر اسکرین کے مناظر کی طرف اشارہ کیا۔

جبران اور شبانہ دونوں ہی پستول نکالنا چاہتے تھے کہ انسپکٹر عمران اور حوالدار فرحان نے جھپٹ کر انھیں قابو کرلیا۔ جبران کو شبانہ کی زُلف کا سایہ بڑا گراں معلوم ہونے لگا۔ ◆◆◆

مہمان

رشید صاحب کا نام سنتے ہی ہاجرہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ طبیعت ایک دم بیزار ہوگئی۔ فرید کی باقی باتوں کا جواب ہوں ہاں اور اچھا میں دیتے ہوئے، اس کے چہرے سے خوشگوار تاثرات غائب ہوگئے۔ بات ختم ہوگئی تو اس نے فون کریڈل پر پٹخنے کے انداز میں رکھ دیا۔

''رشید صاحب آرہے ہیں.....''۔ وہ دانت پیستے ہوئے بڑبڑائی۔ اس کی دونوں بیٹیاں قریب ہی بیٹھی تھیں۔ حمیرا اپنی قمیص کے دامن پر پھول بنا رہی تھی اور سمیرا ہوم اکنامکس کی کاپی میں ٹنکنگ کے نمونے ٹانک رہی تھی۔

دونوں کو پتا چل گیا تھا کہ فون ابو کا ہے اور انھوں نے رشید انکل کے آنے کی اطلاع دی ہے۔ ماں کو دزدیدہ نگاہوں سے تکتے ہوئے وہ زیرِلب مسکرا رہی تھیں۔ ہاجرہ ہاتھ میں ریشمی کپڑا پکڑے ہوئے تھی۔ پھول بنانے کے لیے سوٹ کا یہ رنگ خوب صورت تھا۔ وہ حمیرا کو دکھانے ہی کے لیے کمرے سے یہ کپڑا لائی تھی۔ حمیرا بی اے کرنے کے بعد

رضیہ بٹ

فارغ تھی۔ اسے آج کل سلائی کڑھائی کا شوق ہو رہا تھا۔ اس لیے صبح وشام رنگارنگ دھاگے اور رنگارنگ کپڑے لیے بیٹھی کڑھائی کرتی رہتی۔ سمیرا کا امتحان بھی قریب آرہا تھا۔ آج اس نے اپنی کاپی مکمل کرنے کے لیے کالج سے چھٹی کی تھی۔

ہاجرہ نے کپڑا حمیرا کو دکھائے بغیر کرسی پر پھینک دیا اور خود ٹی وی کے قریب پڑی گدے دار کرسی میں اپنا بھاری بھرکم وجود ڈھیلا چھوڑ کر بیٹھ گئی۔

''کس کا فون تھا امی؟'' سمیرا نے حمیرا کی آنکھوں میں مسکراتی آنکھیں ڈال کر مسرور سا اشارہ کرتے ہوئے امی سے پوچھا۔

''ابو کا''۔ ہاجرہ کی جگہ حمیرا نے جواب دیا۔

ہاجرہ کے چہرے پر اب بھی ناگوار سے اثرات تھے۔ سمیرا نے پھر شوخی سے کہا: ''امی کیا کہہ رہے تھے ابو؟''

''رشید صاحب آرہے ہیں آج۔'' ماں نے غصے سے کرسی کی ہتھی پر ہاتھ مارا۔

ایک نادان عورت کا سبق آموز ماجرا، وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو بلائے جاں سمجھ بیٹھی تھی

"تو کیا ہُوا امّی"۔ حمیرا بولی۔ "آپ کا موڈ کیوں خراب ہے؟"

"رشید انکل اتنے اچھے تو ہیں"۔ حمیرا بولی۔

"اچھا اچھا کہہ کر سر چڑھا لیا ہے نا"۔ ہاجرہ غرائی۔ "گھر کو سرائے ہی سمجھ لیا ہے۔ جب دیکھو منہ اٹھائے چلا آرہا ہے۔ ہوٹل..... رہے ہی نہیں ہیں جیسے....."

حمیرا جلدی سے بولی: "امی آپ کو پتا ہے۔ رشید انکل ہوٹل کا کھانا نہیں کھا سکتے۔ پیٹ کی تکلیف ہے کچھ"۔

"چل رہنے دے"۔ ہاجرہ بیزاری سے بولی: "سب چالیں سمجھتی ہوں۔ اچھا بہانہ گھڑ لیا ہے۔ جی پیٹ میں تکلیف رہتی ہے اس لیے ہوٹل میں نہیں ٹھہر سکتا"۔

حمیرا مسکرانے لگی۔ امی نے رشید صاحب کے لہجے کی نقل بھی تو کیا خوب اُتاری تھی۔ حمیرا پھر بولی: "جھوٹ تھوڑا ہی کہتے ہیں انکل"۔

ہاجرہ چڑ کر بولی: "بہانے ہیں بہانے چار چار دن یہاں پڑے رہتے ہیں ہوٹل میں ٹھہریں تو لگ پتا جائے..... پیسا....."

حمیرا نے جلدی سے پھر کہا: "پیسا ان کے پاس کیا کم ہے امّی! اتنے امیر کبیر تو ہیں۔ ابّو بتا رہے تھے ان کی بہت بڑی کوٹھی ہے۔ لاکھوں کا بزنس ہے۔ بزنس ہی کے سلسلے میں انھیں لاہور آنا پڑتا ہے!"

حمیرا شوخی سے آنکھیں نچاتے ہوئے بولی: "رشتے داروں کے ہوتے ہوئے ہوٹل میں کیوں ٹھہریں وہ!"

ہاجرہ اور چڑ گئی۔ بیٹی کو گھورتے ہوئے لڑنے کے انداز میں بولی: "رشتے دار کیا لگتے ہیں وہ ہمارے؟"

حمیرا نے پھر ہنسی روکتے ہوئے ماں کو چڑایا: "ابّو کی پھپھو کے جیٹھ کے بیٹے کے....."

"بکو نہیں"۔ حمیرا نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا: "دوستی کا بھی تو مضبوط رشتہ ہوتا ہے۔ انکل ابّو کے دوست ہیں!"

"دوستی کا رشتہ..... ہونہہ..... کھانے پینے کا رشتہ کہو۔ مجھے تو ان پر غصّہ آتا ہے۔ رشید صاحب کیا آجاتے ہیں۔ خاطر داریاں..... ناز برداریاں"۔

"امّی۔ امّی پلیز"۔ حمیرا نے بات کاٹی۔ "ابّو کی عادت سے آپ واقف ہیں وہ تو جو کوئی بھی آئے، اس کی خاطر تواضع دل سے کرتے ہیں۔ خالی رشید صاحب ہی کی تو نہیں کرتے"۔

حمیرا نے شرارتی نظروں سے بہن کو دیکھا اور پھر بولی: "ویسے رشید صاحب کی کچھ زیادہ ہی خاطر داری کرتے ہیں ابّو!"

ہاجرہ کو تو جیسے شہہ مل گئی، بولی: "ٹھیک کہتی ہے حمیرا۔ رشید صاحب کے لیے تو دیدہ و دل فرشِ راہ کر دیتے ہیں تیرے ابّو۔ جتنے دن بھی وہ رہتے ہیں۔ ناز برداریوں ہی میں لگے رہتے ہیں۔ مُرغ پلاؤ کے بغیر تو کھانا ہی نہیں بنتا"۔

حمیرا نے شاکی انداز میں ماں کو دیکھا اور آہستگی سے بولی: "امی! آپ کیسی باتیں کرتی ہیں۔ مہمان کی خاطر تواضع کرنا ہمارا فرض ہے"۔

"اے ہے، مہمان ایک دفعہ ہو دو دفعہ ہو کہ ہر ماہ باقاعدگی سے مہمان صاحب آن دھمکے۔ تین چار دن سر پر سوار رہے۔ خاطر داریاں ہی کرتے جائیں؟" ہاجرہ نے منہ بنایا۔

حمیرا نے پھر شوشہ چھوڑا۔ "ویسے رشید صاحب کو تو وی آئی پی ٹریٹمنٹ دیتے ہیں حمیرا۔ کیا ہوا دوست ہیں ان کے۔ پھر رشید صاحب بھی کون سا خالی ہاتھ آجاتے ہیں"۔

"یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔ بہت پیار کرتے ہیں ہم سے، کتنا ڈھیر سا پھل لے آتے ہیں۔ پچھلی دفعہ تو....."

ہاجرہ نے بات کاٹی۔ "بس اب گننے نہ بیٹھ جا۔ نہیں چاہئیں ہمیں ان کے تحفے تحائف!"

حمیرا اور حمیرا نے پھر ایک دوسری کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھوں میں شوخی تھی۔ ماں کے روّیے سے وہ محظوظ ہو رہی تھیں۔

"ویسے امی ایک بات بتائیں"۔ حمیرا بولی۔

ہاجرہ نے اس کی طرف صرف دیکھا۔

"آپ کو انکل رشید سے چڑ کیوں ہوتی ہے؟"

"اس لیے کہ انھوں نے اس گھر کی راہ ہی دیکھ لی ہے۔ پہلے، مہینے دو بعد آتے تھے۔ اب مہینے میں ایک چکر ضروری ہو گیا ہے اور اس دفعہ تو میرے خیال میں تین ہفتے کے بعد ہی آدھمکے ہیں!"

حمیرا نے لمبی سی ہوں کی۔ حمیرا نے مسکراہٹ لبوں میں دبالی۔

ہاجرہ بیزاری سے بولی: "تین چار دن اب انہی کی نذر ہو جائیں گے"۔

حمیرا بولی: "رنگا رنگ کھانے بنیں گے۔ سویٹ ڈشز تو ضروری ہوں گی۔ پھر ان کا کمرا، بستر بھی صاف ستھرا ہونا چاہیے"۔

حمیرا بولی: "تمہیں تو نہیں کرنا پڑے گا سب کچھ"۔

"مجھے تو کرنا پڑے گا نا"۔ ہاجرہ اکتائے ہوئے انداز میں بولی۔

"میں آپ کی مدد کرنے کو جو ہوں"۔ حمیرا نے سوئی کپڑے میں ٹانکتے ہوئے کہا۔

ہاجرہ کچھ دیر چپ رہی۔ پھر کرسی سے اُٹھتے ہوئے بولی: "میں خود نپٹ لوں گی، ہاتھ دکھانا پڑیں گے۔ سبق سکھانا ہی پڑے گا ان کو"۔

"کیا مطلب امی؟" حمیرا نے جلدی سے پوچھا۔

"آؤ بھگت کر کر کے سر چڑھا لیا ہوا ہے رشید صاحب کو۔ بس اب سب کچھ بند۔ ایک دو دفعہ ہی سرد مہری برتی نا تو پھر ادھر کا رخ نہیں کریں گے"۔

"ہائے امّی"۔ حمیرا بولی: "ابّو آپ پر خفا ہوں گے"۔

"ہوتے رہیں۔ ان کا آنا جانا تو بند ہو گا۔ وہ تو بچے جاتے ہیں رشید صاحب کے سامنے۔" ہاجرہ نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔

"پھر وہی امّی"۔ حمیرا جلدی سے بولی: "ابّو کی عادت ہے عادت۔ وہ تو چھوٹا ہو یا بڑا، امیر ہو یا غریب، سب کی تواضع دل و جان سے کرتے ہیں"۔

"واقعی!" حمیرا بولی: "پچھلے دنوں اسلم ماموں کا اردلی آیا تھا۔ کتنی محبت اور پیار سے خاطریں کی تھیں اس کی ابّو نے۔ انڈوں کا حلوہ، روسٹ مُرغ، شامی کباب..... اور..... اور....."

"بڑی اچھی عادت ہے؟" ماں نے پلٹ کر بیٹی کو طنز سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں کیا شک ہے؟" حمیرا بولی۔ "اللہ میاں شاید اسی لیے ابّو پر اپنی نوازشیں عام کرتا ہے..... بہت کچھ دے رہا ہے وہ ابّو کو"۔

ہاجرہ سے بات نہ بن آئی۔ منہ بنایا اور بڑبڑاتے ہوئے کچن کی طرف بڑھی۔

حمیرا نے آواز دے دی۔ "امی رشید صاحب کب آرہے ہیں؟"

حمیرا مسکرانے لگی۔ ہاجرہ نے وہیں سے جواب دیا۔ "شام چائے گھر پہ ہی پئیں گے؟"

"رات کھانا بھی کھائیں گے؟" حمیرا نے جان بوجھ کر پوچھا۔

ہاجرہ نے کھا جانے والی نظروں سے حمیرا کو دیکھا اور تلخی سے بولی: "رات سوئیں گے بھی یہاں ہی؟"

حمیرا فریم اور کپڑا رکھتے ہوئے بولی: "گیسٹ روم صاف کروا دوں کئی دن سے چادر نہیں بدلی بستر کی"۔

ہاجرہ ناگواری سے بولی: "کوئی ضرورت نہیں چادر

بدلنے کی۔ وہی بستر رہنے دو"۔

"ہائے امی!" دونوں بہنوں نے ایک ساتھ کہا۔ پھر حمیرا بولی: "اسلم ماموں کا اردلی اسی بستر پر سویا تھا۔ جب سے بستر بدلا ہی نہیں"۔

"تو کیا ہوا۔ انسان ہی تھا وہ بھی۔ پھر ایک رات سونے سے چادر میلی نہیں ہوگئی"۔ ہاجرہ نے ڈانٹا۔

"اور لحاف.....؟"

"وہ بھی وہی ٹھیک ہے"۔

"چھینٹ کا؟"

"ریشمی لحاف رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں"۔

اب دونوں بہنیں سنجیدہ سی نظر آنے لگیں۔ اتنا معزز آدمی آ رہا تھا اور ہر بار جس طرح ان کے لیے کمر اسیٹ کیا جاتا تھا۔ اب امی کو اتنی چڑ ہونے لگی تھی کہ بستر کی میلی چادر تک بدلنے نہیں دے رہی تھیں۔ چھینٹ کا لحاف پڑا تھا حالانکہ پچھلی دفعہ انھیں شنیل کی نئی رضائی اوڑھنے کو دی گئی تھی۔

"امی کو تو بیچارے رشید صاحب سے خواہ مخواہ کی چڑ ہونے لگی ہے"۔ حمیرا نے کہا۔

"ہاں! اوپر تلے تین چار مرتبہ جو آئے ہیں"۔

"بھئی اس کا کام ہی ایسا ہے"۔

"مہمان داری سے تنگ آ گئی ہیں امی!"

"یہ بات نہیں۔ مہمان تو آتے ہی رہتے ہیں۔ کون سا دن خالی جاتا ہے۔ بس امی کو جس سے چڑ ہو جائے"۔

"بیچارے انکل اچھے بہت ہیں۔ کتنے خوش مزاج ہیں اور کیسی شفقت سے ملتے ہیں"۔

"خالی ہاتھی بھی کبھی نہیں آتے"۔

"بھئی سمجھ دار آدمی ہیں۔ یہ بھی ایک طرح کی ریٹرن ہوتی ہے نا"۔

"اب امی کو کون سمجھائے"۔

"ہوں لگتا ہے امی آج کھانے میں بھی گھپلا کریں گی"۔

"آج تو ضرورت سے زیادہ ہی چڑ گئی ہیں"۔

"بُری بات ہے"۔

"ابو سے لڑائی ہوگی"۔

"سو فیصد یقینی بات ہے۔ پہلے تو گیسٹ روم کی حالت دیکھ کر ہی ابو برس پڑیں گے"۔

"وہ تو ضرور ٹھیک کرنی چاہیے"۔

"ہاں"۔

حمیرا نے سوئی کپڑے میں ٹانکی، قمیص تہ کی۔ دھاگے سمیٹ کر ٹوکری میں رکھے اور اُٹھتے ہوئے بولی: "میں گیسٹ روم تو صاف کروا دوں"۔

"بستر بھی بدل دینا۔ امی کے غصے کی پروا نہ کرو"۔

"لیکن کھانے کا؟"

"چلو کوئی بات نہیں۔ کچھ نہ کچھ تو پکے گا۔ فریز کی ہوئی کئی چیزیں رکھی ہیں منٹوں میں اچھا خاصا ڈنر تیار ہو جاتا ہے"۔

"لیکن کرے گا کوئی کیسے؟"

"ابو کروا لیں گے لیکن تم فکر نہ کرو"۔

"یہ بات تم نے ٹھیک کہی۔ ابو تو مہمان کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سمجھتے ہیں"۔

سمیرا ہنس پڑی۔ شوخی سے بولی: "یہ تو ہے ابو کا نظریہ۔ امی کی بات سن لو۔ کہتی ہیں۔ ایک نقطہ بھی بن جائے تو زحمت سے زحمت بن جاتی ہے"۔

دونوں ہنس پڑیں۔

"رشید انکل۔ آج کل امی کے لیے نقطہ بڑھ جانے سے زحمت بنے ہوئے ہیں۔ سمجھیں"۔

"اگر رشید انکل کو ذرا سی بھنک پڑ گئی کہ امی ان کی ایسی بیری بو رہی ہیں انھیں مہمان نہیں، بلائے جان سمجھنے لگی ہیں تو کتنا بُرا ہوگا"۔

"ہاں۔ یہ بات تو ہے لیکن انھیں بھنک پڑے گی کیوں

کر۔ ہم دونوں ہیں، ابو ہیں۔ ان کی خاطر مدارت میں کسی طور کمی نہ آنے دیں گے۔ ان سے ہمیشہ کی طرح ملیں گے۔ ان کے ساتھ گپ شپ لگائیں گے۔ ان کی باتیں سنیں گے۔ ان سے باتیں کریں گے۔ ذرا بھی محسوس نہ ہونے دیں گے انھیں"۔

"لیکن کب تک وہ تو تقریباً ہر مہینے آتے ہیں اور آتے رہیں گے"۔

"شاید یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے"۔

"کیسے؟"

"ابو کہہ رہے تھے کہ ان کا بڑا بیٹا جو ایف۔ آر۔ سی۔ ایس کر کے آیا ہوا ہے وہ لاہور میں سیٹل ہونا چاہتا ہے۔ بیٹے کا گھر یہاں ہوگا تو ان کا مسئلہ ختم ہو جائے گا"۔

"ساتھ ہی ہمارا بھی"۔

"ہمارا تو نہیں امی کا کہو۔ ابو تو ان کے آنے سے بہت خوش ہوتے ہیں"۔

"مہمان نوازی ابو کی گھٹی میں پڑی ہے نا"۔

"بالکل..... انھیں مہمان کی عزت و خاطر کر کے واقعی خوشی ہوتی ہے"۔

"خوش تو امی بھی ہوتی ہیں۔ جانے رشید انکل سے کیوں چڑنے لگی ہیں....."

حمیرا کچھ کہنے ہی کو تھی کہ کچن سے امی نے آواز دی۔

"آئی امی"۔ کہتے ہوئے اس نے ٹوکری میز پر رکھی اور کچن میں چلی گئی۔

سمیرا اپنی کاپی بنانے میں مصروف ہوگئی۔

رشید صاحب ادھیڑ عمر کے بڑے معقول قسم کے آدمی تھے۔ فیصل آباد میں رہتے تھے۔ بہت بڑا بزنس تھا۔ فرید سے رشتہ داری کے ناطے ایک تقریب میں ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات دوستی کی ابتدا بن گئی۔ دونوں کے مزاج ایک سے تھے۔ مزاجوں کی ہم آہنگی نے دوستی کی مضبوطی اور پائیداری کی بنیاد رکھی.....

رشید صاحب کو کاروبار کے سلسلے میں اکثر لاہور آنا پڑتا تھا۔ وہ جب بھی آتے فرید سے مل کر جاتے لیکن اتنی جلدی میں ہوتے کہ ملاقات ایک آدھ گھنٹے ہی کی ہوتی۔ ایک بار فرید نے اصرار سے انھیں روکا، اپنے ہاں ٹھہرایا۔ باتوں ہی باتوں میں رشید صاحب کی پرابلم پتا چلی۔ وہ ہوٹلوں میں نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ اکثر وہ صبح آتے اور شام کو واپس لوٹ جاتے۔ کئی دفعہ یوں بھی ہوا کہ کام ایک دن میں نہیں نمٹتا تو انھیں دو دو تین تین دن فیصل آباد سے روزانہ آنا پڑتا۔ یہ ساری باتیں فرید کو معلوم ہوئیں۔ پھر کیسے ممکن تھا کہ وہ رشید صاحب کی تکلیف کا احساس نہ کریں۔ دوستی بے تکلفی میں بدل چکی تھی۔ فرید نے انھیں مجبور کیا کہ وہ اس گھر کو اپنا گھر سمجھیں۔ جب بھی لاہور آئیں اس کے ہاں ٹھہریں۔ اطمینان سے اپنا کام کریں۔ جتنے دن ٹھہرنا ہو۔ اسی کے پاس ٹھہریں۔

محبت اور پیار سے اصرار ہوا تو رشید انکار نہ کر سکے۔ تب سے اب تک وہ جب بھی لاہور آتے۔ فرید کے گھر کو اپنا ہی گھر سمجھ کر آ جاتے۔ اس سے انھیں اپنے کاروبار کے امور طے کرنے میں بہت سہولت ہوگئی تھی۔ وہ فرید کے بے حد احسان مند تھے۔ فرید کے گھر کا ماحول بھی انھیں بہت پسند تھا۔ ان کی بچیاں انھیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ ملنساری، خلوص اور محبت کے اظہار میں وہ باپ سے بھی چند قدم آگے ہی تھیں۔

ہاجرہ بھی بڑے تپاک سے ان سے ملتی تھی۔ ان کی خاطر داری میں بھی پیش پیش تھی لیکن بار بار آنے اور قدر کھو دینے والی بات تھی شاید۔ کچھ فرید کی وجہ سے کہ وہ رشید پر مفتون ہی ہوئے جا رہے تھے۔ ہاجرہ چڑنے لگی تھی۔

رشید آ جاتے تو فرید کو واقعی جیسے کسی اور بات کا ہوش ہی نہ رہتا۔ رات بارہ بارہ ایک ایک بجے تک دونوں گپ شپ لگاتے۔ کبھی حالاتِ حاضرہ پر تبصرے، کبھی سیاست پر نکتہ

چینی، کبھی ادبی مباحثے اور کبھی تاش کی بازیاں۔ خوب محفل آباد ہوتی۔

جوں جوں دونوں کی دوستی گہری ہو رہی تھی توں توں ہاجرہ کا موڈ بدل رہا تھا۔ پچھلی دفعہ بھی رشید آئے تو اس نے بے دلی کا مظاہرہ کیا تھا لیکن کسی نے خاص محسوس نہیں کیا۔ ہاجرہ نے طبیعت کی خرابی ظاہر کی تھی اور سب یہی سمجھے تھے کہ ان کی طبیعت واقعی خراب ہے۔ ہاں فرید سے اس سلسلے میں گھٹ پٹ ہوئی تھی۔ فرید نے ملامت سے اسے سمجھایا تھا۔

''مہمان اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوتا ہے۔ پھر فرق کیا پڑتا ہے ایک آدمی کے آجانے سے، رشید کوئی گرے پڑے آدمی نہیں ہیں، جو ہوٹل کا خرچہ بچانے کے لیے یہاں چلے آتے ہیں۔ وہ تو لاکھوں کے مالک ہیں۔ ان کی دوستی پر مجھے فخر ہے۔ اتنا عظیم آدمی ہے وہ کہ تمہیں بتا نہیں سکتا''۔

ہاجرہ کچھ بولی نہیں تھی لیکن دل ہی دل میں بُغض نکالنے کی تدبیریں سوچتی رہتی تھی۔

اور

ان تدبیروں پر عمل پیرا ہونے کا اس نے اس دفعہ پکا پکا ارادہ کیا ہوا تھا۔

شام چائے کے لیے اس نے کوئی اہتمام نہیں کیا۔ رشید فرید کے ساتھ گھر آئے بچیاں حسب معمول ان سے تپاک سے ملیں۔ دونوں کو انھوں نے آتے ہی ایک ایک پیکٹ پکڑا دیا۔

''یہ کیا ہے انکل؟'' سمیرا نے پوچھا۔

''پتا نہیں''۔ رشید مسکرائے۔ ''کھول کر دیکھنا''۔

حمیرا نے ہاتھوں سے پیکٹ ٹٹولتے ہوئے کہا۔

''کپڑے ہیں''۔

رشید مسکراتے ہوئے بولے: ''بھئی تمہاری آنٹی تو ہیں نہیں۔ نہ ہی میری کوئی بیٹی ہے جو بتائے کہ تم لوگوں کے لیے مجھے کیسی چیزیں لانی چاہئیں بس جو ملتا ہے لپیٹ لاتا ہوں''۔

سمیرا نے وہیں پیکٹ کھولا: ''بڑے خوبصورت رنگوں کا سوٹ اور میچنگ دوپٹا تھا۔ ''ہائے کتنا پیارا ہے۔ شکریہ انکل''۔ سمیرا نے ریشمی سوٹ اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''رشید یہ زیادتی ہے''۔ فرید نے قیمتی سلکی سوٹ دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم چپ رہو جی، میرا اور بیٹیوں کا معاملہ ہے۔'' رشید نے بڑے پیار سے حمیرا کو دیکھا جو اپنا پیکٹ کھول رہی تھی۔

اس میں بھی سلکی سوٹ اور اسی پرنٹ کا خوبصورت دوپٹا تھا۔ حمیرا بھی خوش ہوئی۔

''شکریہ انکل''۔ اس نے بھی کہا۔

''بھئی رشید!'' فرید بولے۔

''ہوں''۔

''آئندہ اس قسم کے تکلفات نہ ہوں''۔

''پھر تم بولے، میں کہہ رہا ہوں۔ یہ میرا اور بیٹیوں کا معاملہ ہے۔ تم خواہ مخواہ دخل نہ دو''۔

''نہیں بھئی! بُری بات ہے!''

''کیوں۔ بُری کیوں؟ تم ان کے لیے چیزیں نہیں لاتے؟''

''وہ تو ٹھیک ہے..... لیکن.....''

''لیکن یہی نا کہ وہ تمہاری بیٹیاں ہیں..... اس لیے تم ان کے لیے چیزیں لا سکتے ہو اور چونکہ وہ میری بیٹیاں نہیں ہیں..... اس.....''

''اوہو.....''۔ فرید خفت محسوس کرتے ہوئے بولے۔

''انکل آپ ایسا نہ کہیں۔ ہم آپ کی بھی بیٹیاں ہیں''۔

رشید بولے: ''تو پھر اپنے ابو کو سمجھا لو۔ دخل در معقولات نہ کیا کریں''۔

دونوں رشید کے دائیں بائیں آ بیٹھیں۔ رشید نے دونوں کے سروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکرا کر فرید کو دیکھا۔

ہاجرہ بھی تھوڑی دیر کے لیے اندر آئی تھی۔ سوائے علیک

سلیک کے کوئی بات نہ کی۔ دونوں بہنوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسری کو اشارے کیے۔

''ہاں بیٹا''۔ فرید چند لمحوں بعد بولے: ''تمہارے انکل نے کسی سے ملنے جانا ہے۔ جلدی سے چائے لے آؤ''۔

رشید نے گھڑی دیکھی اور بولے: ''چائے وہیں پی لیں گے''۔

حمیرا نے جلدی سے کہا۔ ''ہائے نہیں انکل۔ چائے پی کر جائیں''۔

''بالکل''۔ سمیرا اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''ابو چائے پیے بغیر نہیں جانا..... انکل نے''۔

فرید ہنس کر بولا: ''میں کون سا جانے دوں گا انھیں۔ تم جلدی سے چائے لے آؤ''۔

''بہت اچھا!''

دونوں بہنیں اپنی چیزیں اٹھائے لاؤنج میں آ گئیں۔

''حمیرا''۔ سمیرا بولی۔

''ہوں!''

''امی کچھ بھی کہیں چائے حسب معمول اچھی ہونی چاہیے!''

''مجھے تو امی سے ڈر لگتا ہے''۔ حمیرا نے کپڑے میز پر رکھ دیے''۔

''میں بناتی ہوں۔ تم برتن نکالو''۔ سمیرا نے بھی اپنا سوٹ وہیں رکھا۔

پھر دونوں کچن میں گھس گئیں۔

ملازم لڑکا ترے میں روزمرہ کے استعمال کے برتن رکھ رہا تھا۔ کیتلی میں پانی ابل رہا تھا۔ دوسرے چولہے پر دودھ کی دیگچی تھی اور ایک پلیٹ میں سوکھے سڑے بسکٹ رکھے تھے۔

''یہ برتن؟'' حمیرا نے لڑکے سے پوچھا۔

''بیگم صاحبہ نے کہا ہے انہی برتنوں میں چائے دوں!''

''چپ رہ''۔ سمیرا بولی۔

''تم ٹی سیٹ نکال لاؤ الماری سے''۔ حمیرا نے سمیرا سے کہا: ''میں کباب تل لوں۔ ساتھ نیپکن بھی لے آنا اور چمچ بھی نئے نکالنا''۔

''تم چیزیں تیار کرو۔ میں ابھی لاتی ہوں''۔

حمیرا فریز کیے ہوئے کباب نکالنے لگی۔ رس ملائی بھی پڑی تھی۔ دو تین چیزیں چائے کے ساتھ ہونی چاہیے تھیں۔ وہ انھیں برتنوں میں لگانے لگی۔

ہاجرہ نے تو آج بے مروّتی کا مظاہرہ کرنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ اس مہمان بلائے جان کو سبق جو سکھانا تھا۔ نوکر کو چائے بنا کر ڈرائنگ روم میں پہنچانے کا کہہ کر وہ کچن سے چلی گئی تھی۔

اس وقت اتفاقاً ہی وہ ڈرائنگ روم کے برابر والے کمرے میں آئی۔ رشید اور فرید کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دونوں گپ شپ میں مصروف تھے۔

ہاجرہ الماری سے چابیاں نکال رہی تھی کہ اس کے کانوں میں رشید صاحب کے الفاظ اُتر گئے۔ وہ فرید سے کہہ رہے تھے۔

''میں اس دفعہ تم سے کچھ مانگوں گا''۔

ہاجرہ نے مانگنے کا لفظ کیا سنا، آگ ہی لگ گئی تن بدن میں۔

''ہوں''۔ اس نے دانت پیستے ہوئے اپنے آپ سے کہا: ''نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے''۔

وہ شاید کان لگا کر ان کی اور باتیں بھی سنتی لیکن ٹیلی فون کی گھنٹی نے چونکا دیا۔ وہ فون کی طرف آئی۔ کسی ملنے والی کا فون تھا۔ وہ باتوں میں لگ گئی اور یہی موقع غنیمت جان کر حمیرا سمیرا پُرتکلف سی چائے ٹرالی پر سجا کر ڈرائنگ روم میں لے گئیں۔

''بیٹے امی کو بھی بلاؤ نا''۔ فرید نے کہا۔

سمیرا امی کو بلانے چلی گئی۔

لیکن

امی تو جیسے آتش زیرِ پا تھیں۔ سمیرا پر ہی برس پڑیں۔

''نہیں پینی مجھے چائے.....''

''امی پلیز!''

''میں کہتی ہوں نہیں پینی مجھے چائے!''

''ہوا کیا ہے امی.....''

''پتا چل جائے گا سب کو۔ میں بھی کہتی تھی کہ رشید ان پر ڈورے کیوں ڈال رہا ہے۔ اب پتا چلا''۔

''کیا امی؟'' سمیرا ماں کے پاس پلنگ پر بیٹھ کر متفکر لہجے میں بولی۔

ہاجرہ جیسے اپنے آپ ہی سے کہہ رہی تھی: ''ایک پیسا نہ دینے دوں گی ہو جائے لڑائی۔ نہیں دینے دوں گی''۔

''کیا نہیں دینے دیں گی؟''

''یہ جو بڑا بنتا پھرتا ہے نا بزنس مین۔ اب آ گیا اپنی اصلیت پر۔ اس دفعہ مانگنے آیا ہے۔ پاؤں پسارے ہی جا رہا ہے۔ ٹھہرنے کی جگہ بنائی۔ اب پیسا بٹورے گا۔ میں تو کہتی ہوں تیرے باپ کو بھی عقل آئے گی ہی نہیں۔ اچھا ہے لٹا دے رکھی رکھائی اس پر، گھر بار کی کیا فکر ہے اسے بیٹیاں جوان ہیں ان کے لیے کچھ نہ رکھے۔ دے دے سب کچھ اپنے دوست کو''۔

ہاجرہ اوٹ پٹانگ مارے جا رہی تھی۔ سمیرا کی سمجھ میں تو کچھ نہ آیا انکل نے جلدی چلے جانا تھا اس لیے اٹھ کر آ گئی۔

''بھابی!'' رشید نے پوچھا۔

''پڑوس والی آنٹی آ گئی ہیں''۔ سمیرا نے جھوٹ گھڑا۔ ''امی کہتی ہیں آپ چائے پی لیں''۔

''ٹھیک ہے''۔ فرید بولے۔

''چلو رات کھانے کے بعد گپ شپ لگائیں گے''۔ رشید نے مسکرا کر فرید کو دیکھا۔ فرید کے چہرے پر بڑے خوشگوار تاثرات تھے۔

چائے جلدی جلدی پی گئی۔ رشید نے گھڑی دیکھی۔ ''چلو بھئی فرید یہ نہ ہو، دیر سے پہنچیں اور پارٹی ہاتھ سے نکل جائے''۔

''چلو.....''

دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''واپس کب آئیں گے''۔ وہ بولے۔ ''نو بجے تک''۔

''کھانا گھر پہ ہی کھائیں گے''۔ فرید نے کہا ''بیٹے آج انکل کے لیے کوئی اسپیشل ڈش بناؤ۔ انکل تم دونوں کا ٹیسٹ لیں گے''۔ فرید نے خوشی سے لہراتے ہوئے کہا۔

''نہیں بھئی نہیں''۔ رشید مسکرائے۔ ''ہماری بیٹیوں پر کوئی بار نہیں ڈالو۔ بہت کچھ کھا چکے ہیں ہم ان کے ہاتھوں کا۔ اللہ انھیں ہمیشہ خوش رکھے''۔

''آمین.....'' فرید نے کہا۔

سمیرا اور سمیرا نے دونوں کو دیکھا۔

''چلو بھئی''۔ رشید قدم اٹھاتے ہوئے بولے۔

''چلو''۔ فرید نے کہا۔

دونوں آگے پیچھے کمرے سے نکل گئے۔

ان کے جاتے ہی سمیرا بولی۔ ''آج ابو اور انکل کچھ زیادہ ہی خوش نظر آ رہے ہیں''۔

سمیرا نے تائید کرتے ہوئے ہنس کر کہا: ''اللہ کرے یہ خوشی راس ہی آئے۔ امی تو رنگ میں بھنگ ڈالنے پر تلی بیٹھی ہیں''۔

''ہاں سمیرا۔ امی تو بہت غصے میں ہیں۔ انھیں پتا چلا ہے کہ رشید صاحب ابو سے کوئی قرض ورض مانگ رہے ہیں''۔

''واقعی!'' سمیرا دھم سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

امی ہی کہہ رہی تھیں''۔

''لیکن انکل تو اتنے مالدار ہیں۔ انھیں قرض لینے کی کیا ضرورت؟''

''پتا نہیں''۔ سمیرا نے سر جھٹکا۔ پھر ٹرالی پر برتن رکھتے ہوئے بولی: ''امی تو بڑے غصے میں تھیں۔ جب میں چائے

کے لیے بلانے گئی''۔

سمیرا ساری باتیں حمیرا کو بتانے لگی۔ حمیرا خاصی متفکر نظر آنے لگی۔

سمیرا نے ٹرالی پر برتن رکھ لیے، حمیرا بھی اٹھی۔ دونوں بہنیں باتیں کرتی کمرے سے نکل گئیں۔

امی اب لاؤنج میں تھیں۔ موڈ آف تھا اس لیے ان سے رات کے کھانے کے متعلق کوئی بات کرنا ہی فضول تھی۔ حمیرا اپنے کمرے میں چل دی اور سمیرا میز پر رکھے کپڑے اٹھا کر امی کو دکھانے لگی۔ اس کا خیال تھا سوٹ دیکھ کر امی کا پارہ نیچے آ جائے گا۔

''دیکھیں امی! کتنے پیارے جوڑے ہیں''۔

''میرا پسندیدہ رنگ ہے یہ''۔

''حمیرا کا دوپٹا بہت پیارا ہے''۔

''کافی قیمتی لگتے ہیں۔ فرنچ شیفون کے دوپٹے ہیں۔ سوٹ بھی سلک کے ہیں۔ دیکھیں نا امی!''

سمیرا نے کپڑے ماں کی گود میں ڈال دیے۔ جنھیں ایک ہی جھٹکے کے ساتھ ہاجرہ نے قالین پر پھینک دیا۔

''ہائے امی!'' سمیرا کپڑے اکٹھے کرنے کو جھکی۔

''یہ سب پیش بندی کے طور پر ہے''۔ ہاجرہ غرائی۔ ''دانہ ڈال رہا ہے وہ۔ سب جانتی ہوں میں۔ بڑا آیا اتنے قیمتی تحفے لانے والا''۔

سمیرا ہولے سے بولی: ''ان کے لیے کیا قیمتی ہیں۔ لاکھوں کے مالک ہیں وہ''۔

''بس رہنے دے۔ لاکھوں کے مالک ہیں تو قرضے کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے تو یہ آدمی فراڈ لگتا ہے پہلے پٹوڑا الا اب مطلب نکالے گا لیکن میں بھی ایک دھیلا نہیں دینے دوں گی۔ کرلے کیا کرے گا تیرا باپ''۔

''امی!'' سمیرا بولی۔ ''آپ نے پوری بات تو سنی نہیں۔ ہو سکتا ہے اچانک ہی کوئی ضرورت پڑ گئی ہو۔ فیصل آباد جاتے ہی بھجوا دینا چاہتے ہوں۔ انسان ایک دوسرے کے کام آتا ہی ہے۔ فیروز ماموں نے بھی تو ابو سے قرض لیا ہوا ہے دو ماہ کا وعدہ تھا۔ سال ہو رہا ہے''۔

ہاجرہ نے خشمگیں نگاہوں سے بیٹی کو دیکھا۔ پھر غصے سے بولی: ''تُو تو طعنے دے لے فیروز ماموں کے۔ کھا تو نہیں جائے گا۔ لوٹا ہی دے گا''۔

''میں بھی تو یہی کہہ رہی ہوں۔ انکل بھی لوٹا دیں گے۔ وقتی طور پر مانگنے کی ضرورت پڑ گئی ہے اگر..... تو کون سی قیامت آ گئی''۔

ہاجرہ بُڑبُڑ ہو کر رہ گئی۔ سمیرا نے اور کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ کپڑے سمیٹے اور حمیرا کے کمرے میں آ گئی۔

رات کھانے پر بھی ہاجرہ نے کوئی اہتمام نہیں کیا۔ دال چاول بنوائے اور دوپہر کا بچا آلو قیمہ ساتھ رکھنے کو نوکر سے کہہ دیا۔

حمیرا اور سمیرا اپنے کمرے میں گھسی رہیں۔ کڑھتی بھی رہیں اور امی کی باتوں پر تبصرے بھی کیے لیکن ماں کا موڈ جس طرح خراب تھا انھیں جرأت ہی نہ ہوئی کہ کھانے کا اہتمام کریں۔

سمیرا نے تو کہہ دیا: ''ہمیں کیا۔ ابو سمجھ لیں گے امی سے۔ آج تو لڑائی ہو کر ہی رہے گی ان کی''۔

حمیرا سنجیدگی سے بولی: ''لڑائی انکل کے سامنے نہ ہی ہو تو اچھا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ابو آئیں تو انھیں پہلے سے صورتِ حال سے مطلع کر دیا جائے تاکہ محتاط ہی رہیں''۔

سمیرا: ''ٹھیک ہے۔ وہ خود ہی کھانا بھی بنوائیں گے''۔

''فریز کیے ہوئے سالن پڑے ہیں۔ مرغ بھی ابلے رکھے ہیں اور گوشت بھی''۔

''بہت کچھ ہے۔ بہتر ہے چپ ہی رہیں ہم''۔

''ہاں!''

پھر سمیرا نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی: ''یا اللہ، مہمان

کے سامنے آج ہماری عزت ہی رکھنا"۔

"آمین"۔ حمیرا نے بھی کہا۔

رات پونے نو بجے کے قریب رشید اور فرید واپس آئے۔ رشید کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر فرید اندر آئے۔

"ہاجرہ"۔ لاؤنج میں کسی کو نہ پا کر انھوں نے آواز دی۔

"بیگم صاحبہ اپنے کمرے میں ہیں جی"۔ صوفے کے قریب قالین پر بیٹھا ملازم لڑکا اُٹھ کھڑا ہوا۔

فرید سیدھے اپنے کمرے میں گئے۔

ہاجرہ بستر پر پڑی تھی۔

"بھئی سو گئیں کیا؟" فرید نے لائٹ جلائی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ ہاجرہ بیزار سی اُٹھ بیٹھی۔

"ابھی تو پونے نو ہی ہوئے ہیں۔ تم آج اتنی جلدی بستر میں آ گئیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہی ہے!"

فرید نے اطمینان کا سانس لیا۔ مسکرا کر ہاجرہ کو دیکھا "اٹھو بھئی! ابھی سے سو جانے کا پروگرام غلط ہے"۔

"کیوں" وہ تیکھے لہجے میں بولی۔ فرید نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ وہ تو بے حد خوش نظر آ رہے تھے۔

"تو بھی نہیں بجے بیگم صاحبہ"۔

"رت جگا آپ نے کرنا ہے مجھے تو نہیں"۔

"آج تو تمہیں بھی اس رت جگے میں شامل کریں گے"۔

"ہونہہ"۔

"ہونہہ نہیں"۔ فرید نے ہنستے ہوئے ہونہہ کی نقل اتاری۔ "سچ مچ!"

"زبردستی تھوڑا ہی ہے"۔

"ہے"۔

وہ ہنس پڑے۔ ہاجرہ جل کر بولی: "بہت خوش ہیں"۔

"بہت ..... بہت ..... بہت ہی زیادہ"۔ فرید نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

وہ جلی بھنی تھی بولی: "رشید صاحب کے آنے سے خوش ہیں؟"

"ہاں!" وہ بولے

"مبارک ہو"۔

"اللہ مبارک کرے"۔

ہاجرہ نے ان کی بات سمجھے بغیر ان کی طرف گھور کر دیکھا۔

"ہاجرہ"۔ فرید چہکتے ہوئے اس کی طرف جھکے۔

"پتا ہے رشید صاحب آج ہم سے کچھ مانگنے آئے ہیں"۔

وہ ایک دم بھڑک اٹھی۔ "جی پتا ہے مجھے لیکن ایک پیسا نہیں دینے دوں گی"۔

فرید حیران ہو کر جھٹکے سے پیچھے ہٹے ..... "پیسا؟"

"ہاں ہاں۔ ایک پیسا نہیں دینے دوں گی قرض۔ سمجھے آپ!"

"کیا کہہ رہی ہو۔ کس کو دینا ہے قرض؟"

"رشید صاحب کو"۔

"انھوں نے کب مانگا ہے قرض!"

"تو اور کیا مانگنے آئے ہیں؟"

ہاجرہ تنک کر بولی تو فرید چند ثانیے اسے تکتے رہے۔ پھر بولے: "کس نے کہا تم سے؟"

ہاجرہ اسی لہجے میں بولی: "میں نے خود سنا ہے وہ آپ سے کہہ رہے تھے کہ اس دفعہ کچھ مانگنے آئے ہیں"۔

فرید سمجھ گئے۔ ہاجرہ کو گھور کر دیکھا اور پھر کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

ہاجرہ کا غصہ کم نہیں ہوا۔ "سچ کہتی ہوں۔ بے شک لڑائی ہو جائے لیکن ایک پیسا بھی نہیں دینے دوں گی آپ کو"۔

"بے وقوف عورت"۔ فرید نے خوشی کا اظہار کرتے

بقیہ حصہ (مہمان)

ہوئے کہا: "وہ پیسا تھوڑا ہی مانگنے آئے ہیں۔ ان کے پاس اللہ کا دیا اتنا کچھ ہے کہ....."

"تو پھر کیا مانگنے آئے ہیں؟" ہاجرہ نے کسی قدر دبتے ہوئے تیز لہجے میں پوچھا۔

"سنو گی تو خوشی سے پاگل ہو جاؤ گی"۔ فرید چہکے۔

"سنو تو....." ہاجرہ نرم پڑ گئی۔

"ارے پگلی! وہ آج کچھ مانگنے آئے ہیں"۔

"قرض تو میں دینے کو نہیں..... اور کیا مانگیں گے"۔

"حمیرا اور سمیرا کو....." فرید نے ایک دم کہہ دیا۔

"کیا..... کیا؟" ہاجرہ سمجھ نہ پائی۔ اس کی آنکھیں اور منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

فرید بیڈ سے اُٹھے۔ من میں قتل کرتے خوشیوں کے سوتے پھوٹتے تھے۔ وہ کسی مسرور نغمے کی طرح گنگنائے۔

"ان کا بڑا بیٹا ایف۔ آر۔ سی۔ ایس کر کے واپس آیا ہے۔ چھوٹا بیٹا چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہے۔ دونوں کے لیے انھوں نے حمیرا اور سمیرا کو مانگا ہے"۔

"سچ؟" ہاجرہ کے منہ سے صرف اسی قدر نکلا۔

"ہاں ہاں۔ بالکل سچ"۔ فرید بولے۔ "انھوں نے مجھ سے کھل کر بات کی ہے۔ بیچارے کی بیوی ہے نہ بیٹی۔ اس لیے رشتے خود ہی مانگنے ہیں۔ تم بچیوں کے متعلق فکر مند رہتی تھی نا۔ دیکھا اللہ نے کیسا سبب بنا دیا۔ رشید صاحب کو ہمارے خلوص، ملنساری اور مہمان نوازی نے اتنا متاثر اور مرعوب کیا ہے کہ انھوں نے دونوں بیٹوں کا رشتہ یہاں کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے"۔

فرید کہہ رہے تھے اور ہاجرہ یقین اور بے یقینی کے بین بین صرف ان کا منہ تکے جا رہی تھی۔

"اپنی حمیرا اور سمیرا کا نصیبہ جاگ اٹھا ہے بیگم صاحبہ۔ ایسا گھر کہاں سے ملنا تھا۔ لاکھوں کا بزنس ہے رشید صاحب کا۔ کوٹھی ایسی شان دار ہے کہ لوگ دیکھنے آتے ہیں اور بھی بڑی جائیداد ہے۔ اس پر لڑکے اتنے شریف اور لائق..... اور کیا چاہیے تھا ہمیں۔ اللہ نے ہماری سُن لی۔ ہماری خدمت گزاری اور مہمان نوازی کام آ گئی"۔

فرید نے ہاجرہ کی طرف دیکھا۔ پھر ہنس کر بولے: "ہر وقت لڑتی تھیں مجھ سے۔ یہ ہوتا ہے وہ ہوتا ہے"۔ میں نہ کہا کرتا تھا کہ:

"مہمان اللہ کی رحمت ہوتا ہے"۔

ہاجرہ کا سر جھک گیا۔ اتنی غیر متوقع خوشی ملی تھی کہ چند لمحے تو وہ یقین ہی نہ کر پائی تھی۔ جب یقین ہوا تو اپنے رویے پر خود ہی ندامت محسوس ہوئی۔

"آج رات کھانے کے بعد رشید صاحب تم سے خود رشتہ مانگیں گے۔ جلدی کرو اب کھانا لگواؤ تا کہ آرام سے بیٹھ کر باتیں ہو سکیں"۔

"کھانا؟" ہاجرہ نے سینے پر ہولے سے ہاتھ مارا۔ پھر انگلی دانتوں میں داب لی۔

فرید نے اس کی طرف نہیں دیکھا وہ کمرے سے نکل رہے تھے وہیں سے بولے: "ہاں کھانا لگاؤ۔ میں رشید صاحب سے کہتا ہوں۔ گیسٹ رُوم میں جا کر سامان رکھوا لیں۔ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بھی بدل لیں"۔

"نہیں نہیں"۔ ہاجرہ ان کے پیچھے لپکی۔ "ابھی نہیں۔ آپ رشید صاحب سے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر باتیں کریں۔ گیسٹ روم صاف تو کروا لوں"۔

فرید نے کچھ کہا یا نہیں۔

وہ سنے بغیر ہی کمرے سے باہر دوڑی۔ فرید ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ ہاجرہ نے لاؤنج میں کھڑے کھڑے ملازم، حمیرا اور سمیرا کو اوپر تلے کئی آوازیں دے ڈالیں وہ

بے حد گھبرائی ہوئی تھیں۔

ملازم جھٹ کچن سے نکل آیا۔

''اے حمیرا!''..... اس نے زور سے آواز دی۔

''جی امّی''۔ حمیرا..... سمیرا دوڑی آئیں۔

امی سراسیمگی کے عالم میں کھڑی انھیں پکارے جا رہی تھیں۔ دونوں اس کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔

''اے ہے۔ میرا منہ کیا تک رہی ہو۔ جلدی کرو..... اے لڑکے چل سٹور میں سے نئی چادر اور تکیے کے غلاف نکال لا۔ پرنٹڈ سلک کی نئی رضائی بھی''۔

حمیرا اور سمیرا نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

امی برسنے کے انداز میں بولیں: ''اب گم صم کھڑی رہو گی۔ جلدی سے کھانا تیار کراؤ''۔

''مرغ، گوشت، چانپیں سب کچھ پڑا ہے..... اچھا سا کھانا بنالو''۔

''امی!'' دونوں کے منہ سے حیرانی کے عالم میں نکلا۔

حمیرا بولی: ''رشید انکل کے لیے؟''

''تو اور کس کے لیے؟'' ہاجرہ نے تیزی سے کہا۔ ''رشید صاحب کے لیے، رشید صاحب کے لیے۔ سن لیا اب تو''۔

حمیرا نے سمیرا کی طرف دیکھا۔ یہ کایا پلٹ کیوں کر ہوئی۔ دونوں ہی نہ سمجھ پائیں۔ امی نے دھڑا دھڑ حکم دینے شروع کیے۔ ملازم لڑکے کو گیسٹ روم صاف کر کے نیا بستر لگانے کا حکم دیا۔ غسل خانے میں تولیہ، صابن، ٹوتھ پیسٹ وغیرہ رکھنے کو بھی کہا۔ حمیرا اور سمیرا اب بھی ایسے ہی کھڑی تھیں، امی نے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔

''کیا منہ تکے جا رہی ہو۔ سنا نہیں کیا کہا میں نے، پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔ تینوں چولھے جلا لو۔ جلدی جلدی بنالو..... ہاں نیا ڈنر سیٹ بھی نکال لو۔ یہ چیزیں آخر کس دن کے لیے رکھی ہیں۔ ان سے معزز اور کون آئے گا یہاں''۔

دونوں بہنیں اب بھی کچھ نہ سمجھیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں حیران ہو کے ایک دوسرے کو اشارے کیے۔

ماں نے دونوں کو کچن کی طرف دھکیلا۔

''امی!'' کچن میں جانے سے پہلے سمیرا بولی۔

''کیا ہے؟'' ہاجرہ پر اب بھی گھبراہٹ مسلط تھی۔

''کیا یہ سب کچھ آپ رشید انکل ہی کے لیے کروا رہی ہیں؟'' سمیرا نے شوخی سے کہا۔

حمیرا بھی مسکرا کر بولی: ''انھیں تو آپ نے سبق سکھانا تھا۔ مہمان بلائے جان''۔

''چپ رہ''۔ مسکراتے ہوئے ہاجرہ نے ڈانٹا۔ ''ایسے مہمان تو رحمت ہوتے ہیں رحمت.....''

دونوں اس معنی خیز مسکراہٹ اور مہمان کو زحمت کی بجائے رحمت کہنے پر اور بھی حیران ہوئیں۔

دونوں امی کے گرد کھڑی ہو کر اصرار سے پوچھنے لگیں۔

''یہ سب کایا پلٹ کیسے ہو گئی۔ آپ تو.....''

''چپ رہو۔ لڑکیاں باتیں نہیں پوچھا کرتیں.....''

ماں کے لہجے سے کچھ سمجھیں کچھ نہیں سمجھیں۔ ہاجرہ نے دونوں بیٹیوں کو بازوؤں میں سمیٹ کر پیار کرتے ہوئے نادم نادم لہجے میں کہا: ''مجھے کیا پتا تھا رشید صاحب، پیسا نہیں تم دونوں کو اپنے بیٹوں کے لیے مانگ رہے ہیں!''

''یچی!'' دونوں کے منہ سے بے اختیارانہ نکل گیا۔

لیکن

دوسرے لمحے میں انھوں نے اپنے چہرے ماں کے کندھوں پر رکھ دیے۔ وہ دونوں کو پیار کرتے ہوئے بولیں۔

''اب جلدی سے کھانا تیار کرلو۔ میں گیسٹ روم ٹھیک کروا دوں''۔

دونوں وفورِ مسرت سے لہراتیں کچن میں چلی گئیں..... اور ہاجرہ ملازم لڑکے کو آوازیں دیتی گیسٹ روم کی طرف بڑھ گئی۔

مہمان کی پزیرائی تو آج معمول سے بھی زیادہ کرنا تھی نا!۔

مرزا ہاؤس کی حلیم پارٹیاں

اختر بلوچ

نوابزادہ نصراللہ خان نے جب پولیس کو چکمہ دیا
کراچی کے ایک مرحوم سیاست داں کی
پُرلطف اور سدا بہار یادیں

کراچی کے سیاسی مقامات میں ایک اہم مقام مشتاق مرزا کا گھر تھا اور اب بھی ہے۔ مشتاق مرزا مشہور سیاستداں، نوابزادہ نصراللہ خان کے کراچی میں دستِ راست تھے۔ وہ نواب صاحب کی ڈیموکریٹک پارٹی کے سندھ میں روحِ رواں تھے۔ یوں تو ان کا گھر نوابزادہ نصراللہ خان کی کراچی آمد کے بعد سیاسی سرگرمیوں کا گڑھ بن جاتا تھا لیکن اس گھر کی بنیادی حیثیت گھر کا سیاسی کردار تھا، خصوصاً حزبِ اختلاف کے حوالے سے۔

جب جنرل ضیاالحق نے مارشل لاء نافذ کیا اور بار بار جلد از جلد انتخابات کا وعدہ کرنے کے باوجود بھی انتخابات نہ ہوئے تو مشتاق مرزا کا گھر جنرل ضیاالحق کے خلاف ہونے والی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ آیئے سب سے پہلے مشتاق مرزا کے مرزا ہاؤس کا پتا جانیں اور ان کی جانب سے منعقدہ حلیم پارٹی کا احوال بھی۔ یہ حلیم پارٹی سیاسی ہوتی تھی اور اس بہانے نہ صرف کراچی بلکہ پاکستان بھر کے سیاستداں اس میں شریک ہو کر اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔

مرزا ہاؤس کا پتا ۲۴۵/۲ بلاک بی ۶، پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی ہے۔ گو اب ان کے اہلِ خانہ مرزا ہاؤس سے ڈیفنس منتقل ہو گئے ہیں، لیکن اب بھی وہ گھر میں مشترکہ طور پر رہتے ہیں۔ مشتاق مرزا صاحب نے ۱۹۷۶ء میں پی ای سی ایچ ایس کے گھر میں رہائش اختیار کی۔ گھر کی سب سے بڑی اہمیت اس حوالے سے ہے کہ وہ ۱۹۷۶ء کے بعد حزبِ اختلاف کے راہنماؤں کا مسکن رہا۔

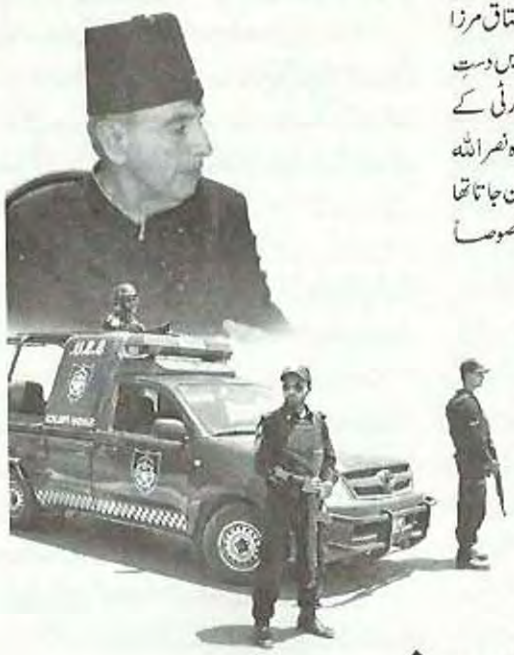

مشتاق مرزا نوابزادہ کی پاکستان جمہوری پارٹی کے صدر تھے۔ انتقال کے بعد ان کے بیٹے بشارت مرزا پارٹی کے صدر بن گئے۔ اس گھر میں منتقل ہونے سے قبل وہ گارڈن ایسٹ کے علاقے عثمان آباد میں رہائش پزیر تھے۔ عثمان آباد میں ہی انھوں نے حلیم کی دعوت کرنے کا آغاز کیا۔ پہلی دعوت میں حلیم کی دو دیگیں پکائیں، جو گھر ہی میں بنیں اور ان کے بچوں نے تمام رات گھوٹا لگا کر پکائی تھیں۔

لیکن نہ مشتاق مرزا اور گھوٹا لگانے والوں میں شامل ان کے بیٹوں، بشارت مرزا اور ارشد مرزا کو اس بات کا اندازہ تھا کہ حلیم کی یہ دعوت نہ صرف سیاسی حلیم پارٹی، بلکہ پاکستان کی سیاست میں بغاوت کی علامت ہو جائے گی۔ ۱۹۷۶ء میں جب عثمان آباد کی رہائش ترک کر کے مشتاق مرزا کا خاندان پی ای سی ایچ ایس منتقل ہوا تو ان دنوں ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف سیاسی تحریک کا آغاز ہی ہوا تھا۔

۱۹۷۷ء کے انتخابات ہوئے۔ پی پی پی کو کامیابی حاصل ہوئی لیکن ان کی یہ نصرت بہت دیر تک قائم نہیں رہی۔ ضیاالحق نے ایک عبوری حکومت قائم کردی۔ اس حکومت میں پی ڈی پی کے وزرا بھی شامل تھے لیکن بعد میں ان دونوں وزیروں نے استعفے دے دیے۔

مرزا ہاؤس کی نمایاں خصوصیت یہ رہی کہ ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف قومی اتحاد کی تحریک کا آغاز ہوا تو اس وقت مرزا ہاؤس بھٹو کے خلاف کراچی میں ہونے والے جلسوں کا مرکز تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ نوابزادہ نصراللہ خان کراچی آکر یہیں ٹھہرتے تھے۔ حزب اختلاف سے تعلق رکھنے والے راہنما ان سے ملاقات کرنے مرزا ہاؤس آتے۔ ان راہنماؤں میں شاہ مردان شاہ پیر پگارا، مولانا شاہ احمد نورانی، پروفیسر غفور کے علاوہ دیگر راہنما بھی شامل ہوتے۔

لیکن جب ضیاء الحق کے دور میں تحریک بحالی جمہوریت (ایم۔آر۔ڈی) کا آغاز ہوا تو مرزا ہاؤس ایک بار پھر حزب اختلاف کا مرکز ٹھہرا۔ ایم۔آر۔ڈی کی تشکیل میں مشتاق مرزا نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ محترمہ نصرت بھٹو اور نوابزادہ خان کی ملاقات کا بندوبست بھی مرزا صاحب نے کروایا تھا۔ پولیس اور ایجنسیوں کو اس کی اطلاع ہوگئی تھی۔ بشارت مرزا کے بقول والد نے ہمیں بھی اس جگہ کے بارے میں نہیں بتایا تھا جہاں ملاقات ہونی تھی۔

ملاقات کے روز پولیس اور خفیہ اداروں کے اہلکاروں نے مرزا ہاؤس کو مکمل طور پر اپنے گھیرے میں لے لیا تاکہ نوابزادہ اور نصرت بھٹو کی ملاقات کو کسی بھی طرح روکا جاسکے۔ دوسری جانب محترمہ نصرت بھٹو گھر سے برقع پہن کر خفیہ اہلکاروں کو چکمہ دے کر مقررہ مقام تک پہنچ چکی تھیں۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ نوابزادہ نصراللہ خان صاحب کو کس طرح گھر سے مقررہ مقام تک پہنچایا جائے۔ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ گھر کے پرانے ملازم، عبدالحق کو، جو نوابزادہ نصراللہ صاحب کی خدمت پر مامور تھا اور اس کی جسامت بھی انھی کے جیسی تھی، نوابزادہ نصراللہ کی شیروانی اور ترکی ٹوپی پہنا کر ایک کار کی اگلی نشست پر بٹھا دیا گیا اور بشارت مرزا خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئے۔

گاڑی جیسے ہی باہر نکلی، پولیس اور خفیہ اہلکاروں میں ہلچل مچ گئی۔ بشارت مرزا تیزی سے گاڑی کو شارع فیصل پر لے آئے اور رفتار بڑھا دی۔ شاہراہ فیصل پر گاڑیوں کا ایک ازدحام رواں دواں تھا اور پولیس کو پیچھا کرنے میں خاصی مشکل پیش آرہی تھی۔ آخر گورا قبرستان کے قریب موجود فنانس اینڈ ٹریڈ سینٹر کے قریب پولیس نے گاڑی کو گھیر لیا۔ اس دوران عبدالحق نے شیروانی اور ترکی ٹوپی اُتار دی تھی۔ پولیس نے گاڑی کے دروازے کھولے تاکہ نوابزادہ صاحب کو حراست میں لے سکے لیکن ان کی بے بسی دیکھنے کے قابل

تھی۔ انھوں نے نوابزادہ کو مرزا ہاؤس سے اپنے مخصوص حلیے میں روانہ ہوتے دیکھا تھا اور وہ وہیں سے گاڑی کا پیچھا کر رہے تھے۔ گاڑی راستے میں کہیں رُکی بھی نہیں تو نوابزادہ کہاں گئے؟

بشارت مرزا کے مطابق پولیس اور اہلکاروں نے ہمیں جانے کا اشارہ کیا لیکن ہمارا پیچھا کرتے رہے۔ ہم گھوم پھر کر دوبارہ مرزا ہاؤس آگئے۔ دوسری جانب ہمارے نکلتے ہی نوابزادہ صاحب گھر سے نکل کر مقررہ مقام پر پہنچ گئے۔ یوں ان کی اور نصرت بھٹو کی ملاقات ہوئی اور ایم آر ڈی کی تشکیل کے حوالے سے تمام معاملات طے پا گئے۔

۱۹۸۵ء میں جنرل ضیا صاحب کی طرف سے کروائے جانے والے غیر جماعتی انتخابات کے بائیکاٹ کا فیصلہ بھی مرزا ہاؤس میں ہوا تھا۔ جنرل مشرف نے جب نواز شریف کی حکومت کا تختہ الٹا یا تو یہ طے پایا کہ اس کے خلاف بھرپور احتجاج طارق روڈ پر واقع اللہ والی چورنگی پر کیا جائے گا۔ مقررہ مقام پر روانگی کے لیے تمام پارٹیوں کے راہنماؤں کو مرزا ہاؤس ہی سے روانہ ہونا تھا۔ متحدہ کا وفد بھی ڈاکٹر فاروق ستار اور کنور خالد یونس کی سربراہی میں مرزا ہاؤس پہنچا۔

نوابزادہ صاحب بھی مرزا ہاؤس میں موجود تھے۔ پولیس نے گھر کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا۔ ملازموں نے اطلاع دی کہ پولیس نے گھر کے باہر کھڑی ایک سوک کار سے اسلحہ برآمد کرنے کا دعویٰ کیا ہے اور کار مالک کو گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ یہ گاڑی متحدہ کے کسی راہنما کی تھی۔ پولیس اپنے روایتی حربوں پر اُتر آئی تھی۔ وہ متحدہ کے راہنماؤں کو گرفتار کر کے ان پر ناجائز اسلحے کا مقدمہ بنانا چاہتی تھی۔

اب پہلا مسئلہ یہ تھا کہ ان کو گرفتاری سے کس طرح بچایا جائے؟ مرزا ہاؤس کا ایک عقبی دروازہ بھی ہے۔ وہاں پر پولیس کی توجہ کم تھی لیکن کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ اچانک بنگلے کے داخلی دروازے پر ہنگامہ اور پولیس کی جانب سے مار دھاڑ شروع کردی گئی۔ پتا چلا کہ قومی محاذ آزادی کے راہنما معراج محمد خان نے جیسے ہی گھر سے نکلنے کی کوشش کی تو پولیس نے لاٹھی چارج شروع کر دیا۔ نتیجے میں معراج محمد خان کا سر پھٹ گیا۔

بشارت مرزا کے بقول اس دوران موقع دیکھ کر ہم نے فاروق ستار، کنور خالد یونس اور ان کی اہلیہ کو عقبی دروازے سے باہر نکالا۔ وہاں سے وہ گھر کے قریب ریلوے ٹریک پر قائم کچی آبادی پہنچے جہاں سے وہ ایک اور گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوگئے۔ ۱۹۹۰ء میں محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت کے خاتمے کے بعد احتجاجی حکمت عملی طے کرنے کے لیے پہلی آل پارٹیز کانفرنس کا انعقاد بھی مرزا ہاؤس میں ہوا۔

محترمہ بے نظیر بھٹو مرزا ہاؤس کا باقاعدگی سے دورہ کرتی تھیں۔ اپنے دورِ حکومت میں وہ ایک بار آصف علی زرداری، بلاول اور بختاور کے ہمراہ دعوتِ حلیم میں شرکت کے لیے مرزا ہاؤس تشریف لائیں۔ بشارت مرزا نے ان کے اس دورے کے حوالے سے بتایا کہ وہ دوپہر کے فوراً بعد تشریف لے آئیں۔ ہمیں ان کی بحیثیت وزیرِ اعظم مصروفیات کا اندازہ تھا، اس لیے بغیر کوئی تاخیر کیے، ان کے اہلِ خانہ اور عملے کو حلیم کھلائی گئی۔

محترمہ چونکہ میری والدہ سے بہت انسیت رکھتی تھیں، اس لیے وہ ان سے ملاقات کرنے گھر کے اندرونی حصے میں چلی گئیں۔ محترمہ کی آمد کے تقریباً ایک گھنٹے بعد آصف زرداری واپس لوٹ گئے۔ حلیم کی دیگیں تیار پڑی تھیں، لیکن مہمان آکر نہیں دے رہے تھے۔ ایک ملازم کو کہا کہ وہ باہر جا کر دیکھے کہ مہمان آرہے یا نہیں؟ معلوم ہوا کہ پولیس نے پورے علاقے کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ شارع فیصل پر

ہمارے گھر آنے والے مہمانوں کو روک دیا جاتا یا وہیں سے لوٹا دیا جاتا۔

ہماری یہ کیفیت ہوگئی کہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ ہمیں محترمہ کی سیکورٹی کا بھی احساس تھا لیکن جن مہمانوں کو دعوت دی گئی تھی، اُنھیں پیش آنے والی زحمت کا بھی ادراک تھا لیکن کیا کرتے، محترمہ اس روز تقریباً چار گھنٹے تک مرزا ہاؤس میں رہیں اور اتنی دیر ہماری جان پہ بنی رہی۔ جب محترمہ روانہ ہوئیں تو ہم نے سکھ کا سانس لیا اور مہمان دعوت میں آنے لگے۔ حلیم کی وہ دو سو دیگیں جو شام تک ختم ہو جاتی تھیں، وہ رات گئے تک کھلائی جاتی رہیں۔

مرزا ہاؤس کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ سیاسی جماعتیں اور ان کے راہنما جو ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر بات کرنے پر تیار نہیں ہوتے تھے، مرزا ہاؤس میں ایک ہی میز پر بیٹھ کر تبادلۂ خیال کر لیتے۔ ۹۰ء کی دہائی میں جب اس وقت کی مہاجر قومی موومنٹ اور جماعتِ اسلامی کے درمیان کشیدگی عروج پہ تھی، تب یہ مرزا ہاؤس ہی تھا جہاں ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین اور پروفیسر غفور کے درمیان کشیدگی میں کمی کے لیے مکالمہ ہوا تھا۔

مرزا ہاؤس کا دورہ کرنے والے معروف سیاسی راہنماؤں میں غوث بخش بزنجو، عطاء اللہ مینگل اور نواب اکبر بگٹی کے علاوہ بے شمار سیاستدان شامل رہے۔ مرزا ہاؤس میں حلیم پارٹیوں میں شرکت کے لیے آنے والوں میں پی پی پی بعد ازاں این پی پی کے راہنما اور نگراں وزیرِ اعظم غلام مصطفیٰ جتوئی بھی شامل رہے ہیں۔ مرزا ہاؤس میں جب ان کی بڑی صاحبزادی کی شادی ہوئی تو نکاح پڑھانے والے مولانا مفتی محمود تھے جبکہ بشارت مرزا کا نکاح مولانا شاہ احمد نورانی نے پڑھایا تھا۔

بشارت مرزا کا کہنا ہے کہ جب بڑی بہن کی شادی ہوئی تو اس موقع پر قوالی کی محفل کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس موقعے پر پیر پگارا نے والد صاحب کو مشورہ دیا تا کہ محفل موسیقی کے لیے انھیں چاہیے کہ اس وقت کی ایک معروف خوش شکل غزل گائیکہ کو مدعو کریں۔ پیر صاحب کا کہنا تھا کہ محفل میں شرکت کے لیے مفتی محمود کو میں لے آؤں گا۔ نوابزادہ نصر اللہ خان کو تم لے آؤ لیکن مرزا ہاؤس میں محفلِ غزل برپا کرنے کی روایت نہیں تھی اس لیے یہ بات ایک خوشگوار یاد کی صورت میں باقی ہے۔

مرزا ہاؤس چونکہ کراچی میں حزبِ اختلاف کا سب سے بڑا سیاسی ڈیرہ تھا، اس لیے اس گھر کو اتنی بار 'سب جیل' قرار دیا گیا کہ بشارت مرزا کو گنتی یاد نہیں۔ بشارت مرزا کہتے ہیں کہ جب گھر کو سب جیل قرار دیا جاتا تو مشتاق مرزا کی نقل و حرکت محدود ہو کر رہ جاتی اور رشتے داروں کے آنے پر بھی پابندی ہوتی تھی۔ شروع شروع میں تو ایسی صورتِ حال میں شدید بے بسی، لاچاری، بے کسی اور غصّے کی کیفیت ہوتی تھی لیکن آہستہ آہستہ اس کے عادی ہوتے چلے گئے۔ گھر کے باہر ڈیوٹی پر متعین پولیس اہلکار بھی اپنے سے ہی لگنے لگتے اور ان کی چائے اور کھانے کا انتظام بھی ہمیں ہی کرنا پڑتا تھا۔

اس گھر کی سیاسی یادوں کا ایک باب اس وقت ختم ہوا جب ۵ جولائی ۲۰۰۳ء کو مشتاق مرزا صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اسی سال ستمبر میں نوابزادہ نصر اللہ خان بھی اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اب مرزا صاحب کا خاندان اپنے اس سیاسی و تاریخی گھر سے کوچ کر کے ڈیفنس منتقل ہو چکا۔ بشارت مرزا اب بھی سیاسی طور پر اتنے ہی فعال ہیں جتنا کہ ان کے والد تھے۔ اب بھی وہ سیاسی حلیم کی دعوت کا انعقاد کرتے ہیں لیکن ان دعوتوں میں اب وقفے آنے لگے ہیں۔

شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

وے صورتیں یا الٰہی کس ملک بستیاں ہیں
جن کے دیکھنے کو اب آنکھیں ترستیاں ہیں

سارنگہ

عمارہ جے ملک

ایک مافوق الفطرت ہستی کی پُرہول کہانی،
اس نے نامحسوس طریقے سے گھر بھر پر قبضہ جما لیا

وہ میرے اماں ابا کو ایک ویران جگہ سے ملی تھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں چھ سال کی تھی۔ ہم شام، سوات میں رہتے تھے۔ ایک دفعہ جب امی بہت بیمار تھیں تو ابو رات کے وقت انھیں لے کر اسپتال چلے گئے۔ اسپتال بہت دور تھا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ میں اور میرا چھوٹا بھائی دادا کے ساتھ امی اور ابا کا انتظار کرنے لگے۔ وہ رات کے تقریباً ایک بجے واپس آئے۔ ان کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ امی کی طبیعت اب ٹھیک تھی۔

ابو نے اس لڑکی کا بتایا کہ یہ ہمیں سڑک پر ملی ہے۔ شاید راستہ کھو گئی ہے۔ بول بھی نہیں رہی۔ ابھی خوفزدہ ہے۔ ہم اپنے ساتھ لے آئے۔ اتنی چھوٹی بچی کہاں چھوڑتے؟ ایک دو دن میں جب خوف ختم ہوگا تو اس کے گھر کا پتا پوچھ کر اسے

وہاں چھوڑ آئیں گے۔

ان سب باتوں کے دوران وہ امی کے پیچھے کھڑی تھی۔ ابا نے اس کا بازو پکڑ کر آگے کیا تو میں نے دیکھا اس کی سبز آنکھیں اتنی زیادہ سبز تھیں کہ مصنوعی لگتی تھیں۔ یوں جیسے کانچ کی ہوں۔ تب اس نے میری طرف دیکھا اور میرے جسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ اس کی آنکھیں سرد تھیں۔ بہت سرد عجیب سی آنکھیں۔ میں نے ایسی آنکھیں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ میں تھوڑا سمٹ گئی۔ اس نے پھر میری طرف دیکھا۔ میں دادا کے بازو سے لپٹ گئی۔ دادا نے اس سے نام پوچھا۔ وہ گلگتی باندھے دادا کی طرف دیکھنے لگی۔ ابو نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے پوچھا: ''بیٹا آپ کا نام کیا ہے؟''

''سارنگہ''۔ وہ بولی۔ اس کی آواز بھی عجیب تھی۔ کسی بھی شور سے پاک۔ یوں لگتا جیسے کوئی ریکارڈ سن رہے ہوں۔ اب اتنے برس بعد جب بھی اس کی آواز یاد آئے تو جھرجھری سی آ جاتی ہے۔

وہ ہمارے گھر رہنے لگی۔ امی اور ابا نے ہزار دفعہ اس سے گھر کا پتا پوچھا لیکن اس نے کچھ نہ بتایا۔ میرے چھوٹے بھائی فرقان کو وہ اتنی پسند تھی کہ ہر وقت اس کے ساتھ لگا رہتا۔ اس وقت فرقان دو سال کا تھا۔ چند مہینے گزرے تو فرقان اسے ''سانہ'' کہنے لگا۔ پھر یہ نام سب کی زبان پر چڑھ گیا۔ مجھے اس سے خوف آتا تھا۔ جب میں نے امی سے اپنے خوف کا اظہار کیا تو امی نے ڈانٹ کر کہا: ''وہ تمہاری چھوٹی بہن ہے اس کا خیال رکھا کرو''۔

ایک دن جب مجھے زیادہ ڈر لگا تو میں نے دادا سے ذکر کیا۔ دادا میری بات سن کر کسی گہری سوچ میں گم ہو گئے۔ امی کی طرح انھوں نے کچھ کہا نہ ڈانٹا۔

لوگ کہتے تھے کہ سارنگہ جیسی خوبصورت آنکھیں دنیا میں کسی کی نہ ہوں گی، لیکن میں جانتی تھی کہ وہ خوبصورت نہیں بلکہ بے جان آنکھیں تھیں۔ ان میں کوئی روشنی کوئی چمک نہیں تھی۔ وہ باتیں بہت کم کرتی تھی۔ ضرورت کے وقت بولتی ورنہ خاموش رہتی۔

امی اور ابا اُسے مجھ سے زیادہ چاہتے تھے۔ اسے آئے ہوئے ایک سال گزر چکا تھا۔ مجھے شروع سے ہی اس میں کچھ غیر معمولی پن محسوس ہوتا تھا۔ وہ میرے اور دادا کے ساتھ سوتی تھی۔ میری طرح دادا بھی اسے پسند نہیں کرتے تھے۔

میں نے خود سنا تھا، دادا نے کئی بار ابا سے کہا: ''شفقت یہ لڑکی وہ نہیں جو نظر آتی ہے۔'' ابا ہنس کر یہ بات ٹال گئے ''آپ پتا نہیں اتنی چھوٹی بچی کو کیا سمجھتے ہیں؟''

ایک رات مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ دادا سو چکے تھے تو میں لیٹے لیٹے اس کی طرف مڑی تا کہ دیکھ سکوں۔ وہ سوئی ہے کہ نہیں اور..... اور میں دیکھ کے دنگ رہ گئی اس کی آنکھوں سے روشنی نکل رہی تھی۔ وہ چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میرا دماغ سن ہو گیا۔ کافی دیر بعد مجھے ہوش آیا تو اتنا ڈر لگ رہا تھا کہ میں نے جلدی سے آنکھیں موند لیں۔ اس کے بعد میں ہر دس منٹ کے وقفے سے اس کی طرف دیکھتی اور اس کی آنکھیں عجیب سبزی روشنی میں چھت پر لگی ہوئی تھیں۔ یوں ڈرتے ڈرتے صبح ہو گئی اور صبح مجھے بخار چڑھ چکا تھا۔ دوپہر کے وقت میں نے موقع دیکھ کر دادا کو سب بتایا۔ دادا نے تسلی دیتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑا اور کچھ کہنے ہی لگے تھے کہ ابا کمرے میں آ گئے۔ یوں دادا کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔

اس رات مجھے کپکپی چڑھی ہوئی تھی۔ بار بار نیند سے آنکھیں بند ہو جاتی تھیں۔ پھر میں گہری نیند میں چلی گئی۔ رات کے کسی پہر میری آنکھیں کھلیں تو دیکھا سارنگہ اپنی چارپائی پر نہیں تھی۔ میں نے دادا کو آواز دی۔ دادا نے اٹھ کر اسے پورے گھر میں ڈھونڈا، لیکن اسے نہ ملنا تھا نہ ملی۔ دادا واپس کمرے میں آ گئے۔ وہ ابا کو جگانا چاہتے تھے کہ باہر

کھٹ پٹ ہوئی اور سارنگہ اندر آ گئی۔

''کہاں تھی تو؟''

دادا نے سخت لہجے میں پوچھا۔ وہ ہمیں جاگتا دیکھ کے چونک گئی تھی۔

''میں غسل خانے تک گئی تھی۔'' اس نے اسی سرد لہجے میں کہا۔

''لیکن میں نے تو غسل خانے میں دیکھ لیا تھا۔'' دادا کے ماتھے پر بل پڑے۔ ''اچھا اب سو جاؤ اور آئندہ اس طرح باہر مت نکلنا۔'' دادا نے سختی سے تنبیہہ کی۔

میں نے بے ساختہ اس کی طرف دیکھا۔ سارنگہ کی آنکھیں آگ دے رہی تھیں۔ ان میں واضح طور پر انتقام کی جھلک تھی۔

صبح عجیب سے شور سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اٹھ کر دیکھا تو سب رو رہے تھے۔ مجھے ڈر سا محسوس ہوا اردگرد نظریں دوڑائیں سارنگہ کہیں نہیں تھی۔ میرا دل بے ساختہ دھڑکا۔ میں آہستہ آہستہ چلتی صحن کے بیچوں بیچ رکھی چارپائی تک آئی۔ کسی کو سفید چادر سے ڈھک دیا گیا تھا۔ میں نے دھیرے سے چادر چہرے سے کھسکائی اور میری چیخ نکل گئی۔

میرے دادا دنیا سے جا چکے تھے۔ میرے منہ سے بے ساختہ آوازیں نکلنے لگیں۔ میں اونچی آواز میں رونے لگی۔ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ مجھے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میں گرنے لگی اور بے ہوش ہونے سے پہلے میں نے دیکھا کہ سارنگہ دادا کے سرہانے بالکل سپاٹ چہرہ لیے بیٹھی تھی۔

دادا کی وفات کے بعد میں سارنگہ سے اور بھی زیادہ ڈرنے لگی، لیکن گھر میں اس رات کا ذکر نہ کیا۔ جب بھی بتانے کا فیصلہ کرتی، نجانے مجھے کیا ہو جاتا۔ روز سوچتی تھی آج امی کو بتاؤں گی لیکن پھر جب امی اکیلی ہوتیں تو میں سب بھول جایا کرتی۔

اس طرح ایک سال مزید گزر گیا۔ اب میں، سارنگہ اور فرقان ایک ہی کمرے میں سوتے تھے۔ فرقان اب دادا کی چارپائی پر سو جاتا تھا۔ وہ رات کو بے سدھ سوتا اور صبح جاگتا لیکن میری اکثر پوری رات آنکھوں میں کٹتی تھی۔ ان دنوں بارشوں کا موسم تھا۔ تب ابو سے گاؤں کے کسی آدمی نے کہا کہ انھوں نے سارنگہ کو مغرب کی نماز کے بعد بڑی نہر کے پاس دیکھا ہے۔ ابو کو یقین نہ آیا۔ انھیں سارنگہ پہ بہت بھروسا تھا۔ لیکن اکثر لوگ جب یہی کہنے لگے تو امی نے سختی سے اس سے باز پرس کی۔ اس وقت تو وہ چپ رہی اور خاموشی سے سنتی رہی۔

اگلے دن امی کو رات کے وقت فالج کا حملہ ہو گیا۔ ان کے بدن کا ایک حصہ بالکل سُن ہو چکا تھا۔ اب وہ بول بھی نہیں سکتی تھیں۔ اس دوران میں امی کے ساتھ ایک ہفتہ اسپتال رہی۔ ہمارے ساتھ دن کے وقت ابا ہوتے اور رات کو ماموں آ جاتے۔ ابا گھر چلے جاتے۔

ایک ہفتے بعد امی گھر آ گئیں۔ میں نے امی کو چارپائی پر لٹایا۔ اس وقت سارنگہ کمرے میں نہیں تھی۔ بعد میں، میں جب امی کو دلیہ کھلا رہی تھی تب وہ کمرے میں آئی۔ امی اس کی طرف دیکھ کر منہ سے عجیب سی آوازیں نکالنے لگیں۔ وہ کچھ کہہ رہی تھیں، لیکن ہماری سمجھ میں امی کی کوئی بات نہیں آئی۔ اچانک اُن پر کپکپی چڑھ گئی۔ ابو نے الجھن بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور میں شل رہ گئی۔ میں سمجھ گئی تھی کہ امی کیا کہہ رہی ہیں.....

اس دن کے بعد میں نے کبھی سارنگہ کو امی کے قریب آنے نہ دیا۔ امی کے سارے کام میں خود کیا کرتی۔ فرقان کو اس سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی لیکن وہ مجھے اور امی سے زیادہ اسے چاہتا تھا۔ وہ اسے 'سانہ' کہتا اور سارا دن اس

کے دوپٹے کا پلو پکڑے رکھتا۔ میں کھانا کھلاتی تو رونے لگتا اور نہ کھاتا۔ جب سارنگہ کھلاتی تو ہنسی خوشی کھالیتا۔ سارنگہ نے اسے امی سے زیادہ پال پوس کے بڑا کیا تھا۔ اب وہ ایک منٹ بھی اس سے الگ نہ رہتا۔

ابو جب بھی امی کے ساتھ بیٹھتے، وہ اشاروں میں سارنگہ کی طرف اشارہ کرتیں اور پھر دروازے کی طرف۔ شاید وہ ابو سے سارنگہ کو گھر سے نکالنے کی بات کرتی تھیں یا کچھ اور.....

ان دنوں امی بہت چڑچڑی ہوگئی تھیں۔ بات بات پر روتیں اور برتن اٹھا کے مارتیں۔ اس دن امی نے اشاروں میں فرقان کا پوچھا تو میں نے اُسے آواز دی۔ وہ سارنگہ کا ہاتھ پکڑے آگیا۔

امی نے تو پہلے کافی دیر دونوں کو دیکھا اور پھر گلاس اٹھا کر اس کے منہ پہ دے مارا۔ اس کی آنکھ کے اوپر ماتھے پہ زخم لگ گیا۔ وہ دوپٹے سے آنکھ دباتے باہر نکلی اور فرقان زور زور سے رونے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ امی کو برا بھی کہہ رہا تھا۔ میں امی کو چادر اوڑھا کے فرقان کو چپ کروانے باہر لے آئی۔ کافی دیر بعد جب فرقان کو سلا کے میں نے دیکھا تو سارنگہ غائب تھی۔

کمرے میں جا کر دیکھا تو اس کے ماتھے پر پٹی بندھی ہوئی اور آنکھیں بند تھیں۔ شاید وہ سو رہی تھی۔ میرے پیچھے پیچھے فرقان بھی نیند میں چلتا ہوا آگیا۔

''سانہ'' کی آواز پر اس نے آنکھ کھول کے دیکھا۔ فرقان اس کے سرہانے کھڑا تھا۔ وہ فرقان کی طرف دیکھ کے مسکرائی اور میں باہر نکل گئی۔ کبھی کبھی مجھے لگتا کہ وہ فرقان کو ایک ماں سے بھی زیادہ چاہتی ہے۔

اس واقعے کے دو روز بعد امی بھی دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

اب ابو سارنگہ سے محتاط ہو گئے تھے۔ وہ گھر کا کوئی کام اس کے سپرد نہ کرتے۔ اپنے ہر کام کے لیے مجھے آواز دیتے۔

ایک دن ہمسایوں کی بلی رات کے وقت ہمارے صحن میں آ گئی۔ وہ باہر صحن میں گھوم رہی تھی۔ اندھیرے میں اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ابو نے جب مجھ سے سارنگہ کے بارے میں پوچھا تو فرقان نے بلی کی چمکتی آنکھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''وہ سانہ.....'' اور میں منجمد ہو گئی۔ کیا فرقان کو بھی پتا چل گیا تھا؟؟ یہی کہ وہ انسان نہیں کوئی اور ہی پُراسرار مخلوق ہے۔

ایک دن آخر ابو نے تنہائی میں مجھے کہا کہ سارنگہ بڑی عجیب لڑکی ہے۔ تبھی میں نے ان کو ساری داستان سنائی۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم ہو گئے۔ اگلے دن ابو کسی عالم کو لے کے آئے۔ اس عالم نے ایک پوری رات گھر کے صحن میں چلہ کاٹا اور صبح کے وقت انھوں نے ابو سے جاتے ہوئے کہا۔

''شفقت صاحب آپ اور آپ کے گھر والوں کو وہم ہو رہا ہے۔ آپ کے گھر میں کچھ بھی غیر معمولی نہیں۔ میں نے پوری رات گھر کا کونا کونا دیکھ لیا۔ وہ لڑکی تو سو رہی تھی۔ آپ دل سے وہم نکال دیں اور روزانہ چار قل پڑھ کے گھر کے کونے کونے میں چھڑکاؤ کیا کریں۔''

ابو مطمئن ہو گئے، لیکن میں جانتی تھی کہ وہ عالمِ دین کو دھوکا دینے میں کامیاب رہی تھی۔

جب عالم صحن میں چلہ کاٹ رہے تھے تب میں نے بار بار کسی خوف سے رات کو اُٹھ اُٹھ کر سارنگہ کی طرف دیکھا تھا۔ اس وقت جیسے سارنگہ کے اندر جان ہی نہیں تھی۔ وہ بے سدھ آنکھیں بند کر کے کسی بے جان لاشے کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ میں نے کافی غور سے دیکھا تھا۔ اس وقت اس کی سانس بھی نہیں چل رہی تھی، وہاں خاموشی تھی..... مکمل خاموشی۔

عالمِ دین کے جانے کے بعد میں صحن میں صفائی کر رہی تھی۔ تب سارنگہ میرے پاس آئی۔ میں نے مڑ کے دیکھا تو

وہ میرے پیچھے کھڑی تھی۔ ''تم کچھ بھی کرو۔ میں تب تک تمہارے ساتھ رہوں گی جب تک تم رہو گی۔ مجھے نکالنے کی کوششیں چھوڑ دو۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے لبوں پر پُراسرار مسکراہٹ چھا گئی۔ میں یک ٹک اسے دیکھنے لگی۔ کافی دیر بعد مجھے ہوش آیا تو وہ جا چکی تھی۔ پھر پورا دن مجھے عجیب سی بے چینی ہوتی رہی۔ فرقان سانہ..... سانہ کہتے ہوئے اس کے پیچھے چلتا تھا۔ میں فرقان کے پیچھے لگی۔

اس رات مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ گرمیوں کے دن تھے۔ رات کو کروٹیں بدلتے بدلتے مجھے نیند نہیں آئی تو میں اٹھ کے بیٹھ گئی۔ باہر کھٹ پٹ سی ہوئی۔ شاید صحن میں بندھی ہماری بکری اچھل رہی تھی۔ میں نے سارنگہ کی طرف دیکھا۔ وہ سو رہی تھی۔ ابو بھی ہمارے ساتھ سونے لگے تھے۔ میں نے ان کو جگایا تو وہ لالٹین روشن کر کے صحن میں آئے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے تھی۔ صحن میں ہم نے ادھر ادھر ہر جگہ دیکھا مگر کچھ بھی نہ تھا۔

بکری اب زوردار آوازیں نکالنے لگی تھی۔ تب ہم نے قریب جا کے دیکھا تو بکری سے ذرا فاصلے پر ایک بڑا سا سانپ لہرا رہا تھا۔ ابو نے فوراً گھر کے کونے پر رکھا بیلچہ اٹھا لیا۔ سانپ اب پھنکار رہا تھا۔ ابو نے جب بیلچے سے وار کیا تو وہ اس کے سر کے تھوڑا نیچے زمین سے ٹکرا کے رہ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سانپ مڑ کے دیوار پہ چڑھ گیا۔ دیوار بہت پرانی تھی اور بالکل ڈھے نے والی ہو گئی تھی۔

ابو نے جب بیلچے سے دیوار پر لگاتار وار کیے تو اس کے درمیان سے ایک پتھر نکل گیا اور پوری دیوار گرنے لگی۔ سانپ نیچے تھا اور اوپر دیوار کا ملبہ تھا۔ صرف اس کا سر بچ گیا تھا..... مجھے کراہیت سی محسوس ہونے لگی۔ مجھ سے یہ کریہہ منظر زیادہ دیر دیکھا نہ گیا اور میں واپس کمرے میں آ گئی۔

اندر آ کر دیکھا سارنگہ اسی طرح سو رہی تھی۔ ابو بھی بکری کو صحن کے دوسرے کونے میں باندھ کر آ گئے اور اپنی جگہ لیٹ گئے۔

صبح جب میں اٹھ کر ناشتا بنا رہی تھی تو کمرے سے شور کی آوازیں آنے لگیں۔ میں بھاگ کر کمرے میں گئی تو فرقان رو رہا تھا اور ابو سارنگہ کے سرہانے کھڑے تھے۔ میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہاں سکوت تھا، مکمل سکوت.....

ذرا سی دیر میں ارد گرد کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ فرقان چیخ رہا تھا۔ اسے روتے دیکھ کر میرے بھی آنسو نکل آئے۔ اب سارنگہ کی موت کے بعد ایک ایک پل میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔

سارنگہ کو آخری غسل دینے کے لیے مدرسے کی باجی نے مجھ سے کہا: ''تم یہ کام انجام دو''۔ میں چونکہ اس کی ایک ہی اکلوتی بہن تھی تو یہ ذمہ داری خود بہ خود مجھ پر آ گئی تھی۔

میں نے غسل دیتے وقت دیکھا کہ اس کا جسم لہولہو تھا۔ ہڈیاں تک ٹوٹی ہوئیں اور گردن سے نیچے ہنس کی ہڈی کے پاس زخم تھا، بالکل وہی نیلے کا نشان۔ میں رات کو ہی جان گئی تھی کہ سارنگہ جا چکی ہے۔

یہ اس کے پانچ سال بعد کا ذکر ہے۔

ڈاکٹر نے آ کر مجھے مبارک باد دی۔ ''مبارک ہو بیٹی ہوئی ہے۔'' میں طمانیت سے مسکرا دی۔

عبدالرحمان میرے شوہر نے نرس کی طرف دونوں ہاتھ بڑھائے تو اس نے بچی عبدالرحمان کو ان کے بازوؤں میں تھما دی۔ مجھے تو اتنا اشتیاق ہو رہا تھا کہ میں بے ساختہ بچی کے چہرے پر جھک گئی۔ تب ہی اچانک بچی نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا..... اُف!! وہی سبز کانچ کی آنکھیں..... سرد سی..... کسی احساس کے بغیر چمکتی ہوئی..... میری بیٹی کے چہرے پر موجود تھیں۔ ◆◆◆

روبینہ کوکب

ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے
ڈاکہ تو نہیں ڈالا، چوری تو نہیں کی ہے

ناتجربہ کاری سے واعظ کی یہ باتیں ہیں
اس رنگ کو کیا جانے، پوچھو تو کبھی پی ہے؟

اس مے سے نہیں مطلب دل جس سے ہے بیگانہ
مقصود ہے اس مے سے دل ہی میں جو کھنچتی ہے

ہر ذرّہ چمکتا ہے انوارِ الٰہی سے
ہر سانس یہ کہتی ہے ہم میں تو خدا بھی ہے

سورج میں لگے دھبہ فطرت کے کرشمے ہیں
بت ہم کو کہیں کافر اللہ کی مرضی ہے
(اکبر الہ آبادی)

وہ عشق جو ہم سے رُوٹھ گیا، اب اس کا حال بتائیں کیا
کوئی مہر نہیں کوئی قہر نہیں، پھر سچا شعر سنائیں کیا

اک ہجر جو ہم کو لاحق تھا تادیر اُسے دہرائیں کیا
وہ زہر جو دل میں اتار لیا، پھر اس کے ناز اُٹھائیں کیا

پھر آنکھیں لہو سے خالی ہیں، یہ شمعیں بجھنے والی ہیں
ہم خود بھی کسی کے سوالی ہیں، اس بات پہ ہم شرمائیں کیا

اک آگ غمِ تنہائی کی جو سارے بدن میں پھیل گئی
جب جسم ہی سارا جلتا ہو پھر دامنِ دل کو بچائیں کیا

ہم نغمہ سرا کچھ غزلوں کے ہم صورت گر کچھ خوابوں کے
بے جذبۂ شوق سنائیں کیا، کوئی خواب نہ ہو تو بتائیں کیا
(اطہر نفیس)

دیارِ نور میں تیرہ شبوں کا ساتھی ہو
کوئی تو ہو جو مری وحشتوں کا ساتھی ہو

میں اُس سے جھوٹ بھی بولوں تو مجھ سے سچ بولے
مرے مزاج کے سب موسموں کا ساتھی ہو

میں اس کے ساتھ نہ آؤں وہ میرا ہو کے رہے
میں گر پڑوں تو مری پستیوں کا ساتھی ہو

وہ میرے نام کی نسبت سے معتبر ٹھہرے
گلی گلی مری رُسوائیوں کا ساتھی ہو

کرے کلام جو مجھ سے تو میرے لہجے میں
میں چپ رہوں تو میرے تیوروں کا ساتھی ہو

میں اپنے آپ کو دیکھوں وہ مجھ کو دیکھے جائے
وہ میرے نفس کی گمراہیوں کا ساتھی ہو

وہ خواب دیکھے تو دیکھے مرے حوالے سے
مرے خیال کے سب منظروں کا ساتھی ہو
(افتخار عارف)

کہاں آ کے رُکنے تھے راستے، کہاں موڑ تھا، اُسے بھول جا
وہ جو مل گیا اُسے یاد رکھ، جو نہیں ملا اُسے بھول جا

وہ ترے نصیب کی بارشیں کسی اور چھت پہ برس گئیں
دلِ بے خبر مری بات سن، اُسے بھول جا اُسے بھول جا

میں تو گم تھا تیرے ہی دھیان میں، تری آس تیرے گمان میں
صبا کہہ گئی مرے کان میں، میرے ساتھ آ، اُسے بھول جا

کسی آنکھ میں نہیں اشکِ غم، ترے بعد کچھ بھی نہیں ہے کم
تجھے زندگی نے بھلا دیا، تُو بھی مسکرا، اُسے بھول جا

کیوں اَٹا ہوا ہے غبار میں، غمِ زندگی کے فشار میں
وہ جو درج تھا ترے بخت میں، سو وہ ہو گیا، اُسے بھول جا

نہ وہ آنکھ ہی تری آنکھ تھی، نہ وہ خواب ہی ترا خواب تھا
دلِ منتظر تو یہ کس لیے، ترا جاگنا، اُسے بھول جا

یہ جو رات دن کا ہے کھیل سا، اسے دیکھ، اس پہ یقیں نہ کر
نہیں عکس کوئی بھی مستقل سرِ آئینہ، اُسے بھول جا

جو بساطِ جاں ہی اُلٹ گیا، وہ جو راستے سے پلٹ گیا
اُسے روکنے سے حصول کیا، اُسے مت بلا، اُسے بھول جا

تجھے چاند بن کے ملا تھا جو، ترے ساحلوں پہ کھلا تھا جو
وہ تھا ایک دریا وصال کا، سو اُتر گیا، اُسے بھول جا
(امجد اسلام امجد)

❁

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تیری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار
بے قراری تجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی

چشمِ قاتل مری دشمن تھی ہمیشہ لیکن
جیسے اب ہوگئی قاتل کبھی ایسی تو نہ تھی

ان کی آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو
کہ طبیعت میری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی

کیا سبب تو جو بگڑتا ہے ظفرؔ سے ہر بار
خُو تری حورِ شمائل کبھی ایسی تو نہ تھی
(بہادر شاہ ظفر)

❁

خدا ہم کو ایسی خدائی نہ دے
کہ اپنے سوا کچھ دکھائی نہ دے

خطاوار سمجھے گی دنیا تجھے
اب اتنی زیادہ صفائی نہ دے

ہنسو آج اتنا کہ اس شور میں
صدا سسکیوں کی سنائی نہ دے

غلامی کو برکت سمجھنے لگیں
اسیروں کو ایسی رہائی نہ دے

ابھی تو بدن میں لہو ہے بہت
قلم چھین لے روشنائی نہ دے

مجھے ایسی جنت نہیں چاہیے
جہاں سے مدینہ دکھائی نہ دے

خدا ایسے احساس کا نام ہے
رہے سامنے اور دکھائی نہ دے
(بشیر بدر)

❁

جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

ہائے وہ کیونکر جی بہلائے
غم بھی جس کو راس نہ آئے

دل پہ کچھ ایسا وقت پڑا ہے
بھاگے لیکن راہ نہ پائے

جھوٹی ہے ہر ایک مسرت
روح اگر تسکین نہ پائے

حسن وہی ہے حسن جو ظالم
ہاتھ لگے تو ہاتھ نہ آئے

ضبطِ محبت، شرطِ محبت
جی ہے کہ ظالم اُمڈا آئے

نغمہ وہی ہے نغمہ کہ جس کو
روح سنے اور روح سنائے

راہِ طلب آسان ہوئی ہے
زُلف و مژہ کے سائے سائے
(جگر مرادآبادی)

❁

یارب! غمِ ہجراں میں اتنا تو کیا ہوتا
جو ہاتھ جگر پر ہے وہ دستِ دعا ہوتا

اک عشق کا غم آفت اور اس پہ یہ دل آفت
یا غم نہ دیا ہوتا یا دل نہ دیا ہوتا!

ناکامِ تمنا دل اس سوچ میں رہتا ہے
یوں ہوتا تو کیا ہوتا، یوں ہوتا تو کیا ہوتا

اُمید تو بندھ جاتی تسکین تو ہو جاتی
وعدہ نہ وفا کرتے وعدہ تو کیا ہوتا

غیروں سے کہا تم نے، غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا، کچھ ہم سے سنا ہوتا
(چراغ حسن حسرت)

❁

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبلِ بے تاب گفتگو کرتے

پیام بر نہ میسر ہُوا تو خوب ہُوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

جو دیکھتے تری زنجیرِ زُلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے
(حیدر علی آتش)

❁

تیرے پیار میں رُسوا ہو کر جائیں کہاں دیوانے لوگ
جانے کیا کیا پوچھ رہے ہیں یہ جانے پہچانے لوگ

ہر لمحہ احساس کی صہبا رُوح میں ڈھلتی جاتی ہے
زیست کا نشہ کچھ کم ہو تو ہو آئیں مے خانے لوگ

جیسے تمہیں ہم نے چاہا ہے کون بھلا یوں چاہے گا
مانا اور بہت آئیں گے تم سے پیار جتانے لوگ

یوں گلیوں بازاروں میں آوارہ پھرتے رہتے ہیں
جیسے اس دنیا میں سبھی آئے ہوں عمر گنوانے لوگ

آگے پیچھے دائیں بائیں سائے سے لہراتے ہیں
دنیا بھی تو دشتِ بلا ہے ہم ہی نہیں دیوانے لوگ

کیسے دکھوں کے موسم آئے کیسی آگ لگی یارو
اب صحراؤں سے لاتے ہیں پھولوں کے نذرانے لوگ

کل ماتم بے قیمت ہوگا آج ان کی توقیر کرو
دیکھو خونِ جگر سے کیا کیا لکھتے ہیں افسانے لوگ
(عبید اللہ علیم)

ننانوے کا چکر

عامر عباس ناصر اعوان

بادشاہ وقت نے اپنے وزیر خاص سے پوچھا: ''یہ میرے نوکر مجھ سے زیادہ کیسے خوش باش پھرتے ہیں جبکہ ان کے پاس کچھ نہیں اور میرے پاس کسی چیز کی کمی نہیں''۔

وزیر نے کہا: ''بادشاہ سلامت! اپنے کسی خادم پر قانون نمبر ننانوے کا استعمال کر کے دیکھیے''۔ بادشاہ نے استفسار کیا: ''اچھا، یہ قانون نمبر ننانوے کیا ہوتا ہے؟''

وزیر نے کہا: ''بادشاہ سلامت! ایک صراحی میں ننانوے درہم ڈال کر، صراحی پر لکھیے، ''اس میں تمہارے لیے سو درہم ہدیہ ہیں''۔ رات کو کسی خادم کے گھر کے دروازے کے سامنے رکھ کر دروازہ کھٹکھٹا کر ادھر اُدھر چھپ جائیے اور تماشا دیکھ لیجیے''۔

بادشاہ نے، جیسے وزیر نے سمجھایا تھا، ویسے کیا، صراحی رکھنے والے نے دروازہ کھٹکھٹایا اور چھپ کر تماشا دیکھنا شروع کر دیا۔

اندر سے خادم نکلا، اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ کسی کو موجود نہ پا کر صراحی اٹھائی اور واپس گھر چلا گیا۔ درہم گنے تو ننانوے نکلے، جبکہ صراحی پر لکھا سو درہم تھا۔ اس نے سوچا: ''یقیناً ایک درہم کہیں باہر گرا پڑا ہو گا لہٰذا باہر چل کر تلاش کرنا چاہیے''۔ خادم اور اس کے سارے گھر والے باہر نکلے اور درہم کی تلاش شروع کر دی۔ انھوں نے ارد گرد کی ساری جگہ چھان ماری لیکن درہم کو نہیں ملنا تھا سو وہ نہ ملا۔ ان کی ساری رات اسی تلاش میں گزر گئی۔ خادم کا غصہ دیدنی تھا، کچھ رات صبر اور باقی کی رات بک بک اور جھک جھک میں گزری، خادم نے اپنے بیوی بچوں کو سست بھی کہا کیونکہ وہ درہم تلاش کرنے میں ناکام رہے تھے۔

دوسرے دن یہ ملازم محل میں کام کرنے کے لیے گیا تو اس کا مزاج مکدر اور آنکھوں سے رت جگا نمایاں تھا۔ ہر کام سے جھنجھلاہٹ اور شکل پر افسردگی عیاں تھی۔ بادشاہ سمجھ گیا کہ ننانوے کا قانون کیا ہوا کرتا ہے۔

اللہ رب العزت نے ہر انسان کو بے شمار نعمتیں عطا کی ہوتی ہیں لیکن لوگ ان ننانوے نعمتوں کو بھول جاتے ہیں جو اللہ تبارک و تعالیٰ نے انھیں عطا فرمائی ہوتی ہیں اور ساری زندگی اس ایک نعمت کے حصول میں سرگرداں رہ کر گزار دیتے ہیں جو انھیں نہیں ملی ہوتی۔

اور یہ نا ملنے والی نعمت بھی اللہ کی کسی حکمت کی وجہ سے رکی ہوئی ہوتی ہے جسے عطا کر دینا اللہ کے لیے بڑا کام نہیں ہوا کرتا۔ وہ جب چاہے اور جیسے چاہے عطا کر دے۔

لوگ اپنی اسی ایک مفقود نعمت کے لیے سرگرداں رہ کر اپنے پاس موجود ان ننانوے نعمتوں کی لذتوں سے محروم مزاجوں کو مکدر کر کے جیتے ہیں۔

اپنی ننانوے مل چکی نعمتوں پر اللہ تبارک و تعالیٰ کا احسان مانیے اور ان سے مستفید ہو کر شکر گزار بندے بن کر رہیے۔ اللہ پاک ہمیں اپنے شکر گزار بندے بننے کی طاقت اور ہمت عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین ◆◆◆

مسجد اقصیٰ کا خوبصورت منظر

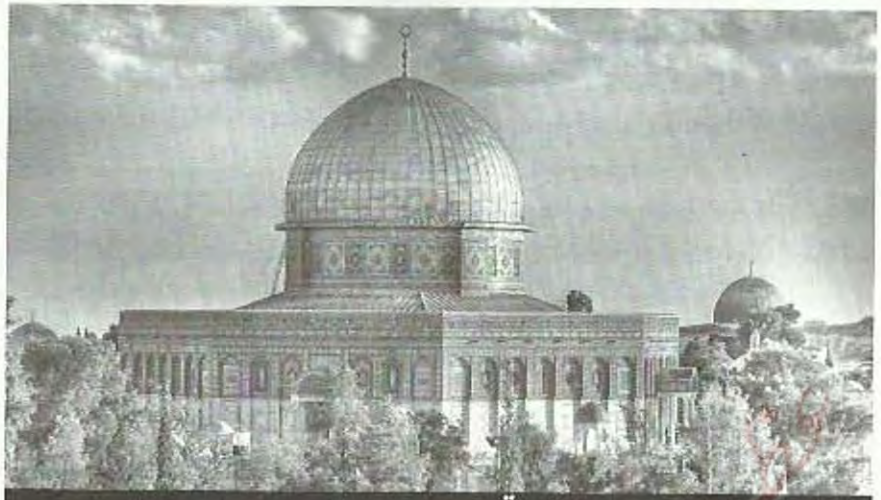

(جب مسجد اقصیٰ خطرے میں)

''سلطان صلاح الدین ایوبی نے یہود کو واپس یروشلم میں بلا لیا جنہیں صلیبی جنگوں کے دوران عیسائیوں نے باہر نکال دیا تھا۔ سلطان نے پھر ایک یہودی طبیب کو اپنا معالج مقرر کیا۔ یورپ کے مجبور و مقہور یہودی مسلم فلسطین میں آباد یہودیوں کی آزادی کو حسرت و حیرت سے دیکھا کرتے تھے۔''

دلچسپ بات یہ کہ اسلام دشمنی میں اب کروڑوں عیسائی بھی یہود کا ساتھ دے رہے ہیں حالانکہ ماضی میں ان کے مابین اینٹ کتے کا بیر تھا۔ اب بھی مذہبی لحاظ سے عیسائیت اور یہودیت کے درمیان نہایت شدید اختلافات ہیں مگر مشترکہ اسلام دشمنی کی وجہ سے وہ پس پشت جا چکے۔

یہود کی گہری سازش

یہود و نصاریٰ کی دوستی کا آغاز پندرہویں صدی کے بعد ہوا جب دنیائے عیسائیت دو بڑے فرقوں...... کیتھولک کلیسا اور پروٹسٹنٹ میں تقسیم ہو گئی۔ اس ملاپ کی داستان خاصی پُراسرار اور ڈرامائی ہے۔

ہوا یہ کہ سولہویں اور سترہویں صدی میں پروٹسٹنٹوں کے بھی کئی ذیلی فرقے بن گئے۔ یہ عین ممکن ہے کہ بعض یہودی جعلی عیسائیوں کے بھیس میں خصوصاً پیورٹن (Puritans) نامی پروٹسٹنٹ فرقے کا حصہ بن گئے۔ جیسے آج کل پاکستان دشمن تنظیموں مثلاً تحریک طالبان پاکستان میں بھارتی خفیہ ایجنسی، را کے ایجنٹ پوشیدہ ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ تنظیم کے نظریات و خیالات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالا جا سکے۔

یہ پروٹسٹنٹ پیورٹن عیسائی برطانیہ، آئرلینڈ، جرمنی اور فرانس میں آباد تھے۔ ان کی بڑی تعداد بعد ازاں امریکا میں بھی مقیم ہو گئی۔ انہی پیورٹنوں میں سب سے پہلے یہ نظریہ پھیلا کہ مستقبل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں واپس آنے والے ہیں...... مگر شرط یہ ہے کہ یہودی دوبارہ فلسطین میں آباد ہو جائیں اور بیت المقدس میں تیسرا معبد تعمیر ہو جائے۔ کسی عیسائی فرقے میں ایسا نظریہ پہلے نہیں ملتا لہٰذا یہ یقینی ہے کہ

یہود نے جعلی عیسائی بن کر پیورٹنوں میں یہ نظریہ پھیلا دیا۔ مدعا یہی تھا کہ دنیائے عیسائیت میں یہود کے حامی وجود میں آ جائیں۔ یہ یہودی پلان آج کامیابی کا چولا پہن کر خوب پنپ رہا ہے۔

اب خاص طور پر امریکا میں ایسے کروڑوں عیسائی جنم لے چکے جو اس نظریے پر یقین رکھتے ہیں کہ دنیا میں حضرت عیسیٰؑ کی ''دوسری آمد'' (Second Coming) اسی وقت ممکن ہوگی جب خدانخواستہ مسجد اقصیٰ اور گنبد صخرہ شہید کر کے وہاں یہودی تیسرا معبد تعمیر کر لیں۔ انھیں یقین ہے کہ بائبل میں درج بعض کلمات اسی نظریے کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اس نظریے پر عمل پیرا امریکی و یورپی عیسائی اصطلاح میں ''صیہونی عیسائی'' (Zionist Christian) کہلاتے ہیں۔

ڈونلڈ ٹرمپ بھی خفیہ طور پر صیہونی عیسائی ہے۔ اسی لیے اس نے ایک یہودی بیٹی کی شادی پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہ امریکی صدر بننے سے قبل علی الاعلان کہتا تھا کہ بیت المقدس کو اسرائیل کا دارالحکومت تسلیم کر لیا جائے۔ مقصد یہ تھا کہ یہ مرحلہ طے ہو جانے کے بعد حرم شریف میں مسجد اقصیٰ اور گنبد صخرہ شہید کرنے کی تیاری شروع ہو جائے۔

حضرت عیسیٰؑ ''جھوٹے نبی'' ہیں

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وارثوں سے چلے تینوں مذاہب..... یہودیت، عیسائیت اور اسلام میں یہ نظریہ موجود ہے کہ قرب قیامت کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ زمین پر نازل ہوں گے۔ وہ پھر دجال سے مقابلہ کر کے اُسے قتل کریں گے۔ قتل وقتال کے بعد حضرت عیسیٰؑ کرۂ ارض پر اللہ تعالیٰ کی حکمرانی قائم کر دیں گے۔

لیکن تینوں ابراہیمی مذاہب میں ''نزول مسیح'' کا نظریہ مختلف ہے۔ حیرت انگیز بات یہ کہ یہودیت میں حضرت عیسیٰؑ ''جھوٹے نبی'' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ حقیقت دور جدید کے بہت سے عیسائیوں کو بھی نہیں معلوم اور وہ یہود کو اپنا دوست سمجھنے لگے ہیں۔ یہ تاریخ انسانی کی شاید انتہائی حیران کن ستم ظریفی ہے۔

یہود کے نزدیک ان کے آنے والے مسیحا کو بعض شرائط پر پورا اترنا ضروری ہے۔ یہ شرائط یہود کی مذہبی کتب میں درج ہیں۔ بعض اہم شرطیں یہ ہیں:

☆ وہ حضرت داؤدؑ کی اولاد سے ہوگا۔
☆ بیت المقدس میں ہر بیات کے مقام پر تیسرا معبد تعمیر کرے گا۔
☆ جب وہ بادشاہ بنے گا، تو دنیا کی تمام اقوام اس کی پیروکار بن جائیں گی۔
☆ اس کی آمد پر دنیا کے سبھی لوگ یہود کے خدا (یہوہ) کی عبادت کرنے لگیں گے۔
☆ یہودی قوم امن، خوشی و مسرت کو پالے گی،
☆ جن اقوام نے یہود پر ظلم توڑے ہیں، انھیں اپنی زیادتی کا احساس ہو جائے گا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو تاعمر یہودیوں سے خبر آزما رہے اسی لیے یہودی انھیں ''جھوٹا نبی'' قرار دیتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ نے ایک بار یہود کو ''اے احمقو اور اندھو'' کہہ کر مخاطب کیا۔ (متی ۲۳ آیت ۱۷)۔ ایک موقع پر انھیں کہا ''اے سانپو! اے افعیٰ کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیوں کر بچو گے؟'' (متی ۲۳، آیت ۲۳) غرض یہود کا مسیحا عیسائیوں اور مسلمانوں کے حضرت عیسیٰؑ سے بالکل مختلف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نظریے کے ضمن میں مسلمانوں اور عیسائیوں میں زیادہ مطابقت ہے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اعلان فرما رکھا ہے: ''اور بے شک وہ (عیسیٰ علیہ السلام جب آسمان سے نزول کریں

گے تو قرب) قیامت کی علامت ہوں گے۔ پس تم ہرگز اس میں شک نہ کرنا اور میری پیروی کرتے رہنا، یہ سیدھا راستہ ہے''۔ (سورہ الزخرف: ۶۱) اس آیت کریمہ کی رو سے حضرت عیسیٰؑ کا نزول قرب قیامت کی ایک بڑی نشانی ہے۔

اسلامی روایات کے مطابق جب حضرت مہدی علیہ السلام اور مسیح الدجال (جھوٹے نبی) کے مابین جنگ جاری ہو گی، تو اللہ تعالیٰ اسلام کی سربلندی کے لیے حضرت عیسیٰؑ کو نازل فرمائے گا۔ آپؑ دمشق کے نزدیک ایک مقام پر اتر کر دجال کے خلاف جاری جنگ میں شامل ہو جائیں گے۔ وہ پھر دجال کا سر اڑا دیں گے۔ تب یہودی اور عیسائی بھی حضرت عیسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ کا نبی سمجھنے لگیں گے۔ چناں چہ پورے کرۂ ارض پر اسلام کا نور پھیل جائے گا کیونکہ حضرت عیسیٰ مسلم نبی کے طور پر نازل کیے جائیں گے۔

نزول مسیح علیہ السلام کے متعلق ایک مصدقہ حدیث نبوی بھی موجود ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: ''وہ ساعت (قیامت) اس وقت تک نہیں آئے گی جب مریمؑ کے بیٹے (حضرت عیسیٰؑ) زمین پر آئیں گے۔ وہ ایک انصاف پسند حکمران ثابت ہوں گے۔ وہ صلیب توڑ ڈالیں گے اور سؤر قتل کریں گے۔ ان کے دور حکومت میں پیسے کی اتنی فراوانی ہوگی کہ خیرات لینے والا کوئی نہیں ملے گا''۔ (صحیح بخاری، کتاب سوم، حدیث نمبر ۶۵۶)

کیتھولک کلیسا میں بھی یہ نظریہ مقبول ہے کہ قیامت کے قریب حضرت عیسیٰؑ زمین پر دوبارہ نزول فرمائیں گے۔ تاہم پروٹسٹنٹوں کی اکثریت نزول مسیح کو اس شرط سے نتھی کرتی ہے کہ حرم شریف میں جب یہودی تیسرا معبد تعمیر کر لیں گے، تبھی حضرت عیسیٰؑ نازل ہوں گے۔ اسی لیے دنیا بھر کے پروٹسٹنٹ اس بات کے حامی ہیں کہ بیت المقدس کلی طور پر

پروٹسٹنٹ فرقے، پیورٹن کے پیروکار

اسرائیلی حکومت کے قبضے میں آجائے۔ اس طرح اسرائیلی کسی بہانے مسجد اقصیٰ اور گنبد صخرہ شہید کر کے تیسرے معبد کی تعمیر کر سکیں گے۔

یہودیت میں حرم شریف کی اہمیت

یہ واضح رہے کہ حرم شریف کی پہاڑی یا بلند علاقہ تقریباً ۱۳۷ ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ سطح سمندر سے ۷۴۰ میٹر (۲۴۲۸ فٹ) بلند ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا، ہر بیات کے نام سے مشہور یہ یہودیت میں مقدس ترین جگہ ہے۔ دنیا بھر میں یہودی کسی بھی جگہ ہوں، وہ ہر بیات کی طرف منہ کر کے ہی عبادت کرتے اور دعائیں پڑھتے ہیں۔ جیسے مسلمان خانہ کعبہ کی سمت منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔

یہودیت میں اس مقام کے تقدس کی اہمیت کا اندازہ یوں لگائیے کہ بہت سے یہودی ہر بیات (یعنی حرم شریف) میں چلنے سے گریز کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر وہ یہوہ (یہودی خدا) کے مقام پر نادانستگی میں چلے گئے، تو اس کی بے حرمتی ہو جائے گی۔

یہودی روایات کی رو سے ہر بیات وہ مقام ہے، جہاں سے انسانی آبادی کے پھیلنے کا آغاز ہوا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں سے مٹی لے کر خدا نے حضرت آدمؑ کا خاکی پتلا بنایا۔ مزید برآں یہی وہ مقام ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے فرزند، حضرت اسحٰقؑ کو قربان گاہ پر لٹایا تھا تاکہ ان کی قربانی کر سکیں۔ مگر اللہ نے ان کی جگہ مینڈھا قربان کرنے کی خاطر بھیج دیا۔

اب یہود کے تیسرے معبد یا ہیکل کی داستان بھی سن لیجیے۔ یہودی روایات کی رو سے اس معبد کی تعمیر ہر یہودی کا مذہبی فریضہ ہے۔ یہی نہیں ہر یہودی دن میں تین بار یہ دعا مانگتا ہے کہ یہوہ تیسرا معبد تعمیر کرنے میں ان کی مدد فرمائے۔ یہ دعا ''آمیدا'' (Amidah) کہلاتی ہے۔

یہودی علما کے مطابق تیسرے معبد کا ڈیزائن پرانے عہدنامے کی ''کتاب حزقی ایل'' میں موجود ہے چناں چہ اسرائیل کے یہودی اسی ڈیزائن کے مطابق حرم شریف میں تیسرا معبد بنانے کا منصوبہ بنائے ہوئے ہیں لیکن یہ قدم اٹھانے سے قبل مسجد اقصیٰ اور گنبد صخرہ شہید کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے، مسلمانان عالم اسرائیلی یہود کو ہرگز یہ اقدام نہیں کرنے دیں گے۔ اسرائیلی حکومت نے مسجد اقصیٰ یا گنبد صخرہ کی ایک اینٹ بھی گرائی، تو دنیا میں تیسری جنگ عظیم چھڑ سکتی ہے۔

صیہونیت کی ترویج و اشاعت

انیسویں صدی میں تحریک صیہونیت کی داغ بیل پڑی۔ اس کی بنیاد یورپی یہودیوں نے رکھی تاکہ فلسطین میں یہودی مملکت اسرائیل قائم ہو سکے۔ یورپ و امریکا میں اس صیہونی تحریک کے سب سے بڑے حامی پروٹسٹنٹ پادری تھے۔ ان پادریوں کے اثر و رسوخ اور دباؤ کی وجہ سے برطانوی اور امریکی حکومتوں میں طاقتور وزیر مشیر بھی تحریک صیہونیت کے حامی بن گئے۔

ڈاکٹر لورینزو کامیل بارو ڈیونیورسٹی کے ''سینٹر فار مڈل ایسٹرن اسٹڈیز'' سے وابستہ ہیں۔ وہ خطہ فلسطین کی تاریخ پر ایک مستند انگریزی کتاب ''Imperial Perception of Palestine'' تحریر کر چکے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر لورینزو رقم طراز ہیں:

''۱۸۳۰ء سے لے کر بیسویں صدی کے اوائل تک یورپ اور امریکا میں پروٹسٹنٹ پادریوں نے ایک ہزار سے زائد کتب تحریر کیں۔ ان میں اسی نظریے کی ترویج کی گئی کہ یہود کا فلسطین میں واپس جانا اور تیسرے معبد کی تعمیر لازم ہو چکی۔ ان کتب میں فلسطین میں آباد عربوں کا ذکر سرسری انداز میں کیا گیا جیسے ان کی کوئی اہمیت ہی نہیں''۔

انہی کتابوں کے ذریعے عیسائی دنیا میں یہ نظریہ پھیل گیا کہ اسرائیلی مملکت کے قیام سے بائبل کی ایک پیشین گوئی پوری ہو جائے گی۔ چنانچہ بائبل سے متاثر ہر عیسائی خصوصاً کٹر عیسائیوں نے اپنا یہ مذہبی فریضہ بنا لیا کہ وہ یہود کو دوبارہ فلسطین میں آباد کریں گے۔

ڈاکٹر لورینزو نے اپنی انکشاف انگیز کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ عیسائی صیہونیت کے نظریات پھیلانے میں ایک برطانوی ادارے ''فلسطین ایکسپلوریشن فنڈ'' (Palestine exploration fund) نے نہایت سرگرم کردار ادا کیا۔ یہ ادارہ ۱۸۶۵ء میں برطانوی ولی عہد نے لندن میں قائم کیا تھا۔ اس ادارے سے منسلک ماہرین آثار قدیمہ فلسطین میں کھدائیاں کرنے لگے تاکہ بائبلی پیشین گوئیوں کو درست ثابت کیا جا سکے۔ ان برطانوی ماہرین نے اپنی کتابوں میں فلسطینی عربوں کو بالعموم جاہل اور اجڈ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

غرض یورپی و امریکی پروٹسٹنٹ پادریوں اور برطانوی ماہرین آثار قدیمہ نے بائبل کی بنیاد پر ایک تصوراتی اسرائیل تخلیق کر ڈالا۔ اب خصوصاً برطانیہ اور امریکا میں ایک عام پروٹسٹنٹ عیسائی صیہونیت کے نظریات سے از حد متاثر ہو گیا۔ ان دونوں ممالک سے ہر سال ہزارہا عیسائی بیت المقدس اور فلسطین کے دیگر بائبلی مقامات کی سیاحت کرنے فلسطین جانے لگے جس پر پہلی جنگ عظیم کے دوران برطانیہ نے قبضہ کر لیا تھا۔

دنیائے مغرب میں اس طرح ''مذہبی سیاحت'' وجود میں آ گئی۔ اس کا موجد جدید ٹریول ایجنسیوں کا برطانوی بانی تھامس کک تھا۔ اس نے اپنی ٹریول ایجنسی کھول کر جو پہلا کاروبار کیا، وہ پچاس سیاحوں کو بیت المقدس کی طرف بھجوانا تھا۔

بیسویں صدی میں ریڈیو، ٹیلی ویژن اور آخر میں انٹرنیٹ جیسے تیز رفتار ذرائع ابلاغ ایجاد ہوئے، تو خصوصاً امریکا میں عیسائی صیہونیت کے نظریات گھر گھر پہنچ گئے۔ ٹی وی چینلوں پر پروٹسٹنٹ پادری ڈرامائی انداز میں ان نظریات کی ترویج کرنے لگے۔ اسرائیل کا موجودہ وزیر اعظم، بنجمن نیتن یاہو کئی بار اعتراف کر چکا کہ امریکا و یورپ میں صیہونی عیسائی ہی سب سے زیادہ یہود کے مفادات پورے کر رہے ہیں۔

امریکا میں انٹرنیشنل کرسچن ایمبسی، کرسچن فرینڈز آف اسرائیل اور کرسچنز یونائیٹڈ فار اسرائیل صیہونی عیسائیوں کی سب سے بڑی تنظیمیں ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ امریکا میں پانچ کروڑ افراد تنظیموں کے رکن ہیں اور یہ سچ دکھائی دیتا ہے۔ وجہ یہ کہ صدر ٹرمپ کو صدارتی الیکشن میں انہی صیہونی عیسائیوں نے یکجا ہو کر ووٹ ڈالا اور اُسے کامیاب کروا دیا۔

عیسائی صیہونیوں کا ایجنڈا

جب صدر ٹرمپ صدر بن گیا، تو درج بالا تنظیمیں اس پر دباؤ ڈالنے لگیں کہ بیت المقدس کو اسرائیل کا دارالحکومت تسلیم کر لیا جائے۔ اسی دباؤ کے باعث ہی ٹرمپ نے آخر ۶ دسمبر کو یہ اعلان کر دیا۔ امریکی ماہرین کے مطابق صیہونی عیسائی تنظیمیں چھ نکاتی سیاسی ایجنڈے پر کام کر رہی ہیں۔ ان نکات کی تفصیل یہ ہے:

☆ یہودی ہی خدا کی سب سے چہیتی اور برگزیدہ قوم ہے۔ اس لیے ہر عیسائی کو ان کی حمایت و سرپرستی کرنی چاہیے۔

☆ عظیم اسرائیل کی سرحدیں دریائے نیل (مصر) تا دریائے فرات (عراق) تک پھیلی ہوں گی لہٰذا تمام عیسائیوں کو یہ مملکت قائم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔

☆ دریائے نیل تا دریائے فرات تک پھیلی اسرائیلی مملکت میں صرف یہود آباد ہوں گے لہٰذا فلسطینی عربوں کو ہر حال میں اس مملکت سے نکلنا ہوگا نیز علاقے میں یہودی بستیوں کا پھیلاؤ جاری رکھا جائے۔

☆ یروشلم (بیت المقدس) اسرائیل کا خصوصی اور دائمی دارالحکومت ہے۔ وہ عربوں کو نہیں دیا جاسکتا۔

☆ صیہونی عیسائی ان تنظیموں کو دل کھول کر چندہ دیں جو تیسرا معبد تعمیر کرنا چاہتی ہیں۔

☆ مستقبل میں "ہرمجدون" (آرماگیڈون) یعنی عظیم جنگ ہوگی۔ اسی لیے صیہونی عیسائی اسرائیلی حکومت اور فلسطینیوں کے مابین جاری "امن عمل" کے شدید مخالف ہیں۔

یہ بات لمحہ فکریہ ہے کہ ایک طرف تو امریکا و یورپی ممالک میں صیہونی عیسائیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے جبکہ عرب ممالک کی حکومتیں پہلے کی طرح فلسطینی عربوں کی پُرجوش حامی نہیں رہیں۔ خاص طور پر سعودی حکومت کے رویّے پر عالمی میڈیا میں افواہوں کا بازار گرم ہے۔

مثال کے طور پر ماہ نومبر میں فلسطین کے صدر محمود عباس نے سعودی عرب کا دورہ کیا تھا۔ تبھی مشرق وسطیٰ کے بعض اخبارات نے یہ خبر شائع کی کہ سعودی ولی عہد، شہزادہ محمد بن سلمان نے صدر عباس پر زور دیا ہے کہ وہ مشرقی بیت المقدس کو فلسطینی ریاست کا دارالحکومت بنانے کے اپنے مطالبے سے دست بردار ہو جائیں۔ گویا شہزادے نے فلسطینیوں پر زور دیا کہ وہ بیت المقدس کو بطور اسرائیل کا دارالحکومت تسلیم کرلیں۔

اسی طرح جب صدر ٹرمپ نے یروشلم کو اسرائیل کا دارالحکومت مان لیا، تو یہ افواہ پھیل گئی کہ اس کو سعودی عرب اور مصر نے یہ اعلان کرنے کے سلسلے میں ہری جھنڈی دکھادی تھی۔ جب ترک صدر، طیب اردگان نے جنم لینے والے مسئلے پر اسلامی سربراہی تنظیم کی کانفرنس استنبول میں بلوائی، تو اس میں بھی بیشتر عرب حکمران غیر حاضر تھے۔ جبکہ وینزویلا کے صدر اس میں شریک ہوئے۔

یاد رہے، ٹرمپ نے عہدہ صدارت سنبھالنے کے بعد جس پہلے اسلامی ملک کا دورہ کیا وہ سعودی عرب ہے۔ جبکہ مصر معاہدہ کیمپ ڈیوڈ کے بعد سے ہر سال امریکا سے اربوں ڈالر وصول کررہا ہے۔

درج بالا تمام داستان سے عیاں ہے کہ اسرائیلی یہودی اور صیہونی عیسائی رفتہ رفتہ اپنے اصل مقصد کی طرف بڑھ رہے ہیں..... یہ کہ مسجد اقصیٰ اور گنبد صخرہ شہید کردیا جائے تاکہ تیسرا معبد تعمیر کرنے کی راہ ہموار ہوجائے۔ یہود اور صیہونی عیسائیوں کا یہ کوئی معمولی منصوبہ نہیں بلکہ اُسے انجام دینا ان کی مذہبی ذمے داری بن چکی۔

یہ منظر نامہ آشکارا کرتا ہے کہ مستقبل میں مسلمانانِ عالم اور یہود اور ان کے حامی نصاریٰ کے درمیان حرم شریف پر اسرائیلی حملے کی صورت زبردست ٹکراؤ جنم لے سکتا ہے۔ اہم بات یہ کہ تینوں ابراہیمی مذاہب میں اس عظیم الشان ٹکراؤ کی پیشین گوئیاں موجود ہیں۔ اگر مسلمانوں اور یہود نے حرم شریف کا مسئلہ افہام وتفہیم سے حل نہ کیا تو یہ پیشین گوئیاں حقیقت کا روپ دھار سکتی ہیں۔

یہ ٹکراؤ پھر تیسری عالمی جنگ کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ اس وقت اسرائیل ایٹمی طاقت ہے۔ اگر اسرائیلی حکومت نے مسجد اقصیٰ یا گنبد صخرہ کو نقصان پہنچانے کی ناپاک جسارت کی، تو نتیجتاً ظہور پزیر ہونے والی مسلم یہودی جنگ میں دیگر ایٹمی قوتیں مثلاً امریکا، روس اور پاکستان بھی شامل ہو جائیں گی۔ گویا یہ ایٹمی جنگ چھڑی، تو دنیا کا بڑا حصّہ تباہ و برباد ہوسکتا ہے۔ ◆◆◆

نام کتاب: صیہونیت کی زد میں عالم تمام۔ مصنف: رضی الدین سید۔ قیمت: ۳۵۰ روپے۔ ناشر: نیشنل اکیڈمی آف اسلامک ریسرچ، کلفٹن، کراچی۔ فون نمبر: ۰۳۳۲۳۹۷۵۷۱

یہود نے انیسویں صدی میں تحریک صیہونیت کی بنیاد رکھی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ فلسطین میں یہودی ریاست کا قیام ممکن بنایا جا سکے۔ یہود نے برطانیہ اور امریکا کی آشیرباد سے یہ مقصد حاصل کرلیا، مگر اس دوران لاکھوں فلسطینی مسلمان بے گھر ہوگئے اور یہودی انتہا پسندوں نے ہزارہا شہید بھی کرڈالے۔

قیام اسرائیل کے بعد میں بھی تحریک صیہونیت جاری و ساری رہی۔ وجہ یہ کہ اس تحریک سے منسلک یہودی "گریٹر اسرائیل" بنانا چاہتے ہیں جس کی سرحدیں دریائے نیل سے دریائے فرات تک پھیلی ہوں گی۔ اسی لیے یہودی عالم اسلام کے خلاف خفیہ وعیاں سازشیں کرنے میں مصروف ہیں تاکہ امت کا اتحاد پارہ پارہ کیا جاسکے۔

زیر تبصرہ کتاب میں مصنف نے یہود کی وہ کارروائیاں اور سرگرمیاں شرح وبسط سے بیان کی ہیں جو وہ "گریٹر اسرائیل" قائم کرنے کی خاطر انجام دے رہے ہیں۔ اس کی تفصیل آشکارا کرتی ہے کہ یہود عالم اسلام کے لیے بہت بڑا خطرہ بن چکے اور ان کی سرکوبی نہ ہوئی تو وہ مستقبل میں ناقابل شکست بن سکتے ہیں۔

کتاب کی طباعت معیاری اور قیمت مناسب ہے۔

یہودیت کے ماضی، حال اور مستقبل سے دلچسپی رکھنے والے قارئین اسے دل پسند کتاب پائیں گے۔

نام کتاب: بینکنگ گائیڈ۔ مصنف: مقصود احمد چغتائی۔ ناشر: ولید پبلشر۔ ۳۹۴، بلاک جی۔ ۴، ایم اے جوہر ٹاؤن لاہور۔ قیمت: ۱۰۰۰ روپے۔ رابطہ نمبر: ۰۳۳۳۴۲۵۴۳۹۴

بینک کا شمار ایسے شعبوں میں ہوتا ہے جو مثبت اور منفی دونوں قسم کی خصوصیات رکھتے ہیں۔ بعض لوگ بینک سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے جبکہ دیگر کا سارا کاروبار بینکوں کے تعاون سے چلتا ہے۔ بہرحال عام لوگ بینکاری کے عمل اور اصلاحات سے ناواقف ہوتے ہیں۔

مصنف نے ان کی سہولت کے لیے ہی یہ کتاب لکھی ہے۔

اس کتاب میں اکاؤنٹ کھولنے کے طریق کار، قرضوں کے حصول، ون ونڈو سروس، کار، ہاؤسنگ، بلڈنگ اور پراجیکٹ فنانسنگ کے بارے میں مفید معلومات دی گئی ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے عام آدمی بینکاری کی مبادیات سے خاصی حد تک آگاہ ہو جاتا ہے۔

کتاب مناسب کاغذ پر اچھے انداز میں شائع ہوئی ہے۔ شعبہ بینکاری سے دلچسپی رکھنے والے اسے معلوماتی و کارآمد کتاب پائیں گے۔

نام کتاب: باتیں سیاستدانوں کی۔ مصنف: ضیا شاہد۔ ناشر: قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل، والٹن روڈ لاہور کینٹ۔ قیمت: ۱۲۰۰/- فون نمبر: ۰۳۰۰۵۱۵۱۰۱، ۰۳۳۳۴۳۹۳۴۲۲

محترم ضیا شاہد صحافتی برادری میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں اور ہماری قومی زندگی کے بہت سے اہم واقعات کے چشم دید گواہ ہیں۔ زیر نظر کتاب ان کے اخباری کالموں میں مختلف سیاستدانوں کے حوالے سے بیان کیے گئے واقعات کا مجموعہ ہیں۔

اس کتاب میں جنرل ایوب خان، ذوالفقار علی بھٹو، نواب زادہ نصر اللہ خان، سید ابوالاعلیٰ مودودی، جنرل محمد ضیا الحق، غلام اسحاق خان، قاضی حسین احمد، ملک معراج خالد، حنیف رامے، کے ایچ خورشید، خواجہ رفیق اور عمران خان کے حوالے سے انتہائی دل چسپ معلومات قارئین تک پہنچائی گئی ہیں۔

ضیا شاہد نے بطور صحافی بہت متحرک زندگی گزاری ہے اور اُردو ڈائجسٹ سمیت تقریباً تمام قومی اخبارات میں صحافتی خدمات سرانجام دی ہیں۔

سیاست دانوں سے اُن کا براہِ راست تعلق خاطر رہا ہے اور انھوں نے قارئین تک ہمارے ان راہنماؤں کی گفتنی اور ناگفتنی دونوں طرح کی معلومات پہنچائی ہیں۔

کتاب کا انداز بیان سادہ لیکن دلچسپ ہے۔ پہلے صفحے سے ہی کتاب قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور آخری صفحے تک اس کا تاثر برقرار رہتا ہے۔ یہ کتاب پولیٹیکل سائنس سے دلچسپی رکھنے والے افراد کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ کا درجہ رکھتی ہے۔ اسے ہر لائبریری میں ضرور موجود ہونا چاہیے تاکہ تحقیق کرنے والوں کو ہماری قومی زندگی کے اہم راہنماؤں کے حوالے سے براہِ راست معلومات مل سکیں۔

کتاب کو قلم فاؤنڈیشن نے خوبصورت سفید چکنے کاغذ پر نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ جس کی وجہ سے کتاب کی قیمت عام قاری کی قوت خرید سے کچھ زیادہ ہوگئی ہے۔ تاہم پھر بھی اپنے مواد کے لحاظ سے اس کتاب کو خریدنا مہنگا سودا نہ ہوگا۔ (تبصرہ نگار۔ زاہد عرفان) ◆◆◆

(بغیر جنگ کے بغیر ایک ملک فتح کرنا)

یہ ''برین واشنگ'' کا ایک عظیم اور سست رفتار عمل ہے۔ اس کو چار مراحل میں تقسیم کیا گیا ہے۔

☆☆☆

پہلا مرحلہ ''اخلاق ابتری'' (Demoralization) کہلاتا ہے۔ اس مرحلے میں ہر ممکن سعی ہوتی ہے کہ ایک قوم کی اخلاقیات تباہ کردی جائیں۔ اس کام میں پندرہ سے بیس سال لگتے ہیں۔ آپ پوچھیں گے کہ اتنا طویل عرصہ کیوں؟ وجہ یہ ہے کہ ہر ملک میں ایک نسل تعلیم یافتہ ہونے میں پندرہ سے بیس سال لگاتی ہے لہٰذا نظریاتی بر اندازی کی جنگ میں پوری ایک نسل کو ٹارگٹ بنایا جاتا ہے۔ اس دوران سعی رہتی ہے کہ اس نسل کا اخلاق تباہ کردیا جائے۔

''اخلاق ابتری'' کے مرحلے میں خفیہ ایجنسیاں ٹارگٹ شدہ ملک کے میڈیا کو خریدنے کی کوششیں کرتی ہیں۔ وہ صحافیوں، ٹی وی اینکروں، ناشرین، ایڈیٹروں، ماہرین تعلیم، پروفیسروں اور دانش وروں کو منہ مانگی رقم دیتی ہیں تاکہ وہ دشمن ملک کی خفیہ ایجنسیوں کے دیے گئے ایجنڈے پر عمل کر سکیں۔ اس ایجنڈے کے تحت تحریروں، فلموں اور ڈراموں کے ذریعے ٹارگٹ ملک میں خاص طور پر فحاشی پھیلائی جاتی ہے نیز سعی ہوتی ہے کہ جھوٹ پھیلائے جائیں تاکہ لوگ کنفیوز ہو جائیں اور سچ کو آسانی سے نہ پا سکیں۔

پاکستان میں بھی پچھلے پندرہ سولہ برس سے میڈیا مادر پدر آزاد ہو چکا۔ خاص طور پر چینلوں سے پیش کیے ڈرامے پاکستانی معاشرے میں مغربی روایات اور مادہ پرستی کو پروان چڑھا رہے ہیں۔ ان کے باعث بہت سی اسلامی اور مشرقی اقدار قصۂ پارینہ بن چکیں۔

رفتہ رفتہ ٹارگٹ ملک کے سیاست داں، ارکان پارلیمنٹ اور دیگر بااثر لوگ بھی خرید لیے جاتے ہیں۔ یہ بھی اپنے ہی ملک میں ''اخلاق ابتری'' مرحلے کو بڑھاوا دینے لگتے ہیں۔ خفیہ ایجنسیاں پھر رقم پانی کی طرح بہا کر کوشش کرتی ہیں کہ ٹارگٹ ملک میں اس کے ایجنٹ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو جائیں۔ یوں ان کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ مملکت میں جو بھی شخص ''اخلاق ابتری'' مرحلے کی راہ میں رکاوٹ بنے، اُسے عموماً مار دیا جاتا ہے۔

ٹارگٹ ملک میں دشمن ملک کی خفیہ ایجنسیوں کے ایجنٹ مذہبی تنظیموں، این جی اوز، اسکول، کالجوں، یونیورسٹیوں اور دیگر سماجی و کلچرل اداروں میں بھی داخل ہو جاتے ہیں۔ مقصد یہی ہوتا

یوری بزمنوف بھارت میں ایک دوست کے ساتھ

ہے کہ عام شہری کی اخلاقیات اتنی زیادہ تباہ کردی جائے کہ وہ نیکی اور برائی کو غلط ملط کردے۔ ایسے شہریوں کا ضمیر نیم مردہ ہو جاتا ہے، چناں چہ وہ بدی کے خلاف احتجاج کرنے کے قابل نہیں رہتے اور انھیں موم کی طرح کسی بھی سمت موڑا جا سکتا ہے۔

جب معاشرہ خاصی حد تک اخلاق باختہ ہو جائے، تو پھر ٹارگٹ ملک کی سیکورٹی فورسز مثلاً فوج، رینجرز اور پولیس کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ سعی ہوتی ہے کہ ان میں کرپشن پھیل جائے اور اخلاقیات کا معیار بھی پست ہونے لگے۔ اس مہم کا مقصد یہ ہے کہ ٹارگٹ ملک کا دفاع کمزور ہو سکے۔

خفیہ ایجنسیوں کے کارندے سرکاری اداروں میں کرپشن کی وبا پھیلا دیتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے کام کے لیے بھی سرکاری افسر رشوت مانگنے لگتے ہیں۔ سرکاری منصوبوں

میں ''کک بیکس'' لینا معمول بن جاتا ہے۔ کرپشن کا زہر معاشرے میں شدومد سے پھیلایا جاتا ہے کیونکہ یہ ہر شہری کی اخلاقیات کا جنازہ نکال دیتا ہے۔

دشمن ملک یا ملکوں کی خفیہ ایجنسیاں ایسے ہتھکنڈے بھی اپناتی ہیں کہ ٹارگٹ ملک کی معیشت تباہ یا کمزور ہو جائے۔ ملک کو عالمی سطح پر تنہا کرنے کی بھی سعی ہوتی ہے۔ غرض ہر ممکن ایسا اقدام کیا جاتا ہے کہ ٹارگٹ ملک کو معاشرتی، سیاسی، انتظامی، معاشی اور تعلیمی طور پر کمزور کر دیا جائے۔ یہ عمل بیس سے تیس سال میں پورا ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد اگلا مرحلہ ''عدم استحکام'' (Destablization) شروع ہوتا ہے۔ اس مرحلے سے قبل ٹارگٹ قوم کی شکست وریخت تقریباً مکمل ہو جاتی ہے۔ عام فرد اپنا اخلاق کھو چکا ہوتا ہے۔ اب وہ محب وطن نہیں رہتا اور خودغرض بن جاتا ہے۔ وہ بس اپنی خواہشات وتمناؤں سے مطلب رکھتا ہے اور ملک وقوم کی پروا نہیں کرتا۔ اس خود غرضانہ روّیے کے باعث معاشرے میں بے چینی وابستری بڑھ جاتی ہے۔ یہ مرحلہ تین سے پانچ سال تک رہتا ہے۔

اب تیسرے مرحلے ''بحران'' (Crisis) کا نمبر آتا ہے۔ یہ مرحلہ تین سے چھ ماہ تک رہتا ہے۔ اس مرحلے میں خفیہ ایجنسی یا ایجنسیوں کے کارندے ٹارگٹ ملک میں ہڑتالیں، احتجاجی جلسے اور دھرنے کروانے لگتے ہیں۔ جرائم بڑھ جاتے ہیں اور بعض اوقات دہشت گردی بھی کروائی جاتی ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ حکومت مکمل طور پر بے دست وپا ہو کر کام کرنا چھوڑ دے۔

پھر چوتھے اور آخری مرحلے ''معمول پر آنا'' (Normalization) کا آغاز ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں ٹارگٹ ملک پر دشمن ملک کا قبضہ ہو جاتا ہے یا پھر وہ نظریاتی طور پر شکست کھا جاتا ہے۔ معنی یہ کہ دشمن ملک کے نظریات ٹارگٹ ملک میں غلبہ حاصل کر لیتے ہیں۔

☆☆☆

قارئین! آپ اب تک براندازی کے انتہائی خفیہ عمل کو سمجھ گئے ہوں گے۔ پاکستان ایک ایٹمی ملک ہے۔ یہ عالم اسلام میں سب سے زیادہ طاقتور فوج بھی رکھتا ہے۔ اسی لیے یہ یقینی ہے کہ مسلم دشمن طاقتوں مثلاً اسرائیل وبھارت نے امریکی خفیہ ایجنسیوں کے تعاون سے پاکستان میں عمل براندازی شروع کر رکھا ہو۔ اگر یوری بزمنوف کا خاکہ دیکھا جائے، تو احساس ہوتا ہے کہ پاکستان میں فی الوقت اس عمل کا پہلا مرحلہ (اخلاق ابتری) جاری ہے اور اس مرحلے کو خصوصاً پاکستانی میڈیا میں پوشیدہ غدار انجام دے رہے ہیں۔

میلکم ایکس امریکا کا مشہور سیاہ فام نومسلم راہنما گزرا ہے۔ اس کا قول ہے: ''کرۂ ارض پر میڈیا سب سے طاقتور شے ہے کیونکہ وہ یہ قوت رکھتا ہے کہ معصوم کو گناہ گار بنا دے اور مجرم کو معصوم بنا ڈالے۔ ایسا اس لیے کہ میڈیا عوام کے ذہن کنٹرول کرتا ہے''۔

میڈیا کی ازحد قوت کے باعث ہی مسلم دشمن خفیہ ایجنسیوں کی کوشش ہے کہ پاکستان سمیت تمام اسلامی ممالک کے میڈیا میں نفوذ کیا جائے۔ میڈیا میں اپنے ایجنٹ داخل کر کے یہ ایجنسیاں کسی بھی معاشرے میں شہریوں کی اخلاقیات کے تار و پود بکھیر سکتی ہیں۔

اب ذرا پاکستانی میڈیا کا جائزہ لیجیے۔ پچھلے ایک عشرے سے بعض ٹی وی چینل ایسے ڈرامے دکھا رہے ہیں جن کے موضوعات پر پہلے کبھی کھل کر بات نہیں ہوتی تھی۔ ان ڈراموں نے چند مخرب الاخلاق موضوعات کو بھی گھروں کے اندر پہنچا دیا چنانچہ ایسے بیہودہ موضوعات پر ڈرامے ابھی تک نشر ہو رہے ہیں۔

ہر باشعور پاکستانی کو یوری بزمنوف کے لیکچر ضرور سننے چاہئیں۔ اس طرح وہ پاکستان دشمن طاقتوں کی سرگرمیوں سے آگاہ وآشنا رہیں گے جو براندازی ودیگر طریقوں اور سازشوں سے وطن عزیز کو کمزور وغیر مستحکم کرنے کے درپے ہیں۔ براندازی کا طریق کار جان کر پاکستانی قوم دشمن کی چالوں کا بخوبی مقابلہ کر سکے گی۔

قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم

چمنِ خیال

عالم اسلام اور فتنہ یہودیت

دنیا کی تمام قوموں میں اچھائیاں اور برائیاں پائی جاتی ہیں، مگر یہودی قوم فتنہ وشرارت میں سب سے آگے ہے۔ اس نے اپنے آگے کسی کا چراغ نہ جلنے دیا۔ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ عالمِ اسلام کو جو خطرہ یہودیت سے لاحق ہے، وہ کسی اور قوم سے نہیں۔ رسول کریم ﷺ کی احادیث کی روشنی میں یہ بات ثابت ہے کہ مسلمانوں کی آخری جنگ جس قوم سے ہوگی وہ یہودی ہیں۔

۱۹۱۹ء میں پہلا یہودی قافلہ لندن، پیرس، برلن اور نیویارک جیسے بڑے شہروں کا آرام چھوڑ کر حیفہ اور تل ابیب کے ویرانوں میں آبسا۔ وہ وہاں آرام وآسائش نہیں بلکہ ایک ایسی جنگ لڑنے کے لیے اکٹھے ہو رہے ہیں جس کی تیاری وہ سو برس سے کر رہے ہیں۔ یہود کا اعلان ہے کہ ان کا مسیحا آ کے اُن کی عظیم الشان سلطنت قائم کرے گا جس کی سرحدیں فرات تک پھیلی ہوں گی۔

(تحسین گل۔ راولپنڈی)

شمارہ دسمبر میری نظر میں

دسمبر کا شمارہ عظیم چینی لیڈر ''شی جن پنگ'' کے سرورق کے ساتھ ملا۔ قدرت کے خودکار منصفانہ نظام میں کچھ ایسے روایت شکن بھی ہوتے ہیں جو معاشرے کی برائیوں کے خلاف تن تنہا سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ بالآخر ان کی ذاتی جدوجہد عالمی پیمانے پر ایک مثال بن جاتی ہے۔ ''شی جن پنگ'' کی کہانی بھی ایسی ہی جدوجہد سے معمور تھی۔ عزم وحوصلہ ہو تو قوموں کی زندگی میں تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ اس تحریر میں ہمارے حکمرانوں کے لیے بھی بہت کچھ ہے کہ جن کے ہاں کرپشن ہی نظر آتی ہے۔ کرپشن کے خلاف جیسی جنگ چین کے اس لیڈر نے لڑی۔ ایسا اگر ہمارے

ہاں بھی ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ پاکستان ترقی کی شاہراہ پر چل نکلے اور اسے اپنا نظام چلانے کے لیے قرض نہ لینا پڑے۔

''یادِ رفتگاں'' میں الطاف حسن قریشی صاحب نے جناب مشکور حسین یاد کا تذکرہ کیا۔ وہ خود آزادی کا ایسا چراغ تھے کہ جنہوں نے اپنے لہو سے دیے کی لَو جلائی تھی۔ اُن کی کتاب ایک گھرانے نہیں بلکہ ایک ملک اور ایک عہد کی کہانی تھی۔ مشکور حسین یاد اس کتاب کی صورت ہمارے دلوں میں زندہ رہیں گے۔

رضوان احمد کا سچا واقعہ ماں کے لمس نے مردہ بیٹا زندہ کر دیا جذبات و احساسات سے بھرپور تھا۔ اسی طرح غیر ملکی ادب سے سمرسٹ ماہم کی کہانی ماتا بھی ماں کی محبت کا ایک منفرد رنگ لیے ہوئے تھی۔ ربیع الاوّل کے حوالے سے فیصل رضا کی تحریر صبح بہاراں بھی ایمان افروز تھی۔ آپ ﷺ تمام جہانوں کے لیے رحمت ہیں۔ سیّد قاسم محمود کا سلسلہ مسلم ہندوستان کی تاریخ ایک بیش قیمت دستاویز ہے۔ ایسی تحریریں شائع ہوتی رہنی چاہئیں تاکہ نئی نسل اپنے اسلاف کے کارناموں سے آگاہ ہو سکے۔ بچوں کو مٹی میں کھیلنا چاہیے، ارم ناز کی تحریر یقیناً فوز ائیدہ بچوں کی ماؤں کے لیے تحفہ ہے کہ اس سے ان کے بے شمار ابہام دور ہو جائیں گے۔ صالحہ محبوب، طاہرہ اقبال اور ڈاکٹر عدیل احمد کے افسانے بھی زبردست تھے۔

(رانا محمد شاہد۔ بورے والا)

شی جن پنگ کی داستانِ عجب

دسمبر کا شمارہ ہمیشہ کی طرح خوبصورت سرورق اور شاندار تحاریر لیے ملا۔ ٹائٹل سٹوری صدر شی جن پنگ کی داستانِ عجب پڑھی۔ لطف آیا اور ہر پاکستانی کی مانند رشک بھی۔ کاش ہمارے حکمران خوابِ غفلت سے بیدار ہو جائیں۔ ملکی خزانے کا طواف کرنا اور ایک دوسرے کے بخیے ادھیڑنا چھوڑ کر وطن عزیز کی خوشحالی اور ترقی کے متعلق سنجیدہ ہو جائیں۔ کم از کم اپنے دوست ملک کے حکمران کی سوچ و فکر اور نظریات سے کوئی قیمتی راز کشید کر کے خود کو عبرت ناک انجام سے بچالیں۔ قائداعظم سے منسوب سیاہ جھوٹ بھی زیرِ مطالعہ رہا۔ حاسدین کے علاوہ نااہل اور لاعلم حضرات ہی ایسی بے بنیاد اور بے سروپا باتیں قائد سے منسوب کر سکتے ہیں۔

(اقرا کاشف زبیر، پشاور)

معیارِ ادب

ادب عالمگیر انسانی تصور کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ بین الاقوامیت کا ترجمان ہے اور آزاد ضمیر و خیال کا نقیب ہے۔ حقیقی ادب وہی جو اس معیار پر پورا اُترے۔ یہ معیار 'اُردو ادب' 'اُردو ڈائجسٹ' بخوبی پورا کر رہا ہے۔

(نقی حسین نقی امروہوی، کراچی)

انصاف کی عدم فراہمی

پاکستان قائم ہوئے ستر سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا۔ معاشرے میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہ ہو سکی۔ غیر مسلموں کی تعداد ضرور کم ہوئی لیکن اطوار تبدیل نہیں کیے جا سکے۔ مثال کے طور پر سورہ البقرہ رکوع ۳۸ میں سختی سے منع کیا گیا ہے کہ سودی لین دین ترک کر دیا جائے لیکن اس حکم پر توجہ دینا شاید گوارا نہیں کیا گیا۔ نتیجتاً ملک دو کھرب روپے کا مقروض ہو چکا۔ کفار کے طور طریقے ہر کام میں رائج ہیں۔ سوائے حکومت حاصل کرنے اور مزے لوٹنے کے، کسی کو فکر نہیں۔

انگریز کے زمانے والے قوانین بدستور چل رہے ہیں۔ مقدمات، عدالتیں، کچہریاں، وکلا سب عذاب الٰہی کا منظر پیش کرتے ہیں۔ اللہ کسی کو اس عذاب میں نہ ڈالے۔ بدامنی اور کرپشن اسی کا نتیجہ ہے جو سب بھگت رہے اور بہتری کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ لاکھوں مقدمات سالوں سے چل رہے اور ختم ہونے کے بجائے بڑھتے جا رہے۔ اس ملک میں اسلامی نظام قائم کرنے میں رکاوٹ کیوں ہے؟ مختلف فرقوں کے علما نے متفقہ نکات تجویز کر دیے ہیں۔ کوئی بھی فرقہ، کوئی عالم قتل، چوری، زنا، ڈاکا اور جھوٹ کو جائز قرار نہیں دیتا۔ چناں چہ اسے رائج کر کے امن جلد از جلد قائم کیا جا سکتا ہے۔

(ڈاکٹر محمد عظیم مجوکہ، شیخوپورہ)

BURALA DIVISION L.C.C. EAST FAISALABAD

TENDER NOTICE

Sealed Tenders based on the Market Rates System (MRS, 2nd Bi-annual period) 1st July 2017 to 31st December 2017) based on standardized schedule of market rate of related District Faisalabad / Toba Tek Singh based on item rate are invited for the works listed below from the approved Contractors of Irrigation Department who have deposited their Enlistment / Renewal Fee for the year 2017-2018 with the Department. The Tenders / Bidding documents etc: can be obtained from the office of the undersigned during office hours on payment of printing charges of tender documents noted against each work (non-refundable) from the date of publication upto **10.01.2018** & tender will be received on **11.01.2018 at 01:30 PM and opened on the same date at 02:00 PM in the office of the undersigned in** presence of the Contractors or their authorized representatives, who are present at the time with authorized letter.

CONDITIONS.

1. Earnest money@ 2% of Estimated Cost in shape of Call Deposit Receipt of any scheduled Bank will be accepted, in absence of which no tender will be issued / entertained.
2. The tender form will be issued to those contractors who will produce original Enlistment letters / Renewal Fee.
3. Blank Tender Form can be obtained during office hours on payment of tender fee mentioned below in Per tender (Non-refundable). No tender will be issued on the date of opening tenders.
4. Schedule of quantities, specification, drawing and other conditions of contract etc: can be seen during the office hours in the office of the undersigned on any working day.
5. The conditional and postal tender will not be accepted.
6. The procuring agency may reject all bids or proposals at any time prior to the acceptance of a bid or proposal as per PPRA Rule 35"

(2014).

Incomplete / overwriting / cutting in the tender form is not acceptable.

7. The lowest Contractor will have to supply the non-judicial paper for the amount fixed by the Government as Stamp duty.

8. Tenders will be received according to single stage (One envelope procedure Under PPRA rule 38 (2014).

SR. No.	Name of Work	Sanctioned No / Date	Estimated Amount (Rs.)	Earnest Money	Tender Fee	Time Limit
1	Checking Side erosion u/s Right Side of V.R Bridge RD. 92+500 of Burala Branch.	XEN:BRL:N0.39 Dt.05.12.17	411413/-	@ 2% of Estimated Cost	100/-	Closure Period
2	Protecting Weak Bank Ghat site at RD. 121+000/L&R & RD. 125+000/L of Burala Branch.	XEN:BRL:N0.40 Dt.05.12.17	524003/-	@ 2% of Estimated Cost	100/-	Closure Period
3	Protecting Eroded Apron of D/S Pitching of X-Regulator at RD. 146+500 of Burala Branch.	XEN:BRL:N0.42 Dt.05.12.17	570811/-	@ 2% of Estimated Cost	100/-	Closure Period
4	Painting X-Regulator and Head Regulators in Burala Section.	XEN:BRL:N0.45 Dt.14.12.17	202166/-	@ 2% of Estimated Cost	100/-	Closure Period
5	Protecting Eroded Apron D/S of X-Regulator at RD. 166+000 of Burala Branch.	XEN:BRL:N0.46 Dt.14.12.17	210726/-	@ 2% of Estimated Cost	100/-	Closure Period
6	Protecting Eroded Apron D/S Pitching of X-Regulator at RD. 110+500 of Burala Branch.	XEN:BRL:N0.47 Dt.14.12.17	500472/-	@ 2% of Estimated Cost	100/-	Closure Period
7	Repairing Painting X-Regulators and Head regulators in Rurala Section.	XEN:BRL:N0.48 Dt.14.12.17	432242/-	@ 2% of Estimated Cost	100/-	Closure Period

8	Protecting Weak Bank Ghat site at RD. 118+500/L of Burala Branch.	XEN:BRL:N0.49 Dt.14.12.17	229143/-	@ 2% of Estimated Cost	100/-	Closure Period
9	Repairing Painting Hydraulic Structures / Bridges along Burala Branch in Canal Farida Section	XEN:BRL:N0.50 Dt.14.12.17	405033/-	@ 2% of Estimated Cost	100/-	Closure Period
10	Painting Writing Data Boards along Burala Branch in Farida Section.	XEN:BRL:N0.51 Dt.14.12.17	128096/-	@ 2% of Estimated Cost	100/-	Closure Period
11	Repairing Painting, Gates & Gearing System of Burala Branch Canal in Sultanpur Sub Division.	XEN:BRL:N0.52 Dt.14.12.17	87205/-	@ 2% of Estimated Cost	100/-	Closure Period
12	Repairing, Painting Gauges Data Boards, Bridges and R.D Marks in Sultanpur Sub Division.	XEN:BRL:N0.53 Dt.14.12.17	362050/-	@ 2% of Estimated Cost	100/-	Closure Period
13	Side Protection/ Berm Formation along Burala Branch Canal RD. 211+400/L&R.	XEN:BRL:N0.54 Dt.14.12.17	370585/-	@ 2% of Estimated Cost	100/-	Closure Period
14	Side Protection / Berm Formation along Burala Branch Canal RD. 246+150/L.	XEN:BRL:N0.55 Dt.14.12.17	380934/-	@ 2% of Estimated Cost	100/-	Closure Period
15	Painting Hydraulic Gates Along Burala Branch in Kanya Sub Division.	XEN:BRL:N0.56 Dt.14.12.17	198724/-	@ 2% of Estimated Cost	100/-	Closure Period
16	Berm Formation from RD. 42+000 To 43+000/L	XEN:BRL:N0.57 Dt.14.12.17	456192/-	@ 2% of Estimated Cost	100/-	Closure Period
17	Providing T & P Articles to the establishment of Burala Division, Faisalabad.	XEN:BRL:N0.58 Dt.14.12.17	247800/-	@ 2% of Estimated Cost	100/-	20-Days

IPL-17244

Executive Engineer,
Burala Division, LCC East, Faisalabad.

کتاب سے بہتر دوست کہاں!!! جُمہوری سے بہتر کتابیں کہاں!!!

الطاف حسن قریشی کی معرکہ آرا کتابیں

ملاقاتیں کیا کیا
نایاب قومی اور عالمی شخصیات کے انٹرویوز
قیمت 1490 روپے

جنگِ ستمبر 1965ء کی یادیں
دفاع وطن کے 17 دنوں کی داستان
نادر تاریخ، پہلی مرتبہ کتابی صورت میں
قیمت 1000 روپے

مجھے کیوں نکالا؟ نواز شریف کے فوج سے اختلافات
مصنف اسد اللہ خان
انکشافات سے لبریز کتاب۔ سول ملٹری کے تعلقات کے چشم کشا حقائق
قیمت 640 روپے

پاکستان سے بنگلہ دیش۔ ان کہی جدوجہد	شریف الحق ایم	860
بادشاہی سے جلاوطنی۔ بہادر شاہ ظفر	فرخ سہیل گوئندی	380
ترکی ہی ترکی سفرنامہ، تاریخ وتہذیب	فرخ سہیل گوئندی	480
بکھرتا سماج	فرخ سہیل گوئندی	380
عالمی بیکاروں کی دہشت گردی	فرخ سہیل گوئندی	180
سکندر اعظم۔ دنیا فتح کرنے کی تاریخ	ہیرالڈ البرٹ لیمب	540
سلیمان عالیشان۔ تاریخ سلطنتِ عثمانیہ	ہیرالڈ البرٹ لیمب	520
صلیبی جنگوں کی تاریخ۔ صلاح الدین ایوبی	ہیرالڈ البرٹ لیمب	590
حیاتِ قائداعظم	ہیکٹر بولتھو	580
ایم ٹی وی سے مکہ تک۔ اسلام نے کیسے میری کایا پلٹ دی	کرسٹیان بیکر	990
سندھ ساگر اور قیامِ پاکستان	اعتزاز احسن	800
ایشیا کا مقدمہ (سابق وزیراعظم ملائیشیا کی کتاب)	مہاتیر محمد	300
دہشت گردی۔ ایک فکری مطالعہ	سلمان عابد	780

سلطنتِ عثمانیہ سے جمہوریہ ترکیہ		ضمیر احمد ہاشمی	400
تاریخ عالم		ڈاکٹر فیڈور کوروکن	750
اکھتر کے وہ دن (مشرقی پاکستان کے آخری 9 ماہ)		جہاں آرا امام	650
امریکہ کی عوامی تاریخ		ہاورڈ زن	600
مسلمان اندلس میں		سٹینلے لین پول	380
ناموس	ناول	ایلف شفق	650
رسولِ کائناتؐ (سیرتِ نبوی)		عبدالکریم ثمر	400
سرخ میرا نام	ناول	اورحان پاموک	780
اُجڑے دیار	ناول	انطونیو توریس	500
سرزمین	ناول	انطونیو توریس	300
چلتا مسافر	ناول	الطاف فاطمہ	800
خواب گر	ناول	الطاف فاطمہ	800
شیشے کا آدمی	(مختصر روسی افسانے)	ڈاکٹر نجم السحر بٹ	550

مردِ آہن۔ روسی صدر پوتن کی سنسنی خیز سوانح
Rs.600

کہانی جلال الدین رومی کی
چالیس چراغ عشق کے (ترجمہ)
ایلف شفق
(The Forty Rules Of Love) Rs.880

Free Delivery
ایک فون کال پر گھر بیٹھے کتاب خریدیے

جمہوری پبلیکیشنز، 2۔ ایوانِ تجارت روڈ، لاہور 042-36314140
www.jumhooripublications.com